اردو نسائی زبان و محاورہ (۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء): تجزیاتی مطالعہ

(لسانی، ادبی اور ثقافتی تناظرات)

مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)

مقالہ نگار:

شاذیہ اکبر

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۱ء

اردو نسائی زبان و محاورہ (۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء): تجزیاتی مطالعہ

(لسانی، ادبی اور ثقافتی تناظرات)

یہ مقالہ پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

مقالہ نگار:

شاذیہ اکبر

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست، ۲۰۲۱ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے،وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: اردو نسائی زبان و محاورہ (۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء) تجزیاتی مطالعہ، (لسانی، ادبی اور ثقافتی تناظرات)

پیش کار: شاذیہ اکبر رجسٹریشن نمبر: 689/P/U/F17

ڈاکٹر آف فلاسفی

ڈاکٹر شفیق انجم ______________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ______________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر سید نادر علی ______________________

ڈائریکٹر جنرل

میجر جنرل (ر) محمد جعفر، ہلال امتیاز (ملٹری) ______________________

ریکٹر

تاریخ ______________________

اقرار نامہ

میں، شاذیہ اکبر حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے پی ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر شفیق انجم کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

____

شاذیہ اکبر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

Abstract

In Urdu language, we find that on the back of Feminine language discrimination, these are the distinct factors: the life style of the Indian women, lack of education, religious cults, rites and rituals, whims and whimsicalities, omens, charms and incantations and the veil culture that excludes them from public life and social intermixing. Moreover, in Indian culture, we find different and varied sections and factions of womenfolk such as maids, prostitutes, whors, and keeps on one hand and on the other, we see the ladies of elite class and of high ups who have altogether different life style, culture and mind set. The Concept of “Patiwarta”is a Hindu custom but unfortunately, it is also in vogue in Muslims. Its details can be read in the book of Moulana Ashraf Thanvi titled “Behishti Zaiver.” In Urdu Feminine Language, there are thousands of references about the day to day activities and engagements. In Feminine Language, we find various proverbs associated to house hold matters, songs of rainy season, Hina custom in weddings called myrtle rubbing, songs on the departure of the bride, and the words of rebuke, reproach, joke and taunt. In the First chapter of this thesis, the proverbs, maxims, idioms, discriminative phrases, basic identifications, riddles, metaphors, allusions and allegories are discussed pre 1857. In the first part of the Second Chapter, the specialization, particularities and bisection of Feminine Language pre 1857 are discussed in the light of the Lexicon and grammatical rules. In the Second Part, the light has been thrown on the idioms and proverbs of Feminine Language from the books such as Farhang- e-Asfia, Lughat- un- Nisa, Insha-e-Hadi -un- Nisa, Makhzan - ul-Mahawerat, and from Amir- ul- Lughat. The Third Chapter deals with the proverbs and phrases about Feminine Language from the earlier period of Urdu novels. The writings of earliest novelists such as Ratan Nath Sarshar, Abdul Halim Sharar, Deputy Nazir Ahmed and Hadi Ruswa are critically and elaborately examined. The books titled “Rasoom - e -Delhi aur Gozashta Lucknow”, and “The Letters of Wajid Ali Shah”, and their impact on the Feminine Language has been examined in Chapter Four. In a nutshell, this dissertation deals with the Feminine Language from 1857 AD to 1900 AD and throws ample light on the earlier period writings in connection with the common, literary and cultural back ground and aspects associated and adhered to womenfolk.

اظہار تشکر

سب سے پہلے اللہ کریم کی عنایات کا شکرانہ واجب ہے جس نے میرے علمی و ادبی ذوق کی تسکین کے لیے حالات و وسائل کو موافق بنایا اور میرے ارادے میں اپنی رضا کو شامل کرتے ہوئے میرے تعلیمی سفر کو سہل فرمایا۔ میں انتہائی عجز کے ساتھ اس علیم ذات کے سامنے سجدہ ریز ہوں جس نے میرے حصولِ علم کے خواب کو جاگتی آنکھوں کی تعبیر بخشی۔ ایک پسماندہ دیہی پس منظر کے اُس خاندان میں جہاں مردوں کے بھی تعلیم حاصل کرنے کا رجحان نہ تھا اور وسائل نہ ہونے کے برابر، میرے اندر اس لگن کا دیپ روشن رکھا۔

میرے والد جنھیں چھبیس برس قبل ہمیں یتیمی کی دھوپ میں تنہا چھوڑ کر جانا پڑا، آج بھی ان کی دعاؤں کا مہربان سایہ محسوس کر سکتی ہوں اور سب سے بڑی طاقت میری ماں کی دعائیں میرا سب سے قیمتی اثاثہ اور خود اعتمادی کی اساس ہیں۔ اپنے جیون ساتھی شاہد علی اور بچوں باذل تیمور، علی اسجد، حوریہ ایمان کا تعاون مجھے ہر دن حاصل رہا، ان کا شکریہ بھی واجب ہے۔

مقالے کے نگران کو چنتے وقت جس استاد کی ذہانت، محنت پسندی اور پیشہ ورانہ مہارتوں سے میں سب سے زیادہ مرعوب تھی (اور کسی حد تک خوف زدہ بھی) ان کا نام اولین ترجیح کے طور پر اس لیے پیش کیا کہ نگران سخت مزاج ہو گا تو مجھ سے مقالہ لکھوانے میں کامیاب ہو جائے گا ورنہ میں مشاعرے ہی پڑھتی رہ جاؤں گی۔ ڈاکٹر شفیق انجم کی شفقت کا اندازہ مجھے ان کے زیرِ نگرانی کام کرنے سے قبل نہ تھا۔ میں پوری یونیورسٹی میں ایک ان سے ڈرتی تھی مگر انھوں نے قدم قدم میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ شعبہ اردو کے تمام اساتذہ کرام بالخصوص ڈاکٹر روبینہ شہناز، ڈاکٹر صوفیہ لودھی، ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر نازیہ ملک، ڈاکٹر صائمہ، ڈاکٹر عنبرین، ڈاکٹر ثوبیہ، ڈاکٹر بشریٰ کی شکر گزار ہوں۔ سب کی توجہ اور شفقت مجھے حاصل رہی۔

مواد کی فراہمی اور مشاورت کے ساتھ ساتھ حوصلہ افزائی کے لیے میں ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر رؤف پاریکھ، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر،، ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد، ڈاکٹر خضر حیات، جناب نصیر احمد اور جناب ندیم الحق کی تہِ دل شکر گذار ہوں جن کی توجہ نے رہبری فرمائی۔

شاذیہ اکبر

سکالر پی ایچ ڈی اُردو

پہلا باب:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف) تمہید

i۔ موضوع کا تعارف:

دُنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اُردو زبان میں بھی ایک نمایاں حصّہ ایسا ہے جو خواتین کے لب و لہجہ اور مخصوص محاوروں پر مشتمل ہے۔ اس کے خاص محرکات ہیں جن کا تعلق نسائی ماحول کے تہذیبی و ثقافتی پہلوؤں اور سماجی رویوں کے ساتھ ساتھ بطور عورت اس کی نسائی فکر اور جبلتوں سے جڑا ہوا ہے۔ اور یہ فرق صرف اردو زبان میں ہی نہیں بلکہ انگریزی، عربی، فارسی، جرمن، ہندی، پنجابی سمیت تمام زبانوں میں پایا جاتا ہے۔

سماجی لسانیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ایک ہی زبان بولنے والے معاشرے کے مختلف طبقات میں زبان کا فرق نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر رؤف پاریکھ "لغات اور فرہنگیں" میں لکھتے ہیں کہ اس فرق کو Language variation کہتے ہیں۔اس کی وجوہات میں جنسی، تعلیمی، پیشہ ورانہ اور طبقاتی بھی ہو سکتی ہیں جن کو سوشل ڈائیلکٹ یا سماجی بولی کہا جاتا ہے۔یہی لسانی فرق اگر جغرافیائی یا علاقائی بنا پر پیدا ہو تو اس کو ریجنل ڈائیلکٹ یا علاقائی تحتی بولی کہیں گے۔نسائی زبان و محاورہ چونکہ صنفی یا جنسی تفاوت کے باعث اپنی الگ شناخت بنا چکا ہے اس لیے اسے سماجی بولی کہا جا سکتا ہے۔

رابن لیکاف Robin Lakoff نے Language and Women,s place کے نام سے نسائی زبان پر تحقیقی کام کیا اور ثابت کیا کہ کسی بھی زبان میں نسائی الفاظ و محاورات کی امتیازی حیثیت کو پہچانا جا سکتا ہے اور عورت کی زبان کئی حوالوں سے مخصوص اور منفرد ہوتی ہے۔یہ فرق ان کے نفسیاتی، سماجی اور تہذیبی مقام اور برتاؤ کی وجہ سے در آتا ہے۔ مثلاً عورتیں مردوں کے مقابلے میں اسم صفت کا استعمال زیادہ کرتی ہیں۔سماج میں مرد کے مقابلے میں کمزور مقام و حیثیت کے باعث معذرت خواہانہ اندازِ گفتگو اپناتی ہیں۔ہدایات بھی دینی ہوں تو مردوں کے برعکس درخواست کرنے کے انداز میں دیتی ہیں۔ ضرورت سے زیادہ وضاحتیں پیش کرتی ہیں، تعریفی انداز اپناتی ہیں، جذیات نگاری میں بھی بہت دور تک نکل جاتی

ہیں، جذباتی الفاظ و انداز ان کی گفتگو میں زیادہ ہوتے ہیں۔ رنگوں، ذائقوں اور محسوسات کے جہان کو مردوں سے کہیں زیادہ بیان کرنے پر قادر ہوتی ہیں۔

اسی پس منظری مطالعے کے تحت جب ہم اردو زبان کے ابتدائی تشکیلی دور پر نظر ڈالتے ہیں تو برِ صغیر پاک و ہندی عورت کے ہاں مذہبی قدروں سے گہری وابستگی کے سبب خواتین میں شرم و حیا کا ایک فطری پہلو بھی اِس مخصوص ذخیرہ الفاظ کی تخلیق کا باعث بنتا نظر آتا ہے مزید یہ کہ کہیں کہیں پردے کی روایت کے باعث یہاں کی عورت کے سماجی روابط محدود ہیں اور اس کی زبان زیادہ خالص اور قدیم ہے۔

زبان چونکہ کوئی ساکت و جامد چیز نہیں اس میں ہمہ وقت تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں جو اس کے بولنے والوں کی ضرورت، مزاج اور ماحول سے گہری وابستگی کی علامت بن جاتی ہیں۔ گھر کی فضا اور مخصوص ماحول کے سبب اُردو زبان میں داخل ہونے والے ایسے نسائی الفاظ و محاورات کی تعداد سیکڑوں نہیں ہزاروں ہے۔

اردو زبان کی ابتدائی تشکیلات کے عہد کے بعد ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء میں زبان و ادب کے میدان میں نہ صرف موضوعاتی بلکہ فنی و لسانی حوالوں سے نمایاں تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ بہ طور خاص نثر کی طرف رجحان نے لسان و ادب کا رخ تبدیل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ جو اردو زبان کا قیمتی اور قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ مجوزہ عہد کی لسانی اور ثقافتی حوالے سے کسی خاتون کے قلم سے ابھی اردو زبان میں ایسی کوئی قابلِ ذکر تصانیف سامنے نہیں آ سکی تھی۔ نسائی لب و لہجہ اور مخصوص الفاظ و محاورات کا استعمال، رمز و علامت کی فطری ضرورت اور خاص سماجی پس منظر کے باعث ان میں قابل قدر اضافے کو مرد لکھاریوں نے اپنی افسانوی و غیر افسانوی نثر میں مہارت سے برتا۔ اس عہد میں ڈپٹی نذیر احمد، رتن ناتھ سرشارؔ، مرزا محمد ہادی رُسواؔ اور عبد الحلیم شررنے اس نسائی لہجے کو اپنی تحریروں میں اس انداز سے برتا کہ گویا نسائی لب و لہجہ اپنی جداگانہ انفرادیت کے ساتھ محفوظ کر دیا ہو۔ اسی عہد میں " فرہنگ آصفیہ "، "امیر اللغات"، " لغات النساء"، "انشائے ہادی النساء" اور " مخزن المحاورات " جیسی لغات نے اس نسائی لب و لہجہ کی اہمیت و تحفیظ کو مزید اُجاگر کیا۔ ان نسائی الفاظ و محاورات کے اضافے نے اردو زبان کو نسائی اظہار بخشا جو اس سے پیشتر نظر انداز ہوتا آیا تھا بلکہ اوّلیں ریختی کے طور پر قدرے بگڑی ہوئی اور غیر سنجیدہ صورت میں سامنے آ چکا تھا۔ جس کا مقصد نسائی زبان و محاورہ کو متعارف اور محفوظ کرنے کے بجائے ایک فیشن یا وقتی رجحان سے زیادہ نہ تھا۔

زیرِ تحقیق عہد کے اردو زبان و ادب پر نا قابلِ تردید احسانات رہے ہیں۔ اس عہد میں اصنافِ اردو میں ثقافتی متون کا بھی اضافہ ہوا جن سے نسائی زندگی کے ثقافتی پہلوؤں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ نسائی زبان کی تشکیلات میں بھی اضافہ ہوا جن کو لسانی، ادبی اور ثقافتی سطح پر تحقیق کے ذریعے سامنے لایا گیا ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ:

اردو زبان نے ۱۸۵۷ء کے بعد نئی کروٹ لی تو زندگی اور زبان کے تمام شعبوں میں تبدیلی کے ساتھ نسائی الفاظ و محاورات کو نہ صرف لغات و قواعد میں بلکہ تاریخی و ثقافتی تحاریر کے ساتھ ساتھ افسانوی ادب میں بھی استعمال کرنے کی روایت نے جنم لیا اور یوں ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء تک کے عہد میں قابلِ قدر سرمایہ ء اردو سامنے آیا۔ معاملہ بندی، رمز و ایما، اشارہ و علامات اور نسائی فکر و اظہار کے قرینوں سے سجا نسائی لب و لہجہ اِس زبان کے متون میں شامل ہوا۔ اُردو زبان کے عام لب و لہجہ اور مروّج و مستعمل لسانی رویوں سے یہ سرمایہ معروف طور پر جُداگانہ خصائص رکھتا ہے۔

نسائی لب و لہجہ کے اِس اختلاف کو ماہرین السنہ اور بعض لغات نگاروں نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنے لسانی کاموں میں اس کے جُداگانہ اندراج کا اہتمام بھی کیا۔ نسائی لب و لہجہ اور بیگماتی زبان کی علیحدہ پہچان کا کام اُنیسویں صدی میں شروع ہو چکا تھا۔ نسائی زبان و محاورات کی الگ شناخت کو تسلیم کرتے ہوئے نہ صرف افسانوی نثر بلکہ فرہنگ و لغات میں بھی تخصیص کے ساتھ اندراج ہونے لگا۔ اس سلسلے کی ایک کڑی نجم الامثال ۱۸۷۶ میں مولوی محمد نجم الدین کی لغت منظرِ عام پر آئی جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۸۸ء میں شائع ہوا۔ یہ پانچ حصوں پر مشتمل تھی جس کا چوتھا حصہ " محاوراتِ عامہ عورت و اصطلاحاتِ بیگمات " کے نام سے چھپا تھا۔ امجد علی اشہری کی مرتب کردہ لغت جس کا نام "لغات الخواتین: عورتوں کے محاورے اور روزمرہ" تھا اس سلسلے کا ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ یہ لغت ۱۹۰۷ء میں لاہور خادم التعلیم اسٹیم پریس سے شائع ہوئی تھی۔ منیر لکھنوی کی مرتب کردہ "محاوراتِ نسواں اور خاص بیگمات کی زبان" جو ۱۹۳۰ء میں کان پور سے شائع ہوئی جس کے کم و بیش چھ سال بعد وزیر بیگم ضیاء کی مرتب کردہ لغت اسی نام یعنی "محاوراتِ نسواں" سامنے آئی۔

انجمن ترقی اردو کی اس سلسلے میں قابل ِ ذکر کاوش جولائی ۱۹۵۹ء میں نسائی زبان و محاورات کی صورت میں سامنے آئی۔ اس کے بعد اب کئی تصانیف اور لغات پاکستان و بھارت میں شائع ہو چکی ہیں جن میں محی الدین لکھنوی اور وحیدہ نسیم کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ مگر ان میں سے زیادہ تر ۱۹۰۰ء کے بعد کا کام ہے۔

تاہم ڈپٹی نذیر احمد دہلوی، مرزا محمد ہادی رُسوا اور عبدالحلیم شرر کے زمانے میں ملنے والی تحریروں میں ایسے الفاظ و محاورات کی واضح نشاندہی نظر آتی جن میں گھریلو خواتین سے لے کر کسبیوں، طوائفوں، ملازماؤں، دلّی کی بیگمات اشرافیہ، گلی کوچوں میں پھرنے والی اور شادی بیاہ پر ناچنے گانے والی عورتوں کی زبان شامل ہے۔

اُردو زبان کے معاصر لسانی رویوں میں بھی بعض ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کا تعلق آج کے زمانے سے ہے اور جو خواتین کے حلقوں میں اپنے مخصوص مفاہیم و معانی رکھتے ہیں۔اس پھیلے ہوئے لسانی عمل اور ہزاروں الفاظ محاورات پر مشتمل ذخیرہ کی تحقیقی و تنقیدی جائزے کی ضرورت ہے۔اُردو لغات کے اس حصّے کی جُداگانہ شناخت ،اِس کے ثقافتی، لسانی اور ادبی تناظرات و تشکیلات کی نشاندہی اور اُن الفاظ و محاورات کی تلاش، جن کی وجہ سے ایسے لسانی رویوں کا عمل دخل اُردو میں دوسری زبانوں کی نسبت زیادہ رہا۔اس کی تلاش و تحقیق اِس مقالے کا جواز ہے۔

iii۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ نسائی زبان و محاورہ کیا ہے، اردو ادب کی روایت میں ۱۸۵۷ء سے قبل اس کی صورتیں کیا ہیں؟

۲۔ ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء، دہلی و لکھنو کے ثقافتی و لسانی پس منظر میں منتخبہ تصانیف میں نسائی زبان و محاورے کی تحفیظ و تدوین کی روایت کیا ہے؟

۳۔ اردو نسائی زبان و محاورے کے لسانی، ادبی اور ثقافتی تناظرات بحوالہ مخصوص لغات و قواعد، افسانوی و ثقافتی نثری تخلیقات کیا ہیں؟

۴۔ ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء کے دوران نسائی زبان و محاورے کی شناختیں، مضمرات اور تعبیرات کیا ہیں؟

iv۔ نظری دائرہ کار:

زیرِ تحقیق موضوع "اردو نسائی زبان و محاورہ ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء" لسانی اور ادبی ہر دوزمروں میں نسائی زبان سے متعلق ہے۔ زبان میں جن امتیازات کی بنا پر کچھ الفاظ و محاورات کو عورت کی زبان کے طور پر

مخصوص قرار دینے کی وجوہات کیا ہیں اور ماہرینِ زبان کن کن حوالوں سے دیکھتے ہیں کہ کوئی زبان اپنے بولے جانے والوں میں الفاظ کے چناؤ اور اس کے استعمال کے انداز کے باعث اپنی نسائی انفرادیت قائم کر لیتی ہے، پھر یہ کہ نسائی زبان کے تناظرات کیا ہیں اور کسی مخصوص عہد میں یا مخصوص ثقافت میں یہ کس طرح پھلتی پھولتی اور ارتقا کے مراحل طے کرتی ہے یہ جاننے کے لیے ہم نے Robin Lakoff کی تصنیف

"Language and women,s place 1972" اور

"Women,Men and language " by Jennifer Coats ,

کو بھی پیشِ نظر رکھا۔ جس میں انھوں نے ان نسائی امتیازات کا تجزیہ پیش کیا۔ انھوں نے ان امتیازات کی ان سے متعلقہ مخصوص ذخیرہ ء الفاظ کی مثالوں کے ساتھ بھی وضاحت کی ہے جو خواتین بولتی ہیں اور مردوں میں ان کا استعمال کم ہے یا نہ ہونے کے برابر ہے۔

اردو زبان میں سید انشا اللہ خان انشا نے ۱۸۰۸ء میں "دریائے لطافت" میں عورت کی زبان اور اس کے استعاراتی انداز کو زبان کا حسن قرار دیتے ہوئے نسائی زبان کے مخصوص نمونے بھی شامل کیے اور نسائی زبان کے منفرد اسلوب کو زبان کا حسن قرار دیا۔ اس نسائی لہجے کے امتیاز کو مولوی عبدالحق نے بھی بہت تفصیل سے بیان کیا اور ان الفاظ و محاورات کی طرف نشاندہی کی جو نسائی زبان سے مخصوص ہیں۔ مولوی عبد الحق نے ایسے الفاظ کی طرف بھی توجہ مبذول کروائی جن کے استعاراتی مفاہیم عال طور پر مرد سمجھ ہی نہیں پاتے اور وہ خواتین سے ہی مخصوص ہیں۔

درج بالا ماہرینِ لسانیات نے ایک ہی زبان بولنے والے مرد و عورت کے درمیان ان امتیازات کی نشاندہی کی ہے اور نسائی زبان کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جنھوں نے زبان و ادب کے میدان میں نسائی زبان و محاورہ کی وہ جہات و زاویے متعارف کروائے جو زبان کا حصہ بن چکے ہیں اور ایک خاص پس منظر رکھنے کے ساتھ ساتھ نسائی فکر کی عکاسی بھی کرتے ہیں مگر یہاں نسائی زبان و محاورہ سے مراد تانیثیت کی کسی تحریک یا رجحان کے ہرگز نہیں ہے۔ یہاں مجوزہ عہد میں لسانی، ادبی و ثقافتی منتخبہ تحاریر میں جہاں جہاں عورت کا مکالمہ یا اس کی زبان کو تحریر میں لایا گیا تھا ان میں کن کن امتیازات کو پیشِ نظر رکھا گیا ان بنیادی تصورات کے ساتھ اردو زبان میں نسائی زبان و محاورے کی شناختوں پر بحث کرتا یہ موضوع خاص اہمیت رکھتا ہے۔

v۔ پس منظری مطالعہ:

اس سے قبل اردو زبان میں دہلوی اور لکھنوی دبستان اپنی اپنی الگ لسانی و ادبی خصوصیات کے ساتھ ایک الگ شناخت کے طور پر سامنے آ چکے ہیں۔ اردو زبان و ادب میں نسائی لب و لہجے کی ایک جھلک ریختی کی صورت میں بھی زیرِ بحث رہ چکی ہے اور بیگماتی زبان کی تخصیص و امتیازات پر بھی تحقیق کی جا چکی ہیں اس میں " ریختی کا تنقیدی مطالعہ " خلیل احمد صدیقی کی تحقیق کے علاوہ "ریختی: ابتدا، ارتقا اور زوال" کے عنوان سے مگدھ سے آفتاب احمد کا تحقیقی مقالہ بھی چھپ چکا ہے۔ ریختی چونکہ شعری ادب سے متعلق نسائی لہجے کی ایک صورت کے طور پر سامنے آئی اس لیے اس کا تحقیقی منظر نامہ الگ ہے اور نسائی زبان کے حوالے سے نثری متون کی لسانی، ادبی اور ثقافتی تناظرات کے پس منظر میں یہ تحقیق ایک مخصوص عہد میں زبان کی اس انفرادیت و امتیاز کی تحفیظ و تدوین کو سامنے لانے کی کوشش ہے۔

اردو زبان میں نسائی کرداروں پر مثنویوں اور ناولوں کے حوالے سے تحقیقی کام بھی ہو چکا ہے جو مختلف ادوار اور مختلف ادباء کی منتخب ادبی نثر پر کیا گیا جیسے پٹنہ سے عالم آرا کی تحقیق "شمالی ہند کی مشہور مثنویوں کے نسائی کردار" اور دہلی سے شاہدہ غفران زیدی کا "اردو ناولوں کے نسوانی کردار، ابتدا سے پریم چند تک" کے عنوان سے تحقیقی کام ہو چکا ہے، مگر ایک خاص عہد یعنی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء میں جو اردو زبان و ادب کا اہم ترین عہد سمجھا جاتا ہے جس میں شعری و نثری ادب میں نمایاں تبدیلیاں سامنے آئیں اس عہد میں نسائی زبان کی تحفیظ و تدوین کے کام کا آغاز ہو چکا تھا، نسائی زبان و محاورہ پر مبنی لغات بھی مرتب ہونا شروع ہو چکی تھیں۔

نسائی زبان و محاورہ کے حوالے سے لسانی سطح پر نسائی الفاظ و محاورات اور نسائی زندگی کے مختلف تہذیبی پہلوؤں پر مبنی کچھ غیر سندی تحقیقی کام بھی ہو چکے ہیں جن میں وحیدہ نسیم کی کتاب "عورت کی زبان" شبیر علی کاظمی کی "زبانِ زنانِ دہلی" اور محی الدین حسن کی "دہلی کی بیگماتی زبان " بھی پس منظری مطالعہ کے طور پر پیشِ نظر رہیں۔

ادبی حوالوں سے شخصیت و فن کے تناظرات کے علاوہ بھی زبان و اسلوب اور تکنیکی مباحث کے طور پر ڈپٹی نذیر احمد، عبدالحلیم شررؔ، رتن ناتھ سرشارؔ اور مرزا محمد ہادی رُسواؔ کی ادبی خدمات پر تحقیق کسی نہ کسی صورت ہو چکی تھی جو ان کے ادبی مقام و مرتبے کا تعین کرتی ہے اس لیے اس تحقیق میں ان کو بھی پس منظری مطالعہ کے طور پر شاملِ مطالعہ کیا گیا اور فرہنگ و قواعد کے ذخائر سے بالخصوص اور بلاواسطہ مواد کی جمع آوری

بھی کی گئی۔ مجوزہ عہد سے متعلقہ دیگر تاریخی، ادبی اور لسانی کتب سے بھی استفادہ کرتے ہوئے مجوزہ موضوع کے لیے پس منظری مطالعہ کی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔

vi ۔ تحقیقی طریقہ کار:

تحقیق کا موضوع چونکہ " اردو نسائی زبان و محاورہ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء" ہے اور اس کے تناظرات ادبی، لسانی اور ثقافتی ہیں اس کے پیش نظر مجوزہ عہد کے ادبی، لسانی اور تاریخی و ثقافتی بنیادی و ثانوی مآخذات کا تاریخی جائزہ لیا گیا۔ مجوزہ عہد کی ممکنہ حد تک درست صورت حال اور ماحول و ثقافت کے ادراک کے لیے متعلقہ رسائل و جرائد تک بھی رسائی حاصل کی گئی اور تاریخی طریقہ تحقیق کے مطابق اردو زبان میں نسائی لب و لہجے کے شواہد کی جمع آوری کے بعد مجوزہ عہد کے عمرانی حالات و واقعات کے تناظر میں جائزہ لیا گیا کہ نسائی زبان کی تشکیل کس طرح ہوئی اور اردو زبان میں مخصوص نسائی لب و لہجہ کن کن حالات و تناظرات کے زیرِ اثر تفہیم و تاثیر کے مراحل طے کرتا رہا۔ وہ کون کون سے رویے اور رجحانات تھے اور کون کون سے ثقافتی و عمرانی، نفسیاتی و جذباتی اثرات تھے جو اس نمایاں اثاثے و امتیاز کی تشکیل و تدوین میں کار فرما رہے۔ کتب کے حصول کے لیے کتب خانوں اور لائبریریوں کے علاوہ مختلف صاحبانِ علم سے بھی رابطہ کیا گیا۔ جو مواد کہیں دستیاب نہ ہو سکا اس کا برخط مطالعہ کیا گیا۔ اس طرح تجزیاتی مطالعہ کیا گیا۔

vii ۔ ما قبل تحقیق:

اگرچہ سر سید عہد میں اردو زبان و ادب میں نظم و نثر کے میدان میں آنے والی تبدیلیوں اور فنی و موضوعاتی سطح پر ان کے اثرات کے موضوعات پر تحقیقی و تنقیدی مواد کی کمی نہیں مگر نسائی زبان و محاورہ کے ادبی و غیر ادبی متون میں استعمال اور انھیں الگ سے محفوظ کرنے کی طرف بہت کم توجہ دی گئی۔ بلکہ اس پر انیسویں صدی کے بعد بھی کوئی قابلِ ذکر کام نظر نہیں آتا۔

۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء کے درمیانی عہد کو بالخصوص نسائی لب و لہجہ کی روایت کے حوالے سے خاص اہمیت حاصل ہے جس نے بعد کے زمانے میں زبان کے اس اہم پہلو کو مضبوط بنیاد فراہم کی۔ اردو زبان میں بحیثیت مجموعی " قرآنی محاورات "، "ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں اردو محاورات "، " اردو میں عربی و فارسی زبانوں کے اثرات "اردو شاعری میں تصورِ عورت" جیسے موضوعات کے علاوہ لغت نویسی کی تاریخ و تدوین پر کام ہو چکا ہے۔ مجوزہ عہد اور اس سے قبل کے عہد میں لسانی خدمات کے حوالے سے مستشرقین کی خدمات پر بھی

تحقیقات ہو چکی ہیں جو بحیثیت مجموعی اردو زبان کی تحفیظ و تدوین سے متعلقہ تھیں۔نسائی زبان کے حوالے سے لسانیاتی تناظر میں کوئی کام ابھی تک سامنے نہیں آیا،البتہ مختلف ناول نویسوں جیسے ڈپٹی نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا، عبدالحلیم شرر کے نسوانی کرداروں یا "تصورِ عورت "، "فکری و فنی مطالعہ " جیسے موضوعات پر تحقیق ہو چکی ہے جن میں ان کرداروں کی تشکیل کے تناظر میں ضمناً چند نسائی مکالموں تک بات محدود رہی۔ انیسویں صدی کے ناول میں نسوانی کرداروں پر بھی تحقیقی کام سامنے آچکا ہے مگر تاحال اردو نثر میں لسانی، ادبی اور ثقافتی تناظرات کے ساتھ اس مخصوص اور اہم ترین عہد میں نسائی زبان و محاورہ پر کوئی کام سامنے نہیں آیا۔

لائبریریوں، کتب کی فہرستوں، جامعاتی تحقیق کی فہرستوں اور مختلف محققین و علمی شخصیات سے رابطے سے پتا چلا کہ مجوزہ عہد میں نسائی زبان و محاورہ کے لسانی،ادبی و ثقافتی تناظرات پر تاحال کوئی کام نہیں ہوا۔

viii۔ تحدید:

مجوزہ تحقیق میں ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء کے دوران کی تصنیفات میں سے صرف لسانی حوالوں سے منتخب لغات و قواعد، اور افسانوی ادب میں نسائی زبان و محاورہ کے حوالے سے نذیر احمد دہلوی، رتن ناتھ سرشارؔ، مرزا ہادی رسواؔ اور عبدالحلیم شررؔ کی بیان کردہ تصانیف اور ثقافتی و تاریخی تناظرات کے پس منظر کے ساتھ بیان کردہ کتب کے تناظر میں نسائی زبان و محاورے کا جائزہ لیا گیا۔ یوں کوشش کی گئی کہ مجوزہ عہد میں سامنے آنے والی منتخب تصانیف کو، جو اس عہد کی نمایاں ترین تصانیف بھی قرار پا چکی ہیں اور اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اوّلین نقوش کے طور پر جانی جاتی ہیں ان کے اندر نسائی زبان کے تناظر میں کس حد تک مواد موجود رہا اور اردو زبان کے ان مایہ ناز ادباء اور لغات نویسوں کے ہاں زبان کے اس امتیاز کو کیا مقام و اہمیت حاصل رہی۔ کیونکہ ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اردو زبان و ادب کو دیگر زبانوں کی طرح نسائی قلم بہت بعد میں میسر آیا جب خواتین خود ناول نگاری، افسانہ نویسی اور دیگر اصناف کی طرف متوجہ ہوئیں۔ تعلیم کا رواج عام نہ ہونے اور خواتین کو علم و ادب کے میدان میں دیر سے اترنے کی وجہ سے ۱۹۰۰ء تک ہمیں کوئی ایسی قابلِ ذکر تصانیف نہیں ملتیں جو کسی خاتون کے قلم سے سامنے آئی ہوں۔ واجد علی شاہ کی بیگمات کے خطوط میں سے بھی کئی بیگمات کے خطوط ان کے تنخواہ دار مکتوب نگاروں سے لکھوائے جاتے تھے۔ محض چند ایسی تھیں جو خود لکھا کرتیں "گلدستہء محبت" میں فریدون بیگم کے مکتوب نگار حسیب الدین احمد بردوانی کا نام رقم ہے جو بیس تیس روپے ماہانہ تنخواہ پاتے تھے۔دراصل واجد علی شاہ کے شعری و ادبی ذوق و معیار کو بھی پیشِ نظر رکھتے

ہوئے شاید اس کا اہتمام کیا جاتا ہو گا ۔ ماہ لقا چندا بائی کو پہلی اور اس عہد کی واحد خاتون صاحبِ دیوان شاعرہ ہونے کی وجہ سے نسائی زبان کے تناظر میں اس جائزے میں شامل کیا گیا۔ شعری تخلیقات اس جائزے میں شامل نہیں ہیں۔

ix ۔ تحقیق کی اہمیت:

نسائی زبان و محاورہ کے حوالے سے ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء کا عہد اردو زبان و ادب کی تاریخ میں اس لیے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اس دوران شاعری کے علاوہ افسانوی و غیر افسانوی نثر میں موضوعاتی اور ہیئتی تبدیلیاں سامنے آئیں۔ جو اردو کے اولین نقوش کے طور پر ثبت ہو گئیں۔ گھروں چار دیواریوں، نوابوں کے محلات، گلی محلے کی خواتین، مخصوص طبقات سے وابستہ خواتین اور شرفاء کی بیگمات کو اردو زبان میں پہلی بار فطری انداز میں حقیقی انسانی کرداروں کی صورت میں اظہار ملا۔ کیونکہ اس سے قبل داستانوی ادب کے بیشتر کردار مافوق الفطرت ہوا کرتے تھے۔ پہلی بار اکبری، اصغری، ماما عظمت، کُٹنی، امراؤ جان ادا، خانم اور زمرد جیسے نسائی کردار اپنی بے ساختگی کے ساتھ بولتے سنائی دیے۔ صرف ادبی تخلیقات یعنی ناول ہی نہیں بلکہ قواعد و لغات میں بھی نسائی زبان و محاورہ کو شامل کیا گیا۔

اردو زبان میں پہلی پہلی ثقافتی کتب "رسومِ دہلی" اور "گزشتہ لکھنو" کی صورت میں اسی عہد میں لکھی گئیں، پھر خطوط نویسی کو جب باقاعدہ مکتوب نگاری کی ادبی صنف کے طور پر اہمیت ملنے لگی تو "خطوطِ واجد علی شاہ" اور "انشائے ہادی النساء" جیسے تاریخی خطوط کے متون کو بھی نسائی زبان کے تجزیے کے لیے زیرِ بحث لایا گیا۔ یہ کام نصف صدی پر محیط تھا جسے تحقیقی و تجزیاتی سطح پر سامنے لانے کی اشد ضرورت تھی تاکہ لسانی، ادبی اور ثقافتی پہلو سے نسائی زبان و محاورہ کی اردو زبان میں تحفیظ و تدوین کو سامنے لایا جائے۔

ب)نسائی زبان و محاورہ، بنیادی مفاہیم اور شناختیں:

انسانی تاریخ میں ہر تہذیب میں مردوں اور عورتوں کی زندگی اور ان کے کرداروں میں تفریقی پہلو کو نمایاں دیکھا جا سکتا ہے۔ کہیں مادر سری دور تھا تو عورت کی زبان اُس کے طرزِ حیات کے مطابق حاکمانہ رنگ لیے ہوئے تھی اور پدر سری نظام کے آنے کے بعد جہاں عورت کی حیثیت متاثر ہوئی وہاں اُس کے رویوں کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ زبان میں تبدیلی آنا بھی ایک فطری عمل تھا۔ زبان کا معاشرت و تمدن سے نہایت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ لفظ اسی پس منظر کے ساتھ بنتے اور بدلتے ہیں۔

جس طرح مرد اور عورت کے مزاج اور طرزِ حیات میں فرق ہوتا ہے اسی طرح ان زبان، الفاظ کے انتخاب اور لہجوں کی تاثیر میں بھی فرق نمایاں دیکھا جاسکتا ہے۔ دونوں کے ہاں الگ الگ حلقے اور اشغال پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے سماجیات اور باہمی روابط کی نوعیتوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ دونوں کے شب و روز کے معمولات اور مشاہدات میں، طرزِ فکر و طرزِ اظہار میں فرق دنیا کی تمام زبانوں میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے زبان بھی انسانی تاریخ کی ہمسفر رہی ہے۔

جس طرح مرد اور عورت کے مزاج اور طرزِ حیات میں فرق ہوتا ہے اسی طرح ان زبان، الفاظ کے انتخاب اور لہجوں کی تاثیر میں بھی فرق نمایاں دیکھا جاسکتا ہے۔ دونوں کے ہاں الگ الگ حلقے اور اشغال پائے جاتے ہیں۔ دونوں کے سماجیات اور باہمی روابط کی نوعیتوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ دونوں کے شب و روز کے معمولات اور مشاہدات میں، طرزِ فکر و طرزِ اظہار میں فرق دنیا کی تمام زبانوں میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے زبان بھی انسانی تاریخ کی ہمسفر رہی ہے۔

سماجی لسانیات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ ایک ہی زبان بولنے والے معاشرے کے مختلف طبقات میں زبان کا فرق نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر رؤف پاریکھ لکھتے ہیں کہ اس فرق کو Language variation کہتے ہیں۔ اس کی وجوہات میں جنسی، تعلیمی، پیشہ ورانہ اور طبقاتی بھی ہوسکتی ہیں جن کو سوشل ڈائیلکٹ یا سماجی بولی کہا جاتا ہے[1]۔ ان کا کہنا ہے کہ یہی لسانی فرق اگر جغرافیائی یا علاقائی بنا پر پیدا ہو تو اس کو ریجنل ڈائیلکٹ یا علاقائی تحتی بولی کہیں گے۔ نسائی زبان و محاورہ چونکہ صنفی یا جنسی تفاوت کے باعث اپنی الگ شناخت بنا چکا ہے اس لیے اسے سماجی بولی کہا جاسکتا ہے۔

عورت کی زبان کا مردوں کی زبان سے فرق واضح کرتے ہوئے مختلف لسانی شواہد کے ذریعے ڈاکٹر رابن لیکاف Dr.Robin Tolmach Lakoff کی کتاب "Language and women's place" زبان کے حوالے سے صنفی تفریق کا ایک معتبر حوالہ شمار کی جاتی ہے۔ لیکاف نے لسانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری ہارورڈ یونیورسٹی سے لی اور اپنی اس لسانیاتی تحقیق میں انھوں کے زبان میں نسلی اور قومی امتیازات کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک نئی لسانی بحث کا آغاز کیا اور کہا ہے کہ عورت کی زبان میں ایک خاص نرمی، لطافت، لچک اور جذباتی پہلو کو اس کے لفظوں کے انتخاب میں محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ پلیز، براہِ کرم، مہربانی فرما کر، اگر زحمت نہ ہو تو، آپ کا بہت بہت شکریہ، جیسے الفاظ بہت عام استعمال کرتی ہیں اور پر جوش اظہاریے کے مواقع پر ان کی زبان پر بڑی سرعت اور روانی سے کسی بھی کیفیاتی تاثرات کو بیان کرتے وقت So much, very much,really awesome, so sweet, very beautiful,oh great, what a good,am

dying ,wonderful,huge, so , quite, highly, extremely, جیسے الفاظ کی بھرمار کر دیتی ہیں، جبکہ مرد ایسا نہیں کرتے۔علاوہ ازیں مردوں کی طرح خواتین بہت قطعیت والے الفاظ اور کرخت الفاظ بھی استعمال کرنے سے گریز کرتی ہیں۔وہ عموماً بات کو غیر ضروری طول بھی دیتی ہیں۔ اپنی اس تحریر میں انھوں نے خواتین کے زبان کے حتیٰ المقدور درست تلفظ اور درست گرامر استعمال کرنے کی خوبی کو بھی سراہا ہے۔ انھوں نے انسانی تاریخ میں عورت کے ساتھ پیش آنے والے حالات کی ہزاروں سالہ تاریخ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ فرضیہ بھی پیش کیا ہے کہ چونکہ زمینی وسائل پر مردوں کی حاکمیت کے ساتھ ساتھ عورت کی ذات پر اس کے جسم پر اس کی پوری زندگی کے معمولات پر مرد نے حکمرانی کی اور عورت کسی نہ کسی مرد کے جیسے باپ، شوہر، بھائی، بیٹا حتیٰ کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے نام سے اس فلاں کی بیوہ، بیٹی یا ماں کہلواتی ہے۔ کسی تقریب میں جائے تو اس سے پوچھا جاتا ہے کہ اس کے شوہر کیا کرتے ہیں۔ جبکہ کسی مرد سے سوال نہیں کیا جاتا کہ اس کی بیوی کیا کرتی ہے۔ مرد کی جنسی خواہش ہمارے ہاں فطری سمجھی جاتی ہے اور عورت کے حوالے سے اس ضرورت کا فطری اظہار نہ صرف غیر فطری بلکہ معیوب گردانا جاتا ہے۔ان تمام باتوں کا اثر اس کی زبان، گفتگو کے انداز، جھجک، شرم و حجاب، ڈر، سماجی دباؤ اور گھریلو و کاروباری زندگیوں پر بھی پڑتا ہے جو اس کی زبان اس کے لہجے، اس کی لفظیات سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

"Features of language characteristic of powerlessness and dependency are probably shared across all roles of subordination. To capture the generalizations implicitly in the subject, the communicative conduct of all those assigned dependency on the authority of others- whether because of sex, race, age,job, or some other circumstances- should be examined and compared. Perhaps the study of women’s speech may lead linguistics to see beyond the potential equality of languages to the actual inequalities among speakers. (D.K)" (۲)

ان کے خیال میں یہ لسانی امتیاز دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی پایا جاتا ہے اور خواتین کی سماجی حیثیت، اس کا معاشرے میں کردار اور اس کی مرد کے مقابلے میں کمزور حیثیت کے باعث عورت اور مرد کی زبان میں بھی یہ فرق نظر آتا ہے۔اس میں عورت کی فطرت اور اندازِ فکر کو شامل بھی کر لیا جائے تب بھی اس کے ساتھ معاشرتی رویے کا اثر سب سے مضبوط اور اثر انداز ہونے والا نمایاں ترین عنصر ہے۔ رنگ و نسل، ذات پات، رسوم و رواج اور معاشرتی حالات مختلف خطوں میں مختلف ہونے سے اس لسانی امتیاز کے تناسب میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔

ان کی کتاب پر آج تک بہت سے تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی لکھے جا چکے ہیں ان میں سے ایک تحقیقی مقالہ" Women's language: a struggle to overcome inequality "

میں ڈاکٹر رابن لیکاف کے اس نظریہء فکر پر بحث کرتے ہوئے مقالہ میں لکھا ہے:

"In her book, Lakoff elaborated on the hypothesis that women have traditionally been discriminated against in society, among other things, because of the way they are taught to use language: girls don't ask questions (they should accept things), they are not rough (they should be polite). This linguistic behavior is learned. Children until the age of five share a common language; then it splits up. Girls, later women, learn to talk like a lady by displaying differences at the linguistic levels, e.g. lexical (use of color names: The wall is mauve; particles: Oh, dear, vs. a man's remark with an expletive: Shit, you've put the peanut butter in the fridge again!). At the syntactic level, Lakoff mentions the use of tag questions. According to her, a man would say: Is John here?, whereas a woman would say: John is here, isn't he?"(۳)

ان کے مطابق عورت اضافی الفاظ ادا کرتی ہیں اور وضاحت زیادہ پیش کرتی ہیں، جملوں میں جذبات کا اظہار جھلکتا ہے اور شدت بھی۔ کچھ بتانے سے پہلے "تمیں پتا ہے"، "کیا تم نے نہیں سنا!" "ایک بات بتاؤں آپ کو؟" جیسے جملے بولتی ہیں تب اصل اطلاع یا خبر کے متن کی طرف آتی ہیں۔ تعریف کرنی ہو یا کوئی خامی، خرابی کا ذکر ہو تو مرد کے مقابلے میں اسم صفت کا استعمال بہت زیادہ کرتی ہیں۔

اردو زبان کے متعلق اگر ہم اسی موضوع کے تناظر میں جائزہ لیں تو ہمارے ماہرینِ لسانیات اور اہلِ علم و دانش نے بھی اس لسانی امتیاز کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس پر بحث بھی کی ہے کہ عورت کی زبان مرد کی زبان سے زیادہ خالص اور قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سے تفریقی پہلو بھی رکھتی ہے۔ مولوی عبد الحق اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ دنیا کے پیشتر قبائل میں طرزِ حیات کا اگر مشاہدہ کیا جائے تو یہ چیز سامنے آتی ہے کہ ان کے ہاں اپنے اپنے معمولِ حیات کے باعث الگ الگ زمہ داریاں اور مشاغل موجود تھے۔ انسان نے بہت جلد معاشرتی زندگی کے آغاز سے ہی اس بنیادی جنسی تفریق کے فرق کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو مخصوص حالات کی طرف ڈھالنا شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلی چیز جسمانی سطح پر کمزور اور طاقت ور ہونے کی تفریق تھی۔ عورت حمل اور حیض کے دنوں میں شکار اور دیگر مشقت طلب کاموں کے قابل نہ رہتی اور اسے

مرد پر انحصار کرنا پڑتا تھا اور مرد نے ملکیت کا احساس جنم لیتے ہی زمین، اولاد اور وسائل کے ساتھ ساتھ عورت کو بھی ملکیت سمجھنا شروع کر دیا تھا یوں یہ تفریقات زبان کی سطح تک آنا بھی عین فطری تھا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

"قدیم زمانے کے نیم متمدن جرگوں یا قبیلوں کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے الگ الگ حلقے تھے اور ان کے اشغال اور کام بھی جدا جدا تھے۔ اسی وجہ سے ان کی بولیوں میں فرق پیدا ہو گیا تھا۔ مرد بہت سے ایسے الفاظ اور کلمے استعمال کرتے تھے جو عورتیں سمجھ تو لیتی تھی لیکن کبھی زبان سے نہیں نکالتی تھیں۔ ایسے کلمے صرف مردوں سے مخصوص ہوتے تھے اسی طرح عورتوں میں ایسے کلمات و الفاظ کا رواج تھا جو مرد کبھی زبان پر نہ لاتے تھے اور جو کبھی استعمال کر بیٹھتا تو اُس کی خوب ہنسی اُڑائی جاتی تھی"[۴]

خواتین کی زندگی کے معلومات اور مشاغل مصری تہذیب سے لے کر یونانی تک اور سومیری سے چینی و برِصغیر پاک و ہندی تک مردوں سے کافی جدا رہے ہیں۔ عورت محدود گھریلو زندگی گزارنے اور بچوں کی پرورش و تربیت کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ زبان اور صنعت و زبان سازی کے میدان میں مردوں سے کہیں آگے نظر آتی ہیں۔ چین میں زمانہ قدیم سے عورت کو جو عزت حاصل تھی اُس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ چینی زبان کی ایک انسائیکلوپیڈیا (دائرہ المعارف) ۱۶۲۸ میں سے ۱۳۷۲ ابواب میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ زمانہ قدیم کی چینی عورت کتنی صناعات کی مالک تھی نیز یہ کہ اس کی ادبی قابلیت کس حد تک ممتاز ممیز تھی۔"[۵]

بعض یورپی ممالک میں زبان کا فرق اس وجہ سے بھی تھا عورتوں کے لئے عبرانی زبان بولنے اور عبرانی زبان میں عبادت کرنے یا دعائیں مانگنے کی ممانعت تھی۔ عورتیں اپنی مخصوص عوامی زبان ہی استعمال کرتی تھیں اور اسی زبان میں دعائیں مانگتی تھیں۔ اس زبان کو "یدش" کا نام دیا گیا تھا جس کے اصطلاحی معنی "عورتوں کی جرمن" تھا۔ مرد اس زبان کو بولنا توہین خیال کرتے تھے۔ اور اس زبان کو ایک کم تر درجے کی زبان سمجھا جاتا تھا جو صرف خواتین اور کم درجے کے طبقات سے وابستہ خیال کی جاتی تھی۔

"زبان کی ابتدا سے لے کر اس کی ترویج اور تدریس میں عورت کا کردار ہر تہذیب میں نمایاں نظر آتا ہے۔ کیونکہ بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ہمیشہ سے عورت

کی رہی ہے۔ "میکسیکو کے پرانے قوانین میں ماں کو استاد اور بچہ کو شاگرد کی حیثیت
دی گئی ہے۔"(۶)

غیر مہذب تہذیبوں میں مرد اور عورت کی زبان میں فرق نمایاں ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں مرد و عورت کے مشاغل میں بہت تقسیم و تفریق پائی جاتی ہے زمانہ قدیم سے مردوں اور عورتوں نے جب خاندان کی صورت میں اپنی زندگیوں کا آغاز کیا تو آہستہ آہستہ اپنی ذمہ داریاں بھی بانٹتے چلے گئے۔ مرد زیادہ تر شکار کے لئے دور دور تک نکل جایا کرتے تھے اور خواتین بچوں اور باقی خواتین کے ساتھ پیچھے رہتی تھیں اُمورِ خانہ داری سنبھالتیں اور دستکاریوں میں وقت صرف کرتیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ اولاً اشیاء کے نام اُن سے وابستہ آوازوں کی نسبت سے رکھے جاتے تھے۔ اور چونکہ عورتوں کے مشاغل مردوں سے زیادہ تھے اس لئے عورتیں زبان سازی کے معاملے میں مردوں سے برتری رکھتی تھیں۔ اور چونکہ عورت کا تعلق مختلف طرح کے ریشوں سے لباس اور روزمرہ ضرورت کی اشیا بننے اور برتن بنانے، برتنوں پر نقوش بنانے، چمڑوں پر نقوش بنانے، جسم گدوانے، گھروں یا غاروں کے دیواروں کو اشکال سے سجانے اور بچوں کو مختلف اشیاء اور جانوروں کے علاوہ درختوں جڑی بوٹیوں کی اشکال بنا کر ان کا استعمال اور مطالب سمجھانے کا کام زیادہ تر عورت کے پاس رہا لہٰذا عورت نے زبان کی زبانی و تحریری ہر صورتوں میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ آہستہ آہستہ جوں جوں انسانی تہذیب ارتقا کی منازل طے کرتی چلی گئی تو زبان اور اس کے استعمال میں فرق واضح ہوتا چلا گیا۔

انسان کی زبان اس کی حیثیت و مرتبے کی شناخت کی غماز بھی ہوتی ہے۔ جس معاشرے میں عورت کی حیثیت عزت دار رکنِ معاشرہ کے طور پر تسلیم کی جاتی تھی وہاں کی نسائی زبان میں بھی اسکی جھلک نظر آتی ہے۔ ابتدائی سطح پر چونکہ ہمیں ادبی یا غیر ادبی زبان کے ایسے نمونے دستیاب نہیں ہیں جن سے نسائی زبان کی واضح شکل ابھر کر سامنے آسکے اور اس زبان کے سفر میں عورت کی طرف سے بلاواسطہ شمولیت بھی بہت دیر سے سامنے آتی ہے۔ یہ معاملہ صرف اردو زبان کے ساتھ ہی نہیں دنیا کی تمام زبانوں میں بلاواسطہ نسائی زبان یا اظہار بہت دیر سے ملتا ہے۔

اس کی وجہ یہ نہیں کہ عورت بے زبان یا گونگی تھی بلکہ اس کی وجہ اس کی معاشرتی حیثیت اور مقام تھا جہاں اسے لکھنے پڑھنے سے دور رکھا جاتا تھا اور ناقص العقل بھی کہا جاتا تھا۔ تعلیم سے دوری کے علاوہ تعلیم عورت کے لیے غیر ضروری ہونے کا عام تصور بھی تمام انسانی تہذیبوں میں موجود تھا۔ زبان جب تک محض بولی تھی تب تک تو ہم اس کی بابت کوئی درست اندازہ نہیں لگا سکتے مگر اس متعلقہ عہد کی کسی بھی قسم کی تحریر

خواہ وہ قانونی دستاویز ہی کیوں نہ ہو سے ہمیں اس بات کا اندازہ لگانے میں سہولت ملتی ہے کہ وہاں کی عورت کس قسم کے حالات میں رہ رہی تھی اور اس کا طرزِ عمل اور اظہار کس قسم کا رہا ہو گا۔ عورت کی زبان انھی تناظرات کے زیرِ اثر پروان چڑھتی آئی ہے۔ یہ ہزار سالہ لسانی سفر اپنے اندر ان تمام تاثرات کو سمیٹتا ہوا یہاں تک پہنچا ہے۔

دنیا کے پہلے تحریری "قانون حمورابی" میں بھی عورتوں اور مردوں کی زندگی کی الگ الگ حیثیتوں اور مقام سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دونوں کے معمولات و مشاغل کی نوعیت جدا جدا ہونے کے باعث اُن کی زبان میں بھی فرق یقینی رہا ہو گا کیونکہ زبان کے محرکات کا تعلق ماحول کی تہذیبی و ثقافتی اور سماجی و معاشرتی حیثیتوں سے گہری وابستگی رکھتا ہے۔ اس قانون کی ۲۸۲ شقیں ہیں جن میں سے شق نمبر ۱۲۹، ۱۳۱، ۱۳۰، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۵۰، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۹، ۱۶۸اور ۱۷۰ میں گھریلو، ازدواجی زندگی، عورتوں کی خرید و فروخت، ان کی ملکیت، زنا کرنے کی سزا، وراثت وغیرہ کی بابت قانونی حیثیت ور ہنمائی موجود ہے۔

> 131. If a man has accused his wife but she has not been caught lying with another man, she shall take an oath in the name of god and return to her house.
>
> 141. If the wife of a man who is living in her husband's house, has persisted in going out, has acted the fool, has waster her house, has belittled her husband, he shall prosecute her.If her husband has said, "I divorce her," she shall go her way; he shall give her nothing as her price of divorce.If her husband has said "I will not divorce her" he may take another woman to wife; the wife shall live as a slave in her husband's house" . (۷)

اس قانون کی مندرجہ بالا شقیں ہمیں بتاتی ہیں کہ اس دور میں عورت کے ساتھ کیسے معاشرتی، قانونی اور ازدواجی معاملات درپیش رہے۔ قانونی اور معاشرتی حیثیت کا ذکر اس لیے ناگزیر ہے کہ اس سے عورت کی زندگی، اس کے معمولات کا واضح ادراک ہمیں اُس لسانی امتیاز کی نشان دہی میں مدد کرتا ہے جو نسائی زبان کا خاصہ ہے۔ مالک رام اپنی کتاب "حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن" میں قانونِ حمورابی جسے دنیا کے پہلے اور قدیم ترین تحریری قانون کا درجہ حاصل ہے میں شق نمبر ۱۳۲ اور ۱۳۳ میں لکھتے ہیں:

"اگر کسی شخص کی بیوی کے خلاف کسی دوسرے مرد کے باعث انگشت نمائی کی جائے اور وہ دوسرے مرد کے ساتھ ہمبستری کی حالت میں نہ پکڑی گئی ہو تو وہ عورت اپنے خاوند کی خاطر متبرک دریا میں غوطہ لگائے۔"

شق نمبر ۱۳۳: اگر کوئی شخص قیدی ہو جائے اور اس کے گھر میں کھانے پینے کا سامان موجود ہو اور اس کے باوجود اس کی بیوی اس کا گھر چھوڑ دے اور کسی دوسرے کے گھر میں چلی جائے تو چونکہ اس عورت نے اپنے جسم کی حفاظت نہیں کی بلکہ کسی دوسرے کے گھر پڑ گئی اس لیے وہ عورت قابلِ مواخذہ ہے اس کو دریا میں ڈبو دیا جائے۔(۸)

اس قانون میں یہ بھی شامل تھا کہ عورت بطور لونڈی کی خرید و فروخت جائز ہے اور اگر داشتہ اگر اولاد بھی اس شخص سے رکھتی ہے تو مرد اگر اسے معاوضہ دے کر طلاق نہ دے سکے تو وہ دوسری عورت لے آئے اور یہ عورت اس کے گھر لونڈی بن کر رہے گی۔ عورت کو طلاق دیتے وقت مرد اسکو "زرِ عروس" بھی بعض صورتوں میں ادا کرنے کا پابند تھا۔

اگرچہ ہمیں اس قانون کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس قانون میں عورت اور ازدواجی معاملات کو خاصی اہمیت دی گئی تو بے جا نہ ہو گا۔ مگر اختیارات کسی حد تک محدود ہی نظر آتے ہیں۔ اگر ہم رابن لیکاف کے عورت کی زبان بابت نظریات کے تناظر میں دیکھیں تو محکومی اور زیر دستی کے حالات میں اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عورت کی زبان اس عہد میں بھی معذرت خواہانہ ہو گی یا بے جا تاویلات پیش کرنے والی، بات بات پہ خوشامدی یا غیر ضروری الفاظ سے تفصیلات و جزیات کی بھرمار ہو گی۔ کیونکہ حاکم و محکوم کی زبان اور لب و لہجہ ہمیشہ مختلف ہوا کرتا ہے۔ یہی وہ رویے تھے جو نسائی زبان اور نسائی فکر کے پیچھے کارفرما تھے۔ جن کا مطالعہ ہمیں نسائی زبان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد فراہم کرے گا۔ علی عباس جلالپوری کا حمورابی قانون کی بابت خواتین کی مجموعی حیثیت کے حوالے سے یہ کہنا ہے:

"اس ضابطے میں ان تمام کاموں کو جرائم میں شمار کیا گیا ہے جن سے کسی شخص کی ذاتی املاک پر زد پڑتی ہو چنانچہ ڈاکے چوری کی طرح زنا بالجبر کو بھی سنگین جرم قرار دیا گیا کیونکہ عورت بھی شخصی املاک بن کر رہ گئی تھی"(۹)

زبان معاشرت کا جزوِلازم ہے اور اس کا آئینہ بھی کہلائی جا سکتی ہے۔ جس معاشرے میں مرد اور عورت کی زندگی کے معمولات اور حیثیتوں میں اجتماعی سطح پر جتنا بڑا فرق ہو گا اتنا ہی اس کے طرزِ عمل کے باعث اس کی زبان میں بھی فرق آئے گا۔ جان ڈیوی کا کہنا ہے کہ فرد کے انفرادی عمل کو تشکیل دینے میں رسوم وروایات جو حصہ لیتی ہیں وہ اس کی مادری زبان کے پورے ذخیرہ الفاظ کے برابر ہے

ہماری اردو زبان میں فرق دنیا کی دوسری زبانوں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی دوسری کئی تہذیبوں میں پردے کا وہ رواج نہیں جو ہمارے برصغیر کی تہذیب و تاریخ میں رہا ہے۔ یہاں کی طرزِ معاشرت اس بات کی گواہ ہے کہ یہاں مردانہ معاشرت، زنانہ معاشرت دو الگ الگ انداز سے پروان چڑھی ہے۔ برصغیر کے سماج میں ہندوانہ رسوم ورواج اس قدر پختہ اور قدیم رہے ہیں کہ مسلمان حکمران آنے کے بعد اور اسلام آنے کے بعد بھی یہاں زیادہ تہذیبی فرق پیدا نہ ہو سکا۔ بلکہ مسلم حکمران جو باہر سے یہاں آئے وہ اور ان کے ساتھ آنے والی خواتین کچھ اپنا تہذیبی ورثہ ساتھ لائے اور کچھ برِ صغیر پاک وہندی تہذیب نے اس مین شامل ہو کر خوب صورت امتزاج پیدا کر دیا۔ جیسا کہ آپ مذہبی سطح پر بھی دیکھ سکتے ہیں کی بدھ مت جو یہاں صدیوں سے رائج تھا اور ایک فرار کا مذہب کہلاتا ہے اُس نے عیسائی اور مسلمان صوفیا کو بھی نفس کشی، چلہ کشی، تسبیح گردانی، مراقبے کی طرف مائل کر لیا۔

اسی طرح رہن سہن جو کسی بھی زبان کی اصل شکل میں نظر آتا ہے وہ بھی اس کے سفر کو لازماً متاثر کرتا ہے۔ یورپی تہذیب کی طرح تاریخ ادبیاتِ ہند بھی اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ یہاں بھی زبان طبقاتی وصنفی امتیازات کی حامل رہی ہے۔ تاریخ ہند کی قدیم ترین شعری اصناف میں دو اقسام ہندوؤں میں ملتی ہیں۔ علی عباس جلال پوری نے "روایات، تمدن قدیم" میں وضاحت کی ہے کہ ان دو اقسام مین پہلی کو "ورشے" یعنی جسے دیکھا جا سکے دوسری کو "سروے" جسے سنا جا سکے کہا جاتا تھا۔ "ورشے "کا تعلق ناٹک سے تھا اور ناٹک کی تاریخ بتاتی ہے کہ اس میں کام کرنے والے تمام کردار اپنی اپنی طبقاتی اور صنفی حیثیت کے مطابق الگ الگ زبان استعمال کرتے تھے۔ عورتوں یا نسوانی کرداروں کی زبان اور ادنیٰ درجے کے عام عوام کی زبان پراکرت ہوتی تھی۔ یعنی یہاں بھی برہمن طبقے کے مردوں کی زبان عورتوں اور عوام سے الگ تھی۔ علی عباس جلال پوری لکھتے ہیں:-

> "زبان کے اعتبار سے ہندووں کے ناٹک میں ایک بات ایسی ہے جو کسی قوم
> کے ڈرامے میں دکھائی نہیں دے گی اور یہ ہے کہ اشخاصِ ڈرامہ میں ہر شخص

اپنی حیثیت اور درجے کے مطابق ایک خاص زبان میں بات کرتا ہے۔ عوام
پراکرت بولتے ہیں سنسکرت شرفاء کے لئے مخصوص ہے(۱۰)

ہندو تہذیب کی ایک اور روایت "جاتک کہانیوں" کے نام سے موجود رہی ہے۔

جس میں بچوں کو سکھانے یا بتلانے کے لئے آسان سادہ الفاظ میں مذہب اور تاریخ یاد کروائی جاتی تھی۔ عورت کی زبان میں جو لوچ، چاشنی، دلچسپی، مٹھاس، نرمی اور ایک خاص لطف وچٹخارہ ہے وہ اُن کے محاورات میں واضح نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے وہ جذیاتِ حیات کو مرد کی طرح سرسری نہیں لیتی اور بڑی باریک بین واقع ہوتی ہے۔ عورتوں کے ہاں رمز وایما اور توہم پرستی بھی دنیا کے تمام حصوں میں بہت عام پائی جاتی ہے۔ حتاکہ ترقی یافتہ اقوام کے ہاں بھی خواتین کی عمومی سوچ پسماندہ اقوام سے قریب قریب دیکھی جاتی ہے۔

ج) عام زبان اور خواتین کی زبان کے تفریقی پہلو:

اردو زبان میں ایک بہت بڑا ذخیرہ الفاظ نسائی حوالے سے الگ کیا جا سکتا ہے۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں الفاظ ایسے ہیں جو صرف خواتین کی مخصوص زبان سے وابستہ ہیں۔ اس طرح محاورات، کہاوتیں، روز مرہ اور ضرب الامثال کی تعداد بھی ہزاروں ہے۔

دنیا کی دیگر زبانوں میں بھی ایسی صورت حال کسی نہ کسی حد تک تھوڑے بہت فرق کے ساتھ موجود ہے۔ جن ترقی یافتہ اقوام میں جدید طرزِ حیات کے باعث عورت اور مرد کے معمولاتِ زندگی، روزگار، تعلیم اور طرز معاشرت کے طور طریقوں میں جتنی زیادہ عمومیت اور یکسانیت آتی جارہی ہے وہاں یہ فرق بھی تقریباً کم سے کم تر ہوتا چلا جارہا ہے۔ لیکن جن معاشروں میں ہمارے برصغیر کی طرح کا ماحول اور سوم ورواج باقی ہیں وہاں یہ فرق بھی بہت نمایاں طور پر موجود ہے۔ ہمارے ہاں گھریلو زندگی اور باہر کے معمولاتِ زندگی میں فرق آج بھی واضح پایا جاتا ہے۔ خواتین کا بیشتر وقت آج بھی اندرونِ خانہ ہی گزرتا ہے اور ان کا واسطہ باہر کی دنیا سے کم کم ہی پڑتا ہے۔ اس لئے گھروں، گلیوں محلوں میں، شہری ودیہی آبادیوں میں خواتین آج بھی مخصوص "نسائی زبان" اور دلکش محاورات کا استعمال سہولت سے کرتی ہیں۔ اگرچہ اب بہت سے محاورات کا استعمال ختم ہونے کا باعث اُن کی تفہیم کا دائرہ بھی سکڑتا چلا جارہا ہے جو ہم نے دلی اور لکھنؤ کی تہذیب سے لئے تھے اور اُردو زبان کا خوب صورت اور قیمتی اثاثہ ہیں۔ مگر زبان چونکہ کوئی ساکت وجامد چیز نہیں۔ اس لئے اس میں جدید الفاظ ومحاورات کا اضافہ بھی ہوتا چلا جارہا ہے۔

اُردو زبان میں نسائی الفاظ و محاورات کابڑا ذخیرہ آج بھی صرف عورتوں سے مخصوص ہے اور وہی بولتی ہیں۔ جیسے مثال کے طور پر کھٹائی میں ڈال رکھنا، کن سوئیاں لینا، جلے پاؤں کی بلی ہونا، مانگ سے ٹھنڈی ہونا، ملیامیٹ ہونا، دال میں کچھ کالا ہونا، ہاتھ پیر تلے ہونا، زمین دیکھنا(قے کرنا) ہزاری روزہ ہونا، لگائی بجھائی کرنا، پیٹ کی ہلکی ہونا، چھاتی پہ مونگ دلنا، دوجی سے ہونا، اَن گنا مہینہ لگنا(حمل کا آٹھواں مہینہ شروع ہونا)، اسی طرح بے شمار محاورے ہیں جن کو پڑھ کر خواتین کی مخصوص زبان اور طرزِ حیات کی عکاسی ہوتی ہے۔

عورت کے ہاں شرم وحجاب کے باعث بہت سی باتوں کے لئے اصل کے بجائے کوئی علامتی الفاظ استعمال کرنے کارواج بھی عام رہاہے۔ زنانہ معاشرے کو مردانہ معاشرے سے الگ رکھنے کے باعث دونوں کے درمیان محدود اور ضروری گفتگو اور کلام کے لئے محدود موضوعات اور الفاظ ہی پر اکتفا کیا جاتا تھا۔ جس کے باعث زبان میں فرق آنالازمی تھا۔ بعض گھرانوں میں ہوش سنبھالتے ہی مرد بچے کو زنان خانے سے اٹھالیا جاتا اور مردان خانے میں مرد ملازمین کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ وہ صرف کھانے پینے یا بہت کم کسی ضرورت کے لئے زنان خانے میں جاتے تھے۔ تاکہ اُن تربیت میں خواتین کی سی عادات، زبان اور جذبات نہ پروان چڑھنے پائیں۔ خواتین ویسے بھی مردوں کے مقابلے میں بہت زود گو واقع ہوتی ہیں انہیں بولنے کی مشین بھی کہا جاتا ہے ایک چینی کہاوت ہے زبان عورتوں کی تلوار کی طرح ہوتی ہے جسے وہ کبھی زنگ نہیں لگنے دیتیں۔ وہ بچوں سے بھی پیارومحبت کے اظہار میں ہر وقت اُن سے توتلی زبان میں باتیں کرتی رہتی ہیں جبکہ وہ ابھی ان باتوں کے سمجھنے کے قابل نہیں ہوتا۔

اُداس ہوتی ہیں تو میکے میں ماں، بھیا، بابل کو اپنے گیتوں میں یاد کرتی ہیں۔ کچھ نہ بتانا اور چھپانا ہو تو لفظوں کے استعمال میں ایسا گورکھ دھندہ اور علامتیں لے آتی ہیں کہ عام انسان اُن کے مطلب تک پہنچ ہی نہیں پاتا۔ اور جب لڑائی جھگڑے اور طعنے تشنے پر اتر آئیں تو ایسی ایسی تراکیب و اصطلاحات استعمال کریں گی کہ شریف انسان سنے تو اُس کے کانوں کی لو تک جل اُٹھے۔

غیبت، حسد، چغلی جھوٹ، مکر فریب اور دھوکہ دینے میں بھی مرد اِن کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ لفظوں سے یوں کھیلتی ہیں کہ سننے والے کے آگے تصویر کر دیتی ہیں اور الفاظ میں جذبات ایسے بھر دیتی ہیں کہ جیسے سامع کے کانوں کے راستے اندر انڈیل رہی ہوں۔ ماں، بیوی، بہن، بیٹی ہر روپ میں اِن کا طرزِ بیاں مختلف ہو گا اور اکثر پُر تاثیر بھی۔ اِن کے ہاں نہ الفاظ کی کمی ہے نہ اِن کے استعمال میں کوئی کوتاہی برتیں گی۔ انھی صلاحیتوں کے باعث انھوں نے زبان کو بہت وسعت عطا کی ہے۔ ان کی زبان اور محاورات میں پوری تہذیب

اور تاریخ جمع ہے۔ مذہب سے لے کر توہمات تک، رسوم ورواج سے لے کر روز مرہ معمولات تک، محبت سے نفرت تک، حسد سے رقابت تک، شوخی وادا سے لے کر بے رُخی و بے اعتنائی تک اور زندگی کے ہر شعبے، عمر کے ہر دور، جذبات کے ہر انداز واتار چڑھاؤ تک یہ الفاظ و محاورات کے مخصوص ذخیرے کو استعمال کرنے اور خوبی سے برتنے میں ملکہ رکھتی ہیں۔

محاورات کے ساتھ ساتھ نسائی زبان روز مرہ اور ضرب الامثال و کہاوتوں میں بھی ہر ذائقہ رکھتی ہے۔ جس میں کہیں شرم وحجاب جواز بنتا ہے اور کہیں سماج۔ کہیں رمز وایما اور کہیں اشارہ کنایہ، کہیں روز مرہ زندگی کے تجربات ومشاہدات تو کہیں آفاقی صداقتیں ایسی گفتگو کی چاشنی مردوں کے ہاں ناپید ہے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ "اردو زبان اور لسانیات" میں لکھتے ہیں:

" کہاوتیں دراصل سماجی سچائیاں ہوتی ہیں، جن کی بنیاد اکثر و بیشتر کسی حادثے یا واقعے یا حوالہ پر ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایسی تلمیحیں ہیں جنھیں انسانی تجربے یا عقل کا نچوڑ بھی کہا جا سکتا ہے۔ پہلے یہ واقعاتی طور پر ایک انسان کی زبان میں ظاہر ہوئی ہوں گی، پھر اس سے ملتا جلتا واقعہ کئی افراد کے سامنے آیا اور نتیجے کے طور پر کوئی مثل یا کہاوت بن سنور اور تراش ترشا کر زبان میں داخل ہو گئی۔ کہاوتوں کے پیچھے جو حادثہ یا واقعہ ہوتا ہے، کئی بار وہ کہانی کی شکل میں بھی مشہور ہو جاتا ہے۔ جس سے وہ کہاوت دور دور تک پہنچ جاتی ہے۔"(۱۱)

نسائی موضوعات اور احساسات کی ایک طویل فہرست جیسے: گھر کی مرغی دال برابر، غریب کی جورو سب کی بھاوج، گُڑ کھاؤں گلگلوں سے پرہیز، توے کی تری ہاتھ کی میری، سر سہلائے بھیجا کھائے، جہاں بیری وہاں پتھر وغیرہ۔ ان سب میں بھی عورتوں کے جذبات کی خُو ملتی ہے۔ اور اُن کے نازک احساسات اُن کی زبان اور محاورات میں اُن کے گیتوں کے موضوعات میں جھلکتے ہیں۔ ایک اور بات یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ مردوں کی زبان جلدی سے تبدیل ہو جاتی ہیں مگر دنیا بھر کی عورتیں زبان کے معاملے میں تھوڑی قدامت پسند واقع ہوئی ہیں۔ اور خارجی تبدیلیاں اُن کے ہاں ذرا دیر سے قابل قبول ہوتی ہیں۔ اسی طرح اُن کے ہاں صحتِ لفظ یا تلفظ کی درستی زیادہ معنی رکھتی ہے۔ وہ زبان کو بگاڑنے میں مردوں سے بہت پیچھے رہی ہیں۔ وہ فرسودہ اور قدیم الفاظ جو عموماً مرد استعمال کرنا جلد ہی چھوڑ دیتے ہیں یہ طویل عرصے تک اُن الفاظ اور تراکیب

کا ساتھ نبھاتی چلی جاتی ہیں۔ اور جدت پسندی کو مردوں کے مقابلے میں بہت خوش دلی اور سرعت سے قبول کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہیں اور مردوں کے مقابلے میں غیر مہذب اور ناشائستہ بازاری الفاظ کے استعمال سے ہمیشہ گریزاں رہتی ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ "اردو زبان اور لسانیات" میں لکھتے ہیں:

"محاورے ہوں یا کہاوتیں، ان کی سماجی توجیہہ کرتے ہوئے بعض کے بارے میں آسانی سے پتا چلایا جا سکتا ہے کہ ان کی مذہبی اصل کیا ہے۔ مثال کے طور پر نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچے گی، گھی کے چراغ جلانا، لنکا سے جو بھی نکلے باون گز کا، کہاں راجا بھوج کہاں گنگوا تیلی، رام کہانی سنانا، بگلا بھگت، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا،۔۔۔ الٹی گنگا بہانا، جوگی کس کے میت، گھر کے بھیدی لنکا ڈھائے۔۔۔ گئے تھے نماز بخشوانے روزے گلے پڑے، مفت کی شراب قاضی کو حلال، سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی، دو ملاؤں میں مرغی حرام، ملا کی دوڑ مسجد تک،، مرے کو مارے شاہ مدار، عید کا چاند ہونا وغیرہ"(۱۲)

آج ہم محاوروں اور کہاوتوں پر غور کریں تو اس میں سماجی اور مذہبی اثرات کے ساتھ ساتھ مذہب کے حوالے سے اثرات لفظیات کی صورت میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو چکے ہیں لیکن زبان یا لفظیات کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، ان کی بدلتی ہوئی اشکال اور مفاہیم اپنی جگہ اور مقام خود بنا لیتے ہیں۔ ان کا ذخیرہ عام عوام کے استعمال سے بنتا اور بڑھتا ہے۔ اسی موضوع پر قرۃ العین نے اپنے ایک افسانے "جلاوطن" میں بھی اشارہ کیا ہے اور بہت خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"زبان اور محاورے ایک تھے مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لیے منہ نیلا پیلا کیے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلاتے۔ برسو رام دھڑاکے سے، بڑھیا مر گئی فاقے سے۔ گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا۔ ہاتھی گھوڑا پالکی، جے کنیا لال کی۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنھوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی، رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں۔ بھری گگری موری ڈھرکائی شام۔۔۔ کرشن کنیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال، یہ محاورے، یہ زبان، اس سب کی بڑی پیاری اور دل آویز مشترکہ میراث

> تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزا پور اور جون پور سے لے کر لکھنؤ اور دلی
> تک پھیلا ہوا تھا، ایک مکمل اور واضح تصویر تھا۔"(۱۳)

عورتوں کے ہاں اُن کے جذبات کا اظہار بھی مخصوص سماجی نظام میں بہت دشوار اَمر رہا ہے۔ وہ کھلے لفظوں میں بات کرنے سے کتراتی ہیں اور سیدھی بات کہنے کے بجائے متبادل الفاظ اور استعارات تلاش کرتی ہیں اپنے شوہر کا نام تک زبان پہ لانے کو معیوب سمجھتی ہیں۔ طعنے تشنوں سے کام تو لیتی ہیں، شور ہنگامہ تو کرتی ہیں بدفالیں بددعائیں تو دیتی ہیں مگر گالی گلوچ سے بچتی ہیں اور مردوں کی طرح فحش گوئی سے پرہیز کرتی ہیں۔ یوں اِن بے شمار حوالوں اور صورتِ احوال کے باعث اُردو زبان میں نسائی زبان و محاورہ اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔

متمدن اور ترقی یافتہ زبان کی پہچان ہی یہ ہوتی ہے کہ اُس میں ذخیرہ الفاظ کتنا ہے۔ اُن کے قواعد واضح ہیں اور اُن کے ہاں الفاظ کے مفاہم کتنے وسیع اور کتنے واضح ہیں۔ جیسے عربی زبان ایک بڑی زبان شمار ہوتی ہے کیونکہ اس میں فصاحت و بلاغت بہت زیادہ ہے اور یہاں کیفیات سے لے کر احساسات اور واقعات سے لے کر جذبات تک کہیں الفاظ میں ابہام اور دشواری پیش نہیں آتی۔ زبان کی یہ خوبی غیر متمدن زبانوں میں نہیں ملے گی۔ بعض زبانیں اس حوالے سے کسمپرسی کا شکار ملیں گی اور بعض میں پیچیدگیاں اس قدر ہوں گی کہ ابلاغ دشوار نظر آئے گا۔ اسی موضوع پر ڈاکٹر گیان چند کا مضمون "آغازِ نطق سے اُردو تک" موجود ہے جو "اُردو میں لسانی تحقیق" میں شامل ہے۔ جس میں وہ زبان کے اسی افلاس کا ذکر کرتے ہیں کہ دنیا کی مختلف زبانوں میں کیا کیا مسائل موجود ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند اپنے مضمون "آغازِ نطق سے اُردو تک" میں لکھتے ہیں:

> "غیر متمدن زبانوں کے افلاس کی دلچسپ مثال یہ ہے کہ ریڈ انڈین قبیلہ چیزو کی زبان میں سر دھونے، ہاتھ دھونے اور جسم دھونے کے علاحدہ علاحدہ الفاظ ہیں لیکن محض دھونے کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ تسمانیہ (آسٹریلیا کے جنوبی جزیرے) کی زبانوں میں مختلف پیڑوں کے نام ہیں لیکن پیڑ کے لئے کوئی لفظ نہیں۔ جنوبی افریقہ کی زُولو زبان میں لال گائے، سفید گائے، کالی گائے کے لئے علاحدہ لفظ ہیں لیکن صرف گائے کے لئے کوئی لفظ نہیں"(۱۴)

د) عورت میں زبان سازی کی صلاحیت

عورتوں میں زبان سیکھنے اور سکھانے کی صلاحیت مردوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے۔ جزیرہ ہواتی میں زمانہ قدیم سے ندی کنارے کے درختوں کے نیچے مخصوص انداز اور مخصوص وقفوں کے ساتھ لکڑی کے مضبوط ٹکڑے سے ضرب لگائی جاتی تھی جو دور تک پیغام پہنچانے کا کام دیتی تھی اور وہاں رہنے والے افراد اِن اشارات کی تفہیم بخوبی کرسکتے تھے۔

اسی طرح افریقہ کے لوگ ڈھول کی تھاپ یا اُس پر مخصوص انداز اور وقفوں سے ضرب لگا کر اپنا پیغام دور دور تک پہنچانے کا باقاعدہ نظام رکھتے تھے۔ جنگ کے بعد خواتین کو یرغمال بنانے کی روایت تاریخ میں ہر قوم ہر زمانے میں رہی ہے۔ ان خواتین کے ذریعے فاتح اقوام کی زبان میں نئے الفاظ اور نئی زبان کی ترسیل کا کام جاری رہا۔ علامہ نیاز فتح پوری ان مفتوح خواتین کی بابت لکھتے ہیں کہ عورتیں بطور کنیز جہاں بھی جاتیں وہاں اپنی صنعتوں کو رائج کیا کرتیں اور اپنی زبان کی اشاعت بھی کرتیں، نئی زبان بھی سیکھتیں۔ (۱۵) یعنی عورت زبان کی سفیر بھی رہی ہے اور اِس کی ترویج اور ترقی میں اپنا بھرپور حصہ بھی ڈالتی آتی ہے۔ ابھی خواتین کے ذریعے جاسوسی کا کام بھی لیا جاتا تھا اور انھیں دوسری اقوام کی زبان سیکھنے اور استعمال کرنے کی ترغیب بھی دلائی جاتی تھی۔ مذہبی عبادات اور سماجی و ثقافتی اقدار کے تسلسل اور مشاغل و فنون کی وسعت و اختراع میں عورتیں ہمیشہ پیش پیش رہی ہیں۔

ماہرین علم بشریات میں سے ایک نام سر جیمز جارج فریزر کا ہے وہ گلاسکو میں پیدا ہوئے اور ۱۸۸۸ میں انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا (Encyclopaedia Britannica) کے لیے ان کو دو بہت اہم مضامین لکھنے کو کہا گیا تھا جو "ٹوٹم ازم" اور "ٹیبوز" کے حوالے سے تھے۔

(Encyclopaedia Britannica) کے نویں ایڈیشن کے لیے یہ مضامین درکار تھے۔

"Taboo" اور دوسرا "Totemism" "ٹوٹم یا ٹوٹم پسندی سے مراد قدیم تہذیبوں کی رو سے مظاہرِ فطرت میں سے کسی چیز، اسم، عقیدے وغیرہ کی طرف یا اس کی نسبت یا پرستش کے ہیں۔ ان کے مطابق ان کا کہنا ہے کہ

> ترجمہ: " آسٹریا میں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ مرد و عورت کی زبان بالکل ایک
> دوسرے سے مختلف ہے اور شادی کے بعد اپنی اپنی بولی بولتے ہیں۔ مغربی
> وکٹوریہ کی بعض قوموں میں مرد اس عورت سے شادی نہیں کر سکتا جو وہی

زبان بولتی ہیں جو مرد بولتے ہیں اور شادی کے بعد جب ایک دوسرے کے
قبیلے میں جاتے ہیں تو اس قبیلہ کی زبان میں گفتگو کرنا ممنوع ہے"(۱۶)

ہر زبان کی کئی سطحیں ہوتی ہیں جسے ہم سماجی بولیوں اور ادبی زبان کے دو بڑے حصوں میں عمومی طور پر تقسیم کرتے ہیں ایک توsocial dialect ہے دوسرا عالمانہ سطح یا ادبی اعلیٰ سطح کی زبان کو Cultivated Speech کہا جاتا ہے۔ ایک سطح اور بھی ہوتی ہے جسے عام عوامی سطح کہا جاتا ہے یہ متوسط طبقے کی عام عوام کی عام روز مرہ کی بات چیت کی زبان ہے ۔ہاں البتہ نچلے درجے یا اَن پڑھ کی زبان کو Folk Speech کہتے ہیں۔ عورت کی زبان کے حوالے جسے بیگماتی زبان بھی کہا جاتا ہے اُس سطح کی زبان کو ہمSocial dialect رکھتے ۔ لیکن اگر خواتین کا تعلق جو کسی بھی اَن پڑھ یا انتہائی پسماندہ طبقے سے ہو تو وہfolk speech ہی کہلائے گی۔

ادبی سطح پر خواتین کی زبان کے حوالے سے اگر بات ہو رہی ہو تو "ریختی" کے ذکر کے بغیر یہ موضوع کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ ریختی میں عورت کے جذبات و احساسات کی عکاسی مرد شعراء نے کی اور چاہے اس کا مقصد یا تحریک کچھ بھی رہی ہو کم از کم عورت کی زبان اور محاورہ شعری قلب میں ڈھل کر محفوظ ہو گیا۔ اگرچہ اس کا بیشتر حصہ ایسا نہیں کہ اُسے تہذیب و شائستگی کے ساتھ دہرایا جاسکے مگر اس تحریک نے لکھنؤ کی زبان اور نسائی محاورے کو بہت تقویت بخشی۔

اُردو زبان کے دو بڑے دبستان دہلی اور لکھنو کے ماخذات بھی وہاں کی عورت کی زندگی کی عکس بندی کرتے ہوئے اُس عہد کی نثری و شعری اضاف میں وضاحت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہم جہاں لکھنوی تہذیب کے پُر تکلف و پُر تصنع ماحول میں عورت کی زندگی اور زبان کا مشاہدہ کرتے ہیں تو لباس، طرزِ معاشرت، کھانے پینے، بے شمار رسومات سے آگہی ہوتی ہے وہاں اُن کے طرزِ اظہار سے ذہنی سطح کا بھی پتا چلتا ہے اور تعلیمی و تہذیبی تربیت و استعداد کا بھی۔

نسائی زبان و محاورہ کی جذباتی بحث سے قبل عورت کی زندگی کے بارے میں جاننا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اُس کی زبان کے پیچھے اُس کی رمز وایمائیت اور شرم و حجاب کے ساتھ ساتھ ماحول کی سچی عکس بندی کے صاف اور واضح پس منظر کے حوالے سے اُس کو پیش کیا جائے مثلاً اگر ہم امپیریل انڈین گزٹ (پنجاب جلد ۲) کی نسبت سے ایک جھلک عورت کی زندگی کی دیکھنا چاہیں تو اُس میں کچھ یوں رقم ہے۔ "ان میں خاص طور سے دیہات میں عورتوں کی زندگی کے بارے میں مفید معلومات ہیں۔ ان کے شہادتوں کے مطابق گاؤں

میں عورتوں کی حیثیت گھریلو خادماؤں کی ہوتی ہے۔ شوہر کے ساتھی کے طور پر نہیں۔ صبح سے شام تک وہ گھریلو کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔

"جن میں گھر کی صفائی، اناج کا پیسنا، گایوں سے دودھ دوہنا، دودھ سے مکھن نکالنا، اور پھر اس سے گھی بنانا، کھانا پکا کر مردوں کے لیے کھیتوں پر لے جانا، پانی بھرنا، کپاس سے چرغہ کات کر دھاگے بنانا۔ کپڑے سینا، کپاس چننا، سبزی کھیتوں سے لانا، فصل کے مواقع پر اناج کوٹنا، ایندھن کے لیے اپلے تھوپنا اور اناج کو لے کر منڈی جانا تاکہ اس کے بدلے مصالحہ جات کا سودا کرے، یہ وہ کام تھے جو عورتیں گاؤں میں کرتی تھیں"۔ (۱۷)

مندرجہ بالا کام اور معلومات کے پیش منظر میں جب ہم نسائی لبُ لہجے اور زبان و محاورات کو پڑھتے یا سنتے ہیں تو ہمیں ان کو سمجھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

""پیلو پکیاں وے" سے لے کر "اماں میرے بابا کو بھیجوری کہ ساون آیا"۔ جیسے لوک گیت نسائی اظہار کی غمازی کرتے ہوئے اُس ثقافتی ماحول کی تصویر بھی پیش کرتے ہیں جہاں سے اُس عورت کا نسائی لہجہ اُبھر کر سامنے آرہا ہے۔

اسی طرح ہمارے روز مرہ، محاورات، ضرب الامثال اور کہاوتوں میں ایک مکمل نسائی طرزِ فکر کا انسائیکلوپیڈیا موجود ہے جس نے اُردو زبان کو ایک نیا مذاق اور چاشنی عطا کی اور گفتگو میں لطافت اور مذاق میں جدت طرازی کا مواد تخلیق کیا۔ حسن کلام اور حسن بیاں کے پیچھے فکری سطح اور جذباتی وابستگی بھی شامل کر دی۔

ہ) نسائی زبان کے محرکات، اشاراتی و علامتی انداز:

آج اُردو زبان میں ہزاروں الفاظ و محاورات ایسے ہیں جو برِ صغیر پاک و ہندی تہذیب اور تاریخ کے بین اشارات سمیٹے ہوئے ہیں۔ جن میں قدیم برِ صغیر پاک و ہندی تہذیب سے لے کر موجودہ عہد تک کا سفر عہد بہ عہد ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں ہمیں آریائی معاشرے کی مثالی عورت کے کردار کی جھلک بھی نظر آتی ہے اور اخلاقیات نسواں کے مقررہ معیارات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ رسوم و رواج کی مضبوط ڈوریوں میں بندھی بے بسی کی تصویر کو ہم "ستی" کے روپ میں زندہ جلتے ہوئے بھی دیکھ سکتے ہیں اور مندروں میں پنڈت و برہمن کے ہاتھوں جنسی تذلیل کا بخوشی نشانہ بنتی دیوداسیوں کے شب و روز کا مشاہدہ بھی کرسکتے ہیں۔ تاریخ

کے اس سفر میں "رامائن "کا زمانہ تحریر ۵۰۰ قبل مسیح سے ۲۰۰ قبل مسیح تک کا درمیانی عرصہ بتایا جاتا ہے۔ یہ ہندو ادب کی مشہور رزمیہ نظم ہے جس کے سات باب ہیں اور ان میں ۲۴۰۰۰ اشلوک یا اشعار ہیں اسے اجودھیا کے ایک برہمن شاعر والمیک نے تحریر کیا تھا جو سنسکرت زبان میں تھی بعد ازاں اکبر بادشاہ کے دور میں ہندی شاعر "تلسی داس" نے اِس کو ہندی زبان میں تحریر کیا۔ کچھ تاریخ دان اسے محض افسانوی دیومالائی قصہ سمجھتے ہیں اور کچھ کا کہنا ہے کہ اگرچہ اس میں تخیلاتی قلابازیاں اور تشبیہات واستعارات کی بھرمار ہے مگر اس میں تاریخی صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اسی سلسلے میں پروفیسر وشوامتر رقم طراز ہیں:

"رامائن ایک بیٹے کی حیثیت سے رام چندر جی کی فرمانبرداری اور بیوی کے لحاظ سے سیتا کی اطاعت گذاری اور وفاداری اور پاک دامنی، بھائیوں کی حیثیت سے لکشمن اور بھرت کی وفا شعاری اصل میں یہ خلوص و ایثار اور مذہب و اخلاق کے وہ اسباق ہیں جس کی آج بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کی اس دور میں ناگزیر تھی۔ یہ ہندو اُصول آج بھی معاشرے کے ہر بیٹے ہر بیوی اور ہر بھائی کے لئے زندگی گذارنے کے لئے روشنی کے مینار ہیں۔"(۱۸)

"رامائن "برصغیر کی وہ رزمیہ نظم ہے جس نے برصغیر کی عورتوں کو سیتا کے روپ میں ایک مثالی کردار تقلید کے لئے اس انداز سے پیش کیا کہ آج بھی برصغیر کی ہر عورت سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ سیتا کی طرح کٹھن ترین حالات میں صبر، برداشت، حوصلے اور بے لوث ایثار و وفا کی دیوی بن کر زندگی گذارے۔

پرفیسر عمر زبیری "قدیم تہذیبیں اور مذاہب" میں اسی موضوع پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں اور ہماری قدیم ترین آریائی معاشرت کی عورت بطور بیوی کی تصویر " سیتا" کے روپ میں اور سوتیلی ماں کی ازلی رقابت اور دشمنی کے جذبے کو رام کی سوتیلی ماں "کیکئی" کی صورت میں پیش ہوئے لکھتے ہیں کہ آریاؤں کے ہاں عورت کی بہت عزت کی جاتی تھی۔

"رامائن میں سیتا کے کردار کو عورت کا معیارِ خدمت اور پارسائی قرار دیا گیا تھا۔ عورت میں ان خوبیوں کو تلاش کیا جانے لگا جو سیتا میں بیان کی گئی تھیں۔ماں کی خدمت اولاد پر فرض سمجھی جاتی تھی اور عورتوں کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ مردوں کے ساتھ حکومت کے معاملات میں، سیر و تفریح میں اور علمی مجلسوں میں شرکت کر سکیں"(۱۹)

ہند و تہذیب کے دور کی دوسری اہم ترین رزمیہ نظم " مہا بھارت " ہے۔ جو کوروں اور پانڈوں کی باہمی لڑائی اور ''بھگوت گیتا'' جیسی معروف مقدس نظم پر مشتمل ہے۔ جس میں ''دروپدی'' کا ذکر خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے جس کے کردار میں ''سیتا'' کی طرح ایک مثالی عورت نظر آتی ہے۔ انھی تاریخی کرداروں کے ساتھ آج بھی برِ صغیر پاک وہندی عورت اَن گنت قدیم رسوم ورواج کی پابند ہے۔

اُردو زبان وادب کی تمام شعری ونثری اصناف کے نسائی کرداروں کی طرزِ حیات، طرزِ فکر، طرزِ گفتار میں وہی مثالیت سی محسوس ہوتی ہے۔ جیسے ''ستی ہونا'' ''جل مرنا'' بالک وِواہ یعنی بچپن کی شادی وغیرہ آج بھی موجود ہیں۔

برصغیر کی ہندو عورت جب اسلامی معاشرے کا رکن بن بھی گئی تو اپنے اسلامی عورت کے بطور وہ تمام حقوق اور معاشرتی حیثیت حاصل نہ کر سکی جو اُس کا جائز حق تھا۔ چونکہ برِ صغیر پاک وہندی معاشرے کی مثالی عورت سیتا ہے جس کو لنکا کا راجہ راون جب اغوا کرتا ہے اور اس کے بعد اُسے رام واپس لاتا ہے تو ناپاک یا بدکردار سمجھ کر رد کر دیتا ہے۔ سیتا آگ میں سے گزرتی ہے اور اپنی پاکیزگی ثابت کرتی ہے مگر رام کے دل میں پھر بھی گنجائش پیدا نہیں ہوتی جس پر وہ دلبر داشتہ ہو کر دعا کرتی ہے اور زمین پھٹ جائے پھر اس میں سیتا سما جاتی ہے اس کی وفا، قربانی اور ایثار کو برِ صغیر پاک وہندی معاشرے میں مثالی بیوی کا کردار بنا دیا جاتا ہے۔ اسی وفا اور پاکیزگی کو ثابت کرنے کے لیئے بعد میں آنے والی عورتیں ''ستی'' ہو کر ثبوت دیتی ہیں ستی کا مطلب ہی پاک ہونا ہے۔ اور عورت کو زندہ جل کر اپنے شوہر کو وفادار ہونے کا ثبوت دینا پڑتا ہے۔ تاریخ اور زبان وادب کا سفر ساتھ ساتھ چلتا ہے اور معاشرتی زندگی کے طور اطوار زبان و ادب مین جھلکتے ہیں اورآنے والے وقت کے لیے تاریخ وادب مرتب ہوتی چلی جارہی ہے۔ معروف سیاح ابن بطوطہ جب عہد سلاطین میں برصغیر آتا ہے تو وہ ''ستی'' ہونے کی رسم کا آنکھوں دیکھا حال بھی رقم کرتا ہے اور وہ یہ روح فرسا منظر دیکھ کر بے ہوش ہو جاتا ہے جب باقاعدہ تین بیواؤں کو ڈھول باجوں اور گیت نقاروں کے ساتھ زندہ جلنے کے لیے لے جایا جاتا ہے۔

ابن بطوطہ ''عجائب الاسفار'' میں لکھتا ہے:

> "حوض کے پاس کی جگہ آگ دہکائی گئی اور جب اس پر سرسوں کا تیل ڈالا گیا تو وہ شعلہ مارنے لگی۔ پندرہ اک آدمیوں کے ہاتھ میں لکڑیوں کے گٹھے اٹھا ئے ہوئے تھے اور دس اک آدمی لکڑیوں کے بڑے بڑے کنڈے ہاتھ میں

لیے ہوئے تھے۔ آگ کو ایک رضائی کی اوٹ میں کر رکھا تھا تاکہ اس عورت کی نظر نہ پڑے۔ ان میں سے ایک عورت نے زبردستی رضائی کو ان لوگوں کے ہاتھ سے چھین لیا اور کہا کیا میں نہیں جانتی کہ یہ آگ ہے مجھے ڈراتے ہو پھر اس نے آگ کی طرف ڈنڈوٹ کی اور اپنے تئیں اس میں ڈال دیا۔ اس وقت نقارے اور نفریاں بجنی شروع ہوئیں اور لوگوں نے جو بہت سی لکڑیاں ہاتھ میں لیے ہوئے تھے آگ میں ڈالنی شروع کر دیں اور اس کے اوپر بڑے بڑے کنڈے ڈال دیئے تاکہ وہ عورت حرکت نہ کر سکے۔ حاضرین نے بھی نہایت شور کیا۔ میں یہ دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔"(۲۰)

برصغیر کی عورت کی زبان و محاورات میں تاریخی پس منظر اور اُس کی زندگی کے ان تمام جملہ پہلوؤں کے شواہد آج اُردو زبان مین سہولت سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور اُردو کے علاوہ پنجابی میں بھی ایسے محاورے موجود ہیں مثلاً نوجوان بیواؤں کو زبردستی رسیوں سے باندھ کر زندہ جلا کر ستی کرنے کی رسم تھی اور اگر کسی طرح ایسی کوئی عورت زندہ بچ نکلی اور جلنے سے بچ جاتی تو اُس کو چوہڑے چماڑوں کے حوالے کر دیا جاتا تاکہ یہ اب نیچ لوگوں کے ساتھ زندگی گزارے۔

ایسی عورت کے لئے پنجابی میں آج بھی ایک محاورہ سننے کو ملتا ہے کہ

"چتاتُو لتھی چُوہڑیاں جوگی ہوئی" یعنی بقیہ عمر ذلت و رسوائی کے ساتھ گذارے گی۔

برِ صغیر پاک و ہندی معاشرہ توہم پرستی میں بھی بہت مشہور ہے۔ توہم پرستی شگون، تعویز گنڈے، منّتیں چڑھاوے وغیرہ یہاں آج کے جدید دور میں بھی عام مشاہدے میں آتے ہیں اور اس معاملے میں برِ صغیر پاک و ہندی عورت چاہے وہ ہندو ہے یا مسلمان دونوں پیش پیش ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ عورتوں کے اندر عدم تحفظ کا قوی احساس ہے جو انہیں اس معاشرے میں صدیوں سے کسی آسیب کی طرح چمٹا ہوا ہے۔ عورت کو ایک مکمل اور خود مختیار انسان کی حیثیت حاصل ہے وہ ذاتی قابلیت، ذہانت اور اوصافِ اعلیٰ رکھنے کے باوجود کسی نہ کسی حوالے سے جاہل سے جاہل اور کم علم مرد سے بھی کم تر سمجھی جاتی ہے۔ اور تاحیات باپ، بھائی، شوہر بیٹے یا کسی تیسرے مرد کے رشتے یا نسبت کی محتاج سمجھی جاتی ہے۔ گھریلو زندگیاں اور اُن کی مشکلات الگ ہیں ازدواجی معاملات اور سماجی دباؤ الگ۔ اسی وجہ سے تعویز گنڈوں اور توہم پرستی کا کاروبار چمکتا ہے۔

جادو ٹونے ٹوٹکوں میں نہ صرف برصغیر بلکہ دیگر اقوام میں بھی خواتین ہی زیادہ دلچسپی لیتی ہیں۔

یوں اُن کی زبان اور محاورات میں ان توہمات اور عقائد کا تزکرہ عام ملتا ہے۔مثلاً فال دیکھنا، فال نکالنا، گرہ دینا، گنڈا بڑھانا، چادر چڑھانا، چراغ جلانا، پھیرہ دینا، منت دینا، عمل کروانا، عمل الٹا جانا، تعویز گنڈے چلانا، سبز قدم ہونا، سانپ یا کالی بلی کا راستہ کاٹنا وغیرہ وغیرہ۔ڈاکٹر مبارک علی کہتے ہیں:

"برِصغیر پاک وہندی معاشرے میں عورت عدم تحفظ کا شکار رہتی ہے۔اسی لیے جب بھی وہ گھریلو مسائل کا شکار ہوتی ہے تو اس کے حل کے لیے تعویز وں کا سہارا لیتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سماج کا ڈھانچہ جن روایات واقدام پر ہے ان میں عورت خود کوئی فیصلہ نہیں لے سکتی اور نہ ہی اس کے فیصلے کی کوئی اہمیت ہوتی ہے۔[۲۱]"

ہزاروں دیویوں اور دیوتاؤں کی پرستش میں گرفتار یہ سرزمین زبان وادب کے حوالے سے بھی بے حد زرخیز رہی ہے۔اُردو ہی نہیں دیگر سیکڑوں غیر معروف زبانوں میں بھی نسائی لب ولہجہ اور نسائی زبان و محاورات اسی طرح یا کسی قدر خام حالت میں موجود ہیں۔بہت سی زبانیں ابھی تک بولی کی سطح سے آگے نہ بڑھ سکیں مگر اُن میں عملی سطح پر نسائی لب ولہجہ بہت واضح محسوس کیا جا سکتا ہے۔اُردو میں ہزاروں محاورے انھی رسومات اور اوہام کی دین ہیں جیسے چارپائی اُلٹی ہونا (یا کھاٹ اُلٹانا) تیسرے دن پھول ہونا (رسم قُل) دو بول پڑھوانا تیرہ تیزی کی گھونگھنیاں (نحس دنوں کی خیرات) تیسوں کلام اُٹھانا (قرآن کی قسم) چوتھی کھیلنا (شادی کے چوتھے دن پھل سبزیاں مارنے کی رسم) سات سہاگنوں کا ہاتھ لگوانا، روٹی یا بڑی اُٹھانا (قرآن کی قسم اُٹھانا) اُجلی بلانا (دھوبن کو بلانا، دھوبن ایک چھوٹی سیاہ چڑیا کا نام ہے جو جادو میں استعمال کی جاتی ہے اس لیے اس کا نام (دھوبن) نہیں لیا جاتا) سناؤنی دینا (موت کی خبر)۔۔۔غرض یہ کہ الفاظ کے برتاؤ کا یہ اہتمام اور ان کی تراکیب کے پیچھے ذہنی پس منظر کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

عورت چونکہ کسی ناانصافی یا دباؤ کے خلاف احتجاج کرنے کی ہمت تو چھوڑ اظہار کرنے کی بھی اجازت نہیں رکھتی لہذا وہ چور دروازوں سے اپنی ذات کے تحفظ اور خوشی وتسکین پانے کے لئے عاملوں، صوفیوں اور جادوگروں کے پاس جاتی ہے۔اُسے تو شوہر کی محبت کے لئے بھی تعویز سوجھتے ہیں اور اولادِ نرینہ کے حصول کے لئے بھی۔ساس کی سختیوں اور طعنوں تشنوں کا حل بھی انھی میں نظر آتا ہے اور بچوں کی فرمانبرداری بھی

تعویذوں کے ذریعے ممکن نظر آتی ہے۔ مفلسی، تنگ دستی، رزق، روزگار، حسد، رقابت، مار پٹائی، سوتن یا طوائف کا خوف اور دیگر بہت سی وجوہات اُسے تعویز گنڈوں کی طرف مائل کرتی ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر روتھ بنی ڈکٹ کا شمار دنیا کے چند بڑے ماہرِ انسانیات میں ہوتا ہے۔ ان کی دو مشہور تصانیف نے دنیا بھر میں مقبولیت حاصل کی۔ ان کے اردو تراجم میں سے ایک کا نام "قدیم تہذیب اور جدید انسان" اور دوسری کتاب "نقوشِ ثقافت" ہے۔ وہ کولمبیا یونیوسٹی میں پڑھاتی رہیں اور ۱۹۴۸ء میں وفات پائی۔ انھوں نے اپنی تصنیف "نقوشِ ثقافت" میں دنیا کی مختلف اقوام کی رسومات اور عقائد کی بابت لکھا اور خصوصاً جادو ٹونے کے قدیم رجحانات کا بھی ذکر کیا۔ وہ لکھتی ہیں کہ قدیم جزیرہ ڈوبو کے قبائل میں ہر قسم کے حالات و واقعات کو جادو ٹونے کے مرہونِ منت شمار کیا جاتا تھا، درختوں کے پتوں کا زرد ہو کر جھڑنا بھی جادو سمجھا جاتا اور فصلوں کا اچھا یا برا ہونا بھی جادو کی طاقت کے زیرِ اثر قرار دیا جاتا۔ وہ لکھتی ہیں:

"ڈوبو کے باشندے اپنے خاص مقاصد کے تحت بیماری پیدا کرنے والے منتر آزادی سے استعمال کرتے ہیں۔ چیزوں یا درختوں پر اپنے مالکانہ نشان لگانے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ان کو اپنی اپنی بیماریوں میں ملوث کر دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "یہ ایلوے کا درخت ہے، یہ ناڈا کا درخت ہے" اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ "یہ درخت ایلوے کا ہے جس نے اس پر گلٹیوں کی متعدی بیماری کا جادو کر رکھا ہے،" یا یہ کہ "یہ درخت ناڈا کا ہے جس نے اس پر فالج کا جادو کر رکھا ہے" (۲۲)

اس تمام پس منظر کا ذکر کرنا اس لیے ضروری تھا تا کہ اُردو نسائی زبان و محاورہ کی بقا اور جواز کے لیے زبان پر تہذیبی، مذہبی اور نفسیاتی اثرات کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

اشارتی و علامتی پہلو کے حوالے سے دیکھا جائے تو عورت کی زبان اپنے اندر اس تمام تہذیبی قدامت کو لیے ہوئے ہے جس سے اُس نے تاریخی سفر کیا۔ عورت کو ویسے بھی فطرتاً قدامت پسند کہا جاتا ہے کہ وہ پرانی رسم و روایات کو زندہ رکھتی ہے۔ قدیم رواج پالتی ہے۔ زبان کی حفاظت مرد سے زیادہ کرتی ہے اور اس بات کے امکانات بہت کم رہے ہیں کہ وہ خارجی اثرات اور معاشرتی تبدیلیوں اور رجحانات کو مرد سے پہلے قبول کرے۔ لہٰذا آج ہم اُردو زبان و ادب میں جس نسائی زبان و محاورہ کو دیکھتے ہیں اور اس کے بہت وسیع ذخیرے سے متعارف ہوتے ہیں وہ ان تمام تر بیان کردہ حالات کے تناظر میں ہیں جن کا کچھ ذکر پہلے کیا جا چکا

ہے۔ اُردو زبان پر تہذیبی اثرات اور عورت کی فطرت دونوں نے اِس لسانی ورثے کو مضبوط بنیادیں فراہم کی ہیں۔

جب ہم زبان کی بات کرتے ہیں اس کی مختلف صورتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ کوئی بھی زبان ایک مکمل زبان کا روپ رنگ اختیار کرنے سے قبل برسوں تک ایک "بولی" کی حیثیت سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ تب کہیں ارتقا کی منازل طے کرتے کرتے کسی رسم الخط کے لبادے میں تحریر کے مقام تک پہنچتی ہے۔ تحاریر کی بھی مختلف اقسام ہوتی ہیں ادبی اور غیر ادبی تحاریر کی ایک الگ فہرست ہے۔

غیر ادبی زبان کی اپنی ضروریات اور تقاضے ہوتے ہیں۔ مخصوص قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ اسی طرح ادبی زبان کے بھی اپنے خاص معیارات ہوتے ہیں۔ روزمرہ اور محاورہ ہماری اُردو زبان کا ایک خاص حسن ہیں اور اہل زبان نے اِن کو جس طرح استعمال کیا وہی معیارِ اُردو کہلایا۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ " اردو زبان اور لسانیات " میں لکھتے ہیں:

> " علما نے محاورے کی تعریف یہ کی ہے کہ محاورہ کم سے کم دو کلموں سے مرکب ہوتا ہے۔ برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے اس بات پر صحیح زور دیا ہے کہ اکثر محاوروں کی بنیاد استعارے پر نہیں، بلکہ تمثیل پر ہوتی ہے۔ مثلاً تین پانچ کرنا، اپنے اڑھائی چاول بگھارنا، ہتھے چڑھنا، اس کی باتیں مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں، دل آنا وغیرہ البتہ کیفی کے اس دعوے کی تصدیق ممکن نہیں کہ اردو زبان میں محاوروں کا ذخیرہ شاید تمام زبانوں سے زیادہ ہے۔"(۲۳)

نظم ونثر کے میدان کے شہ سواروں نے اپنے اپنے انداز سے اُردو کے گل دستے میں نت نئے رنگوں کا اضافہ کیا اور اِسے مثال بنا دیا۔ اُردو زبان و ادب کے ان چاہنے والوں نے اُردو کے دامن کی وسعت کو کبھی تنگ نہ ہونے دیا بلکہ ہر اہل زبان وعلم نے اس کے حسن و وقار میں اضافہ کیا اور ابتدائی اُردو زبان کے عہد سے لے کر آج تک اس کے پھلنے پھولنے کا بہترین اہتمام جاری ہے۔ نثر کے میدان میں اُردو کو میر امن دہلوی سے لے کر رجب علی بیگ سرورؔ اور محمد حسین آزادؔ سے لے کر ڈپٹی نذیر، عبدالحلیم شررؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، مولانا ابوالکلام آزادؔ و ہادی رسوآ جیسے منفرد اسلوب و انداز کے مصنفین آئے وہاں دلی دکنیؔ سے میرؔ

وسوداؔ تک اور ابراہیم ذوقؔ سے غالبؔ و مومنؔ تک نابغہ ءروزگار شعراءنے اس کے کینوس میں متنوع جہات میں رنگ آمیزی کی۔

عورت نے ہمیشہ زبان کی اختراع و نگہداشت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس کا تعلق آسٹریلیا سے ہو یا چین سے، برصغیر کی رہنے والی ہو یا یورپ کی آزاد فضاؤں کی باسی اُس کی زبان کے متعلق ماہرین کی ایک ہی رائے ہے کہ ہمیشہ عورت کی نسبت سے مادری زبان کی اہمیت و افادیت مسلمہ رہی ہے۔ کبھی پدری زبان کے لیے کوئی سوال نہیں اٹھتا کیونکہ عورت نے بحیثیت ماں انسانی ذہن کی صاف سلیٹ پر زبان کی مدد سے پختہ نقوش اور تصورات کندہ کیے ہیں وہ زبان کی محافظ بھی ہے اور اِس میں اوّلین جدت و تغیر کی امین بھی کہلاتی ہے۔

عورت کا ذخیرہ الفاظ بھی مرد کی نسبت زیادہ ہوتا ہے۔ ہر قوم کی زبان کی کہانی اُس کی اصطلاحات کا مطالعہ اُس کے مرکبات، استعارات و تشبیہات اور اُس میں محاورات کثرت عورت سے ہی وابستہ ہیں۔ خصوصاً خانگی زندگی کی بابت جس قدر محاورات عورتوں کی زبان میں جمع ہو چکے ہیں مرد کی زبان اس کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتی۔ علامہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> "خود برِصغیر پاک وہند کے اندر تعلیم یافتہ و مہذب طبقوں میں دیکھئے کہ خانگی زندگی کے متعلق جس قدر بڑا ذخیرہ الفاظ عورت کے پاس ہے مرد کے پاس نہیں۔ محاورات، ضرب الامثال، لطیفے، قصص و حکایات وغیرہ یہ سب عورتوں ہی کے دماغ میں محفوظ ہیں۔ لکھنؤ اور دلی میں جہاں کی زبان کبھی زمانہ میں مشہور تھی صرف عورتوں ہی کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی اور آج بھی اگر کوئی شخص ان مقامات کی اصلی و صحیح زبان سیکھنا چاہتا ہے تو صرف عورت ہی سے سیکھ سکتا ہے۔ بڑی جماعت مردوں کی ایسی ہے جو ان محاورات والفاظ سے واقف نہیں ہے۔ اس لیے ظاہر ہے ان محاورات و الفاظ کو عورت نے ہی اختراع کیا"۔ [۲۴]

عورت کی فطرت اس قسم کی ہے کہ اسے قدیم داستانیں، پہیلیاں، گیت، دعائیں، حکایتیں بڑی جزیات کے ساتھ یاد رہتی ہیں اور وہ اپنی ذاتی زندگی اور مشاہدے کی بدولت زبان کی تمام تر چاشنی کے ساتھ بہت پرانے واقعات اور یادداشتوں کو نہ صرف محفوظ رکھنے بلکہ اگلی نسل تک منتقل کرنے کی ذمہ داری خود بخود

بخوشی ازل سے اپنے ناتواں کندھوں پہ اٹھائے چلی آ رہی ہیں اور اِس میں اپنی جانب سے اختراع و اضافے کی جدت سے اضافہ بھی کرتی چلی آ رہی ہیں۔ زبان کا حسن استعاراتی و اشاراتی رمز و ایما سے ہے۔ عورت اپنے مزاج کے رنگ اپنے محسوسات کی جہات اور اپنی مخصوص نسائی فکر کے ساتھ اپنی طبقاتی حیثیت کو مد نظر رکھتے ہوئے جو کہنا دشوار بھی ہو وہ اشارہ و علامت کی زبان مین کہنے کا سلیقہ رکھتی ہے۔ وہ کمزور ہو کر بھی اظہار کے معاملے میں ایک خاص مہارت اور قدرت رکھتی ہے۔ وہ مرد کی طرح بعض معاملات میں کھلے لفظوں میں اظہار نہیں کر سکتی اور معاشرہ بھی اس سے اس کی توقع نہیں رکھتا اس لیے اس کو علامت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس کا یہ طرزِ فکر زبان کو استعاراتی حسن عطا کرتا ہے۔ اردو زبان ایسے ہزاروں الفاظ و محاورات کے ذخیرے کے لیے نسائی لہجے کی محتاج رہی ہے۔ جس نے زبان کو نسائی رنگ اور چاشنی بخشی۔

و) رمز و ایما کی نسائی نوعیتیں اور معاشرتی و عائلی تناظرات:

متنوع جہات میں یادگار رنگ آمیزی اور نسائی زبان و محاورہ کے اصل پس منظر کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ برصغیر کی تاریخ اور تہذیبی سفر کا ایک طائرانہ جائزہ لیا جائے جس میں ہم نے نسائی وجود کے اُس پیکر اور اُس طرزِ فکر کو جاننے اور سمجھنے کی سعی کی جس نے اُردو ادب کو ایک نسائی ذائقے سے روشناس کروایا۔ وہ زبان و محاورات جو اُردو کی نثر و نظم کا اثاثہ بنے اور آج تک نہ صرف لکھے اور سمجھے بلکہ بولے جاتے ہیں وہ کن اہلِ زبان نے کس کس طرح کے ماحول اور حالات میں تخلیق کیے۔

نہ صرف برصغیر کا ماحول بلکہ دنیا بھر کی اقوام کا تہذیبی و تاریخی پس منظر عورت کی تاریخ اور وجود کے حوالے سے تقریباً ایک جیسا ہی رہا ہے۔ اگر برصغیر کے حالات کو ہم پس ماندہ اور گھٹن زدہ قرار دے بھی دیں تو ہمیں یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ اُس عہد میں جو اُردو زبان کا کلاسیک عہد کہلاتا ہے اُس میں دیگر اقوام و ممالک کے ہاں عورت کی سماجی و ذاتی زندگی کن مراحل میں گذر رہی تھی۔ شاید یہ جان کر بہت حیرت ہو کہ دنیا کی دیگر اقوام کی عورتیں کئی حوالوں سے برصغیر کی عورتوں سے بھی زیادہ پسماندہ تھیں۔

ڈاکٹر خالد سہیل اپنی تصنیف "مغربی عورت ادب اور زندگی" میں ہمیں نسائی زندگی کے مختلف ادوار میں دنیا کی مختلف تہذیبوں میں معروف خواتین کی تحاریر سے مختلف اقتباسات کے ذریعے بتاتے ہیں کہ عورت کی سماجی اور ازدواجی زندگی کیسی رہی۔ باربرا بوڈیچن کے مطابق انگلستان مین انیسویں صدی تک عورتوں کی کمائی قانونی طور پر خاوند کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ سیماں دی بوا ہمیں بتاتی ہیں کہ ۱۹۲۴ء تک

فرانسیسی قانون کے مطابق بیوی پر خاوند کی تابعداری،اطاعت اور غلامی فرض تھی اور عورتوں کو مساوی انسان کے حقوق تک میسر نہ تھے کہ انہیں کم از کم مرد کی طرح حقِ رائے دہی، ملازمت، کاروبار، کسی فیصلے وغیرہ کا اختیار سونپا جاتا۔ جرمین گریر کا کہنا ہے کہ اگر عورتوں کو آزادی سے سوچنے سمجھنے کا اختیار ہرتا تو وہ حیض کو کبھی قبول ہی نہ کرتیں کیونکہ مسلمان، ہندو اور دیگر کئی مذاہب میں عورتوں کو ماہواری کے دوران نا پاک سمجھا جاتا ہے اور انھیں کئی قبائل میں تو گھر سے باہر نکال دیا جاتا تھا۔ عورتوں کو تو مساوی حقوق آسٹریلیا نے ۱۹۱۰میں دیئے نیوزی لینڈ نے ۱۸۲۹ میں اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ سوپر پاور ملک میں عورتوں کو مساوی حقوق ۱۹۶۰ میں ملے۔ بیوی کو ملازم سے بھی کم درجے کے حقوق میسر تھے ملازم کو کم از کم اُجرت تو مل جاتی تھی۔

"فرانس میں ۱۸۹۰ء کی شماریات کے مطابق عورتوں کو مردوں کی نسبت آدھی تنخواہ دی جاتی تھی۔ امریکہ میں ۱۹۱۸میں بھی عورتوں کو مردوں کی نسبت آدھی تنخواہ ملتی تھی انہی دنوں جرمنی میں عورتوں کو مردوں کی تنخواہ کا صرف ۵۲ فیصد ملتا تھا۔"(۲۵)

کسی بھی شخص کی زبان اُس کے ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔ گلی بازار کی زبان دربار و محلات کی زبان سے مختلف اور قابلِ شناخت ہو گی۔ ملازم یا غلام کی زبان اعلیٰ اساتذہ سے تربیت یافتہ بادشاہ، شہزادے ملکہ و شہزادیوں اور دیگر شاہی خاندان کے افراد جیسی یقیناً نہیں ہوسکتی۔ فوجی اپنے معمولات زندگی اور تاجرو دکاندار اپنے معاملاتِ حیات کی اصطلاحات استعمال کریں گے۔

اچھی شہری آبادی، تہذیب یافتہ طبقات سے تعلق رکھنے والے معززین علاقہ چوہڑوں چماڑوں اور دیگر پنچ ذات والوں کی طرح بات نہیں کرتے۔ اور برصغیر میں طبقائی تفریق تو کسی بھی دور میں کم نہیں ہو سکی۔ ایسے ماحول میں جب اُردو زبان نے نظم و نثر کے میدان میں اپنے جوہر دکھانا شروع کیے تو نسائی زبان جو بیگمات کے محلوں، ماماؤں ملازماؤں کی گفتار و تکرار نوجوانوں کے گھرانوں اور نجی محافل و کاروبارِ حیات کی جھلک تحریری صورت میں دکھانا شروع کی تو پھر چاہے وہ طوائفوں کے بالاخانوں کی سرگوشیاں تھیں یا نجی تعلقات کی نوعیتیں محبت و نفرت کے جذبات تھے یا حسد، جلن، رقابت، چغلی، جھوٹ فساد کے تابکاری اثرات بچوں کی ڈانٹ پھٹکار سے کنیزوں غلاموں کی تکرار تک، شرم و حیا کے اشاراتی اظہار یا سماجی پہرے داریوں کا

دباؤ، رشتوں کی نزاکتیں اور نسائی فطرت کی لطافتیں سب کے سب رنگ اِس نسائی زبان و محاورہ میں سمٹ آئے۔

سماجی گھٹن اور دباؤ کے ساتھ ساتھ ۱۸۵۷ اوراس کے بعد کے سیاسی منظر نامے نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا اور زبان و ادب میں تاریخی تبدلیاں رونما ہوئیں جنھوں نے آنے والے زمانوں کے لیے زبانِ اُردو کی راہیں اور جہات مقرر کیں۔

نسائی زبان و محاورہ کی الگ پہچان اور شناخت اس لئے بھی ضروری ہوگئی کہ اس نے اُردو زبان میں غیر معمولی لطافتوں کے اضافے کیے اور زبان کو ایک نئی چاشنی عطا کی جو صدیوں کے تہذیبی اور نفسیاتی سفر کی گواہ بن کر ہمیشہ کے لیے اپنی داستان رقم کرتی چلی گئی۔ یہاں آکر اگر ہم اُن تاریخ ساز شعری و نثری ادب کے محسنوں کے نام نہ لیں تو یہ ذکر مکمل ہو ہی نہیں سکتا جنھوں نے اس اثاثے کو اپنی ادبی کاوشوں کا حصہ بنایا اور داستان نگاری کے فن کے ذریعے انھیں نہ صرف محفوظ کیا بلکہ آنے والے ادب کے لیے رہنما اُصول اور معیارات مرتب کیے۔ نذیر احمد اس حوالے سے خصوصی تحسین وستائش کے مستحق ہیں جنھوں نے خواتین کی گھریلو نجی زندگی کے مسائل اور معمولات کو موضوع بنا کر اُن کی زبان اور اندازِ گفتگو اندازِ تکلم کو اُردو زبان کے نثری ادب میں متعارف کروایا۔ ان کو سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہمیں اُس تہذیبی پس منظر سے شناسائی رکھنا ضروری ہے۔

ہر زبان میں ایسے الفاظ و مرکبات اور اصطلاحیں موجود ہیں جنھیں صرف خواتین ہی استعمال کرتی ہیں مرد اُن کو نہیں بولتے نہ تحریر میں لاتے ہیں اِس کی بڑی وجہ پدر سری نظام ہے۔ جہاں عورت کو کُھل کے اپنی بات کرنے اور اپنی پسند یا ناپسند کی بابت اظہار کرنے کی اجازت نہیں رہی۔ اُردو زبان کے ساتھ بھی برصغیر کی معاشرت میں عورت کو مساوی حقوق حاصل نہ تھے۔ اور دنیا کی دیگر خواتین کی طرح ان کے معمولات بھی مردوں سے الگ تھے۔ گھر، برادری، قبیلہ، خاندان، رسوم و رواج معاشی بدحالی، مذہب کے قدیم اور پختہ تصورات کی اندھی تقلید، زمہ داریوں کا بوجھ اور بے توقیر ہونے کا احساس، بے یقینی کی کیفیت ان میں سے اکثریت کا مقدر رہی ہے چاہے وہ ہندو خاندان سے تعلق رکھتی تھیں یا مسلمان خاندان سے۔ مذہب اور قانون سے زیادہ مضبوط تہذیب و ثقافت کا صدیوں سے بنا ہوا مضبوط جال اُنھیں ہر طرف سے گھیرے تھا۔ ایسے میں اشارتی وعلامتی انداز گفتگو نسائی زبان کا جزوِلاینفک بنتا چلا گیا۔

اشارہ اور علامت نہ صرف ایک طرزِ اظہار ہے بلکہ زبان کا حسن اور ارتقا بھی کہلاتا ہے جو لطف اشارتی و علامتی گفتگو میں ہے وہ سیدھے کھلے لفظوں میں اظہار کرنے میں کہاں مگر اس کو سمجھنے والے کی ذہنی سطح اور صلاحیت کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ یہ خوبی عورتوں ہی کے کلام وزبان میں اس قدر زیادہ، عام اور خصوصی اہتمام سے پائی جاتی ہے۔ خصوصاً نثری تحریر یا زبانی بات چیت میں مرد بلاواسطہ مطلب کی بات کہنے کے عادی ہوتے ہیں اور خواتین بلواسطہ، گھما پھرا کر، اشاروں کنایوں میں بات کرنا پسند کرتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ مذہب، پردہ کا نظام، محدود ماحول، گھریلو زنان خانوں، مردان خانوں کا الگ الگ نظام اور گھر کے مردوں کے ساتھ بھی صرف ضروری بات کرنے کا رجحان بھی رہا ہے۔ پھر فطرتاً عورت میں شرم وحیا زیادہ پایا جاتا ہے وہ بہت سے حوالوں سے اس قدر محتاط ہوتی ہیں کہ رشتوں کے نام جسمانی اعضاء کے نام، جزباتی کیفیات کے اظہار وغیرہ میں اشارہ و علامت سے کام لیتی ہیں مثلاً شوہر کا نام نہ لینا اور اُسے کسی بچے کی نسبت سے پکارنا۔ پنجاب میں آج بھی کئی خواتین اپنے شوہر کے لیے مختلف رشتوں کے توسط سے اصلنام لیے بغیر پکارتی ہیں مثلاً اگر وہ خالہ زاد ہو تو 'مسیرا' چچازاد ہو تو 'دادے کا پوتا' ماموں زاد ہو تو اُسے 'ملیرا' یا ایسا رشتہ نہ ہو تو اُسے 'میری ساس کا بیٹا' یا منی منے کا ابا کہہ کر اُس کا ذکر کرتی ہیں

برِصغیر پاک وہند میں اسلام آنے کے بعد اسلامی قانون اور حقوق کا ایک نیا زاویہ سامنے آیا۔ پردہ کی پابندی، سماجی حیثیت میں تبدیلی، عزت و وقار کا تصور، وراثت میں حصہ، حق مہر، اور خصوصاً تعلیم حاصل کرنے کی اجازت وغیرہ بہت سے تصورات تبدیل ہونے لگے مگر رسم ورواج کی حد تک اگر دیکھا جائے تو بہت کم تبدیلیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ مسلمان گھرانوں میں بھی شادی بیاہ سے لے کر موت، پیدائش، منگنی، کامیابی و ناکامی کے مواقع باہم تعلق داری کے طور طریقوں، رہن سہن، لباس اور تہواروں کی صورت حال میں زیادہ تبدیلی رونما نہ ہو سکی۔

بہت سی ہندووانہ رسوم کو کسی نہ کسی طرح تھوڑے بہت فرق کے ساتھ آج بھی ادا کیا جاتا ہے۔ اور اردو زبان کا بڑا ذخیرہ ان رسومات اور توہمات کے وجود کی گواہی کے طور پر اردو ادب کا حصہ بن چکا ہے۔

اس نسائی زبان و محاورہ کے ذریعے محض شادی کی رسومات کے حوالے سے ہی سیکڑوں محاورات با آسانی ڈھونڈے جاسکتے ہیں۔

ہاتھ پیلے کرنا، ڈولی اٹھانا، کنیا دان کرنا، بیاہ رچانا، نکاح پڑھوانا، دو بول پڑھوانا، پیا دیس سدھارنا، چادر ڈالنا، تن بخشائی کروانا، (پنجاب میں) مینڈھیاں کھلوانا، اُبٹنا، حنا بندی کرنا، کھارے چڑھنا، گھڑولی بھرنا، مانجھے

بٹھانا، گڑ بٹنا، ور تن بھانجی دینا(شادی کا تحفہ) مہندی رچانا، مہندی چڑھانا، ڈولا اُٹھانا، گڑیا سجانا(بیٹی بیاہنا) وغیرہ یاد آجاتے ہیں۔

اسی طرح فوتگی کے موقع پر ان گنت الفاظ و محاوارت نسائی طرزِ فکر اور طرزِ حیات و معمولات کی نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔ تعلیم کی کمی یاماحول تعلیم کے لیے اجازت نہ ملنے کے باعث برصغیر کی خواتین نے اردو زبان کی تادیر حفاظت اور ملاوٹ سے بچائے رکھنے کی خدمات کے ساتھ ساتھ محدود معاشرتی روابط کے باعث اندرونِ خانہ رہ کر بھی نئے الفاظ و محاورات سے اُردو کا دامن وسیع بھی کیا ہے۔ سیکڑوں الفاظ ایسے نئے ایجاد ہوئے۔ محاوروں سے نئے اسم بنائے گئے اور لاتعداد ایسے الفاظ تخلیق ہوئے جس کا ہم معنی لفظ تک اُردو میں کوئی دوسرا نہیں دستیاب ہوتا۔ اور اگر کوئی قریب قریب معنی والا لفظ دستیاب ہو بھی جائے تو وہ اس کا مکمل مفہوم ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے جو عورتوں نے ایجاد کیا۔

یوں گھریلو بول چال اور اُمور خانہ داری کے فرائض اور مشاغل کے ساتھ ساتھ کئی نئے الفاظ بھی اردو زبان میں داخل ہوئے جیسے للو پتو کرنا یعنی خوشامد کرنا۔

اُٹنگا:۔ وہ کپڑا یالباس جو لمبائی میں کم ہو۔

انوٹھی:۔ وہ پلیٹ جس میں ابھی کسی نے کھانا نہ کھایا ہو مگر اس میں کھانا اَن چھوا موجود ہو۔

جڑاول:۔ سردیوں کے مخصوص کپڑے یالحاف، رضائی وغیرہ۔

بھوتیاں:۔ راستوں سے واقفیت رکھنے والی عورتیں جو شہر کی گلی کوچوں میں اکثر پھرتی رہی ہوں اور تمام راستوں سے واقف ہوں۔

اسی سے ایک لفظ اور نکلتا ہے "بھُونا" یعنی جو "گھومنا پھرنا" کے مترادف یا بے مقصد گھومنے پھرنے کے معنوں میں آج بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اب اس کا استعمال اردو بولنے والوں کے ہاں تو نظر نہیں آتا مگر آج بھی سنتے ہیں کہ

کدھر بھونے او، ؟ (کدھر گھوم رہے ہو)

چونکہ اُس عہد میں جب اردو زبان کو خالص ماحول اور موافق حالات میسر تھے اور بیرونی دنیا سے خواتین کا رابطہ بہت خال خال تھا تو خواتین کی گھریلو زندگی میں اُمور خانہ داری اس کی شناخت کے ساتھ ساتھ سلیقے اور اہمیت کا معیار بھی سمجھے جاتے تھے۔

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی ہر تہذیب میں مختلف گھریلو اور ضروریاتِ زندگی کے استعمال کی اشیاء کی موجد عورت رہی ہے۔ اُس نے لباس کی سلائی اور بناوٹ سے لے کر برتن بنانا، کھانا محفوظ کرنا، صفائی ستھرائی، کھانوں کی تیاری، زیورات، گھاس پھوس سے غاروں اور جھونپڑیوں کی زمین کو نرم بستر میں تبدیل کرنے۔ شکار اور اناج کو قابل ہضم بنانے کے لیے کاٹنے، کوٹنے پکانے، پیش کرنے کے لیے مختلف طریقے اور وسائل استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کے سفر میں مرد کے ساتھ ساتھ زراعت کے اوزار و آلات بنانے اور پھلوں سبزیوں کی کاشت سے لے کے اُن کو محفوظ کر کے قابل استعمال بنانے تک، ہر زمہ داری کو بطریقِ احسن نبھایا اور آج بھی نبھاتی چلی جا رہی ہیں۔

ایسے کئی قبائل کا سراغ ملتا ہے جہاں مردہ انسانوں کے ساتھ اُس کی استعمال اور ضروریات کی اشیاء بھی دفن کر دی جاتی تھیں۔ مرد اپنے شکار کے آلات سمیت دفنائے جاتے اور خواتین اناج، برتنوں، سوئی سلائی کے لیے آنتوں سے بنے دھاگوں اور کانٹوں کے علاوہ زیورات سمیت دفن کی جاتی تھیں۔

ان چیزوں کی ایجاد کے ساتھ ساتھ ان کے نام بھی عورتوں نے ہی رکھے تھے۔

وحیدہ نسیم "عورت اور اردو زبان" میں لکھتی ہیں۔

> "اگر وحشی قبائل میں یہ رسم عام نہ ہوتی تو ہم آج ہم دعویٰ نہیں کر سکتے تھے کہ بچوں کی پیدائش کے بعد دوسرا فریضہ جو عورتوں کے سپرد تھا، سلائی، پکوان اور گھر کی نگہداشت تھا۔ دریائے ڈنیوب کے کنارے کنارے کھدائی کرنے کے بعد جہاں مردوں کی قبروں سے بھدے بھدے نیزے موٹے موٹے بھالے بدنما تیر کمان اور دوسرے اوزار ہتھیار ملے ہیں وہاں عورتوں کی قبروں میں ان کے ڈھانچوں کے ساتھ ساتھ اوکھلی، پتھر کے برتن، جنگلی کانٹوں کی بنی ہوئی سوئیاں، جانوروں کی آنتوں کے دھاگے، کوڑیوں کے زیور، سیپیوں کے ہار اور کھالوں کے بنے ہوئے لباس دفن ملیں گے جو اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ اس دور میں عورت کی ذمہ داریاں کیا تھیں۔(۲۶)

عام معمولات حیات کے روز مرہ کے افعال کے علاوہ خاص دنوں اور خاص مواقع جیسے شادی بیاہ اور پیدائش، موت، علاقائی روایتی رسوم ورواج۔ جنگ اور امن کے دنوں میں بھی خواتین کی ہر جگہ شمولیت رہی

ہے اور ان افعال کے حوالے سے الفاظ و محاورات کی تخلیق اور اضافہ کا سبب بھی رہی ہیں۔ امریکہ کے وحشی اقوام میں جب کوئی مر جاتا ہے تو اعزاء احباب جمع ہوتے ہیں اور سخت ماتم کیا جاتا ہے۔ یہ نوحہ وماتم کرنا زیادہ تر عورتوں کا ہی کام ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات انتہائی الم کے اظہار میں پتھر کے نوک دار ٹکڑوں سے اپنے جسم کو جابجا زخمی کرتیں اور پھر اس کے بعد مرنے والے کے اعزاء کے پاس رہ کر دس دن تک عورتوں کو مختلف مراسم ادا کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً بہت سویرے بیدار ہو کر دن بھر سخت محنت کرنا، بہت کم غذا کھانا، جلد سونا تفریح کے مشاغل سے احتراز کرنا، آرائش ترک کر دینا، دس دن تک مسلسل کسی پہاڑی کی چوٹی پہ جا کر ماتم کرنا، قبروں کے پاس جا کر آگ روشن کرنے کا رواج بہت قدیم ہے۔ اور یہ خدمت بھی عورت ہی کے سپرد ہوتی تھی۔ جو رات بھر صحرا میں تنہا بیٹھی ہوئی آگ کو روشن رکھتی تھی۔ علامہ نیاز فتح پوری لکھتے ہیں:

> "کیلیفورنیا کی اقوام میں جب کوئی بچہ مرتا ہے تو ماں ایک سال تک روزانہ اس جگہ جاتی جہاں بچہ کھیلا کرتا تھا۔ یا جہاں اس کا جسم جلایا گیا ہے اور وہاں اپنا دودھ نکال نکال کر چاروں طرف چھڑکتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ چیخ چیخ کر ماتم کرتی ہے۔ اپنے بچے کی واپسی کی درخواست کرتی ہے۔ کبھی کبھی غم آلودہ گانا گاتی ہے اور نہایت وحشیانہ رقص بھی کرتی ہے۔"(۲۷)

انھی حالات اور معمولات کی تاریخ میں پلتی اور اور ارتقا کی منازل طے کرنے والی نسلِ انسانی کی بہترین معاون و مددگار اور زندگی کو سہل کرنے کے ساتھ ساتھ شیریں الفاظ اور بنیادی ضروریات کی ایجادات و استعمال کی ذمہ داری اٹھانے والی عورت نے اردو زبان کی متاع غرور میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔

برصغیر کی عورت نے بھی غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اردو زبان کو ہزاروں الفاظ و محاورات کا خزانہ بخشا جو اُردو کا قیمتی سرمایہ ہے۔

محض اُمور خانہ داری کے حوالے سے ہی دیکھا جائے تو عورت نے اسی محدود اور نظر انداز شدہ شعبے مین ان گنت نئے الفاظ ایجاد کیے یا پہلے سے موجود الفاظ و محاورات کو نئی جہات عطا کیں اور ان الفاظ کا سرمایہ آج اُردو کی نثر و نظم اور روزمرہ ضرورت کی بنا میں شامل ہے۔ اور نہ صرف نسائی زبان کے یہ الفاظ خواتین کی زبان بلکہ مردوں کی زبان میں بھی رائج ہو چکے ہیں جیسے سینکنا، بھوننا، بگھارنا، کڑکڑانا، دم دینا، تروپا بھرنا، بھوگنا، کترنا، پلیتھن لگانا، روٹی بیلنا، روٹی ریندھنا، صافی وغیرہ۔

اسی مد میں نسائی زبان نے بہت خوب صورت اصطلاحات اور تراکیب کے ساتھ اردو کو ضرب الامثال، فقرات اور محاورات دیئے جیسے آٹا آٹا ہونا، آٹے کا چراغ، آٹے کی آپا، آٹے میں نمک، آٹا گیلا ہو جانا، آٹے کا پلیتھن، آٹے کو مکی دینا، آٹا لوچ دینا، آٹے کی مڑوڑی، اور غریبی میں آٹا گیلا ہونا، دھنیے کی کھوپڑی میں پانی پلانا (نہایت مشکل کام)

بطور مثل "آٹے کا چراغ باہر رکھوں تو کوا لے جائے اندر رکھوں تو چوہا کھائے" جیسی ضرب الامثال کا اضافہ کیا ہے۔ اسی طرح روٹی پکانے کے حوالے سے بہت سے الفاظ و محاورات عورت کی تخلیق ہیں جیسے، جلتے توے پر بیٹھنا، ٹیڑھے توے کی روٹی، ایک توے کی روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی، سات تووں کی کالک ملنا، توے کی بوند ہونا، توے کا ہنسنا اور توا سر پر باندھنا کے علاوہ دال گلنا، اُبالا سبالا، دال پتلی ہونا، ایک چنا دو دال، آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونا، چھاتی پہ مونگ دلنا اور منہ میں گھنگھنیاں بھرنا جیسے مزے دار محاورے اردو زبان میں شامل ہیں جو خواتین کی خانہ داری کی زندگی اور معمولات سے تعلق رکھتے ہیں۔

پکوان اور خانہ داری کے اُمور سے تعلق رکھنے والے سیکڑوں محاورات نسائی زبان و محاورہ کی دین ہیں۔ اپنے مزاج کی لطافیوں، شیرینیوں اور لچک کے احساس سے گندھی خواتین نے اپنے معاشرتی و عائلی زندگیوں میں زبان و بیان کے اضافے میں بہت کلیدی کردار ادا کیے۔ اُن کے ہاں حساب کتاب، اعداو شمار کے پیمانے بھی مردوں کی عام زبان سے تھوڑا الگ ترتیب پانے لگے اور نہ صرف ذخیرہ الفاظ میں وسعت پیدا ہوئی بلکہ محسوسات کے جہان کی نئی جہات بھی نسائی اظہار کے ساتھ فروغ پانے لگیں۔

قدرت نے عورت کو انسان کی تخلیق کا منصب سونپا تو اس منصب کی احسن ادائیگی کے لیے اُسے وہ نرمی اور گداز بھی بخشا جو بچے کی تربیت کے لیے ضروری تھا۔ زبان اسی لیے "مادری" کہلاتی ہے کہ ہر بچہ ماں سے ہی زبان کی ابتدائی تعلیم حاصل کرتا ہے اور اس راہ کی دشواریوں کو پیار محبت سے دور کرنے والی اُس کے سیکڑوں سوالات کے قابلِ فہم جوابات دینے والی۔ اُس سے اُسی کے انداز میں تُتلا کر بات کرنے والی اور مشکل الفاظ کی صورت کو آسان بنا کر سکھانے والی ایک عورت ہی ہوتی ہے۔

اُردو زبان و ادب میں ایسے بھی کئی الفاظ موجود ہیں جو اسی مادرانہ شفقت کی نشاندہی کرتے ہیں اور اُردو نثر و نظم کی روایات میں بھی جگہ حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی تخلیق کے پیچھے یہی پس منظر رہا۔ پانی کے لیے "مَم" روٹی کے لیے "اَن" یا "لوٹی" نیند کے لیے "نینی یا نینو" پیشاب کروانے کے وقت بچوں کو سکارنے کی آواز جیسے سُو سُو یا چھی چھی لفظ گندا کو بھی "چھی چھی" بلی کو "ماؤں" انجانی چیز یا ڈراؤنی چیز سے ڈرانے کے لیے بھاؤ یا

بھوں بھُوں جھُن جھُن کی آواز والے کھلونے کو "جھنجھنا" اور "انا" دد ا، کے الفاظ بھی اسی سلسلے میں تخلیق ہوئے اور بہت سارے اسماء کی تصغیر بھی محض بچوں کو زبان آسان کر کے سکھانے کے لیے ایجاد ہوئی۔

معاشرتی و عائلی زندگی کے حوالے سے جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ عورت کی زبان پر مخصوص تہذیب و تمدن کے اثرات پڑے وہاں دنیا کی تمام تہذیبوں میں یہ تاریخی حوالے بھی موجود ہیں کہ عورت کے وضع کردہ الفاظ و تراکیب نے دنیا کی مختلف زبانوں اور طرزِ معاشرت پر اپنے اثرات بھی مرتب کیے جو آہستہ آہستہ اُس میں رچ بس گئے اور وہاں کے ادب کا حصہ بنتے چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ عورت کی آغوش اور قرب نے دنیا میں تمام تہذیبوں کو محبت سے پالا اور ہر تہذیب اُس قوم کی عورتوں کے زیرِ اثر پروان چڑھی۔ تہذیب کسی بھی قوم کی ہو سکتی ہے اور تمدن شہری ترقی یافتہ اقوام کا ہوتا ہے۔ یا تمدن کے لیے شہر کا تصور ضروری ہے۔

مشرقی تمدن مغربی تمدن سے جُدا ہو گا اور تمدنی زندگی کے تمام شعبہ جات جن میں زبان بھی شامل ہے اُن میں تبدیلیاں بہت تیزی سے آتی ہیں۔ اہل عرب اسی لیے اپنے بچوں کو دیہاتوں میں ابتدائی چند سال کے لیے بھیج دیتے تھے تا کہ وہ زبان کی اصل اور خالص پن سے روشناس ہو سکیں برصغیر کی وہ تمدنی آبادی بالخصوص دہلی، لکھنؤ، دکن اور پنجاب وغیرہ جہاں اُردو زبان کو اپنے ارتقا اور اوجِ کمال نصیب ہوا اور جہاں سے اُردو دوسرے علاقوں تک مثالی حیثیت سے پہنچی وہاں کے عورت نے زبان کی حفاظت و ترویج کے لیے جہاں نمایاں کردار ادا کیا ساتھ ہی اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس روجِ کمال کے دوران دیہی مسلمان عورت ہندوانہ توہمات اور رسوم سے متاثر ہونے سے محفوظ بھی نہ رہ سکی اور نہ زبان کو اس سے محفوظ رکھ سکی اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پیشتر کی زبان اور ۱۸۵۷ء تا ۱۹۴۷ء تک کے حالات کے پس منظر میں معاشرتی و سیاسی بحران کے ساتھ ساتھ تمدنی و عائلی تبدیلیوں سے بھی خود کو محفوظ نہ رکھا جا سکا۔

مگر وہ خالص تہذیب جو دہلی، دکن اور لکھنؤ کے بڑے تہذیبی مراکز کی پروردہ تھی وہ زبان کو بہت کچھ سونپ کر زوال پزیر ہوئی اور اردو زبان ان تہذیبوں کے اثرات وآثار کو اپنے دامن میں جذب کرتی چلی گئی۔

جب ہم نسائی زبان کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد لا محالہ وہ تمام تر معمولات، مشاغل اور حالات ہیں جن سے اُس خاص عہد کی عورت گزر رہی تھی۔ اُس دوران تہذیب و تمدن کے سارے رنگ اور افکار و محسوسات کے سارے جہاں جن میں زندگی گزارتے ہوئے ایک عورت نے کسی نہ کسی انداز سے اظہار کیا یا جو

جو کچھ محسوس کیا جیسے حالات وواقعات درپیش رہے اُس کا بنا کسی پیشگی منصوبہ بندی سے اپنے بساط بھر طریقے سے رقم کرتی چلی گئی۔

تعلیم کے دروازے اس پر بند تھے اور معاشرے ہزار سالہ ہندوانہ روایات کی پروردہ تھی۔ اسلام قبول کرنے والوں نے اپنی قدیم روایات کو کسی نہ کسی نام سے یا کسی نہ کسی انداز سے زندہ رکھا کہ یہ اُن کے اجتماعی شعور کا تقاضا بھی تھا۔ رسومات کے نام بدل گئے مگر اُن کے پیچھے آج بھی کہیں نہ کہیں دُور جا کر ہی سہی ماضی کے تجربات ومشاہدات کی جھلک نظر آتی ہے۔

مثلاً مسلمان خاندان میں سوئم کی رسم قل ہندومذہب میں "تیجے کے پھول" سے ملتی جلتی ہے یاد رہے کی "پھول" سے مراد یہاں جلنے والی چتا سے مردے کی ہڈیاں کا "سفوف" یا "راکھ" ہے۔ اسی طرح بہت سی منتوں مرادوں میں درگاہوں اور مندروں میں ادا کی جانے والی رسوم و روایات میں بہ آسانی اشتراک و مماثلت ڈھونڈی جاسکتی ہے اور ظاہر ہے کہ زبان و ادب زندگی کی انھی تصاویر کی سچی عکس بندی کا دوسرا نام ہے۔ مسلم معاشرے اور ہندو معاشرے کے باہم رسوم و رواج میں مماثلت کی بڑی وجہ یہ بھی رہی ہے کہ برصغیر میں باہر سے آنے والے حکمرانوں اور اُن کی افواج کو بیس بیس برس سے زائد بھی نہ صرف یہاں قیام کرنا پڑا بلکہ انھوں نے یہاں برصغیر کے مختلف گھرانوں کی خواتین سے شادیاں کرلیں اور پھر تاحیات قیام کیا۔ یہاں کی خواتین فارسی نژاد یا فارسی گو نہ تھیں مگر مسلم گھرانوں میں شادی ہو جانے کے بعد فارسی سنسکرت اور دیگر مقامی زبانوں کا ایک نیا اشتراک بھی سامنے آیا۔ اور رسوم و رواج کے ساتھ ساتھ وہ مقامی توہمات اور شگون بھی مسلم معاشرت میں آہستہ آہستہ سرایت کرتے رہے۔ اور کہیں جزوی انداز میں جگہ پائی۔ عورت مرد کے مقابلے میں ہمیشہ سے زیادہ توہم پرست اور شگون پرست واقع ہوتی ہے کیونکہ اُس کے مزاج میں چیزوں اور واقعات کی جُزیات پر غور کرنا مشکل ہے اور وہ کہیں شیشہ گر کر ٹوٹنے سے پریشان ہو جاتی ہے تو کہیں کالی بلی کا راستہ کاٹنے سے، کہیں سیاہ لباس یا اوڑھنی نحس گردانتی ہے اور سہاگ کے لیے منحوس خیال کرتی ہے تو کہیں چھپکلی کا نام اس لیے زبان پر نہیں لاتی کہ زبان ناپاک ہو جائے گی۔ اسی طرح قرآن کی قسم اُٹھانے کو "بڑی روٹی اُٹھانا" کہتی ہے اور شادی بیاہ کی تقریبات میں کسی بیوہ کی نظر یا ہاتھ سے چھو جانے والے لباس یا سامان کو برا خیال کرتی ہے اور بدشگونی کہتی ہے تو کہیں شادی کے جوڑے (کپڑے) کو پہلے سات سہاگوں کا ہاتھ لگواتی ہے جسے " قینچی کی رسم " بھی کہا جاتا ہے۔ سانپ کا نام نہ لینا کہیں سانپ حاضر نہ ہو جائے (یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سانپ کی قوت سماعت بہت تیز ہے اور اس کا نام بھی لو تو وہ ضرور سن کر آجائے گا)

اس لئے سانپ کو: ماموں" یا" رسی" کہنا۔ تاریخ ادبیات مسلمانِ پاکستان وہند میں رقم ہے۔

"مسلمانوں کے بالائی طبقوں میں ہندوانہ توہمات و تصورات کے پھیلانے میں عورتوں کا بڑا دخل تھا۔ باہر سے آنے والے مسلمانوں نے اکثر و بیشتر صورتوں میں برصغیر کی عورتوں سے شادی اور اگرچہ عورتوں کو مسلمان بنالیا جاتا تھا پھر بھی وہ اپنے قدیمی اوہام و عقائد ترک نہیں کرتی تھیں۔ اس لیے ہندوانہ رسوم ورواج مسلم گھرانوں میں بھی عام ہو گئے مثلاً منگنی اور شادی کی رسوم، حاملہ عورتوں کا گرہن کے زمانے میں فاقہ کرنا نظر بد سے بچنے کے لیے خاص خاص تدابیریں سالگرہ کی رسم، بیواؤں کا چوڑیاں ٹوڑ دینا، شیخ سدو کا تصور، جادوٹونے پر اعتماد وغیرہ۔ (۲۸)

ذرائع روزگار کے لیے انسان کسی نہ کسی پیشے سے منسلک ہو جاتا ہے۔ قدیم ہند میں یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جسے محض روزگار سے نسبت دی جاتی بلکہ اس سے انسانوں کی سماجی حیثیت کا تعین کر کے اُس کی نسلوں پر چھاپ لگ جاتی۔ پیشوں کی بنیاد پر برادریوں کی تقسیم بھی ہندو اثرات کا نتیجہ ہے اور شادی غمی اور تقریبات کا اتنا اہتمام اور تزک و احتشام بھی ہندو تہذیب و معاشرت خصوصیت ہے۔ جس سے مسلمان برصغیر میں متاثر ہوئے"(۲۹)

شادی غمی اور دیگر اہم مواقع کے حوالے سے برصغیر کی ثقافت کی لاتعداد رُسوم کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ اور یہ رسومات اکثر اونچے طبقات سے شروع ہو کر نچلے طبقات میں رواج پاتی ہیں۔ اور اکثر اوقات ان کے ہاتھوں لوگوں کی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ جہیز جیسی رسوم اور شادی و مرگ پر بے جا اخراجات کے مختلف حوالوں کی فہرست بھی طویل ہے۔ بلاشبہ ان کے پیچھے نسائی شعور ہی زیادہ کا فرما نظر آتا ہے اور اس کے اثرات عام آدمی کی زندگی اور زبان وادب پر پڑتے ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

بے شک یہ مثبت یا منفی جس قسم کے بھی اثرات کے حامل رہے انھوں نے اردو زبان مین اپنے مضبوط تاریخی شواہد چھوڑے اور آج تک ہمارا معاشرہ ان کا پابند ہے۔ ان توہمات میں سے اکثر بے بنیاد ہیں اور جھوٹے قصوں اور کمزور ذہنوں کی اختراع کے سوا کچھ بھی نہیں مگر برصغیر کے مسلمان گھرانے بھی ان سے محفوظ نہ رہ سکے۔ "والدین کا حد سے بڑھا ہوا احترام، ان کے سامنے حیا اور تہذیب کے خاص اُصول، عورتوں کا

قید کی حد تک پردہ اور ان کی زندگی کے خاص ضوابط، یہ سب خصوصیات ہیں جن میں سے اکثر دوسرے ممالک کے مسلمان کم آشنا ہیں "(۳۰)

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان و ادب میں ان توہمات اور بے جار سوم کا تزکرہ اور ان سے متعلقہ محاورات، ضرب الامثال اور فقرات زنانہ معاشرت میں ہی پنپتے ہے۔ چونکہ خواتین کا میل جول اور روابط اندرونِ خانہ یا صرف خواتین تک ہی زیادہ تر ہوتا تھالہذا اِن کی پرداخت و نگہداشت اور ترویج بھی نسائی زبان تک محدود رہی بعد ازاں اِن الفاظ و محاورات کو ادبی حیثیت بھی حاصل ہو گئی اور ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری اور مرزا ہادی رسوا نے اپنے ناولوں میں ان کو استعمال کر کے اردو ادب میں نسائی لب و لہجے کو فروغ دے کر محفوظ کر دیا۔

نسائی زبان کا مکالمہ ہمیں ایک اور دلچسپ پہلو سے بھی متعارف کرواتا ہے۔ جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ حساب کتاب، ناپ تول، جمع تفریق اور گنتی کے معاملے میں بھی خواتین کی زبان و بیان کا انداز مردوں سے جداگانہ رہا۔ اور پھر وہ چاہے اناج، دالوں اور دیگر اشیائے خورد و نوش کا ناپ تول ہو یا دنوں، ہفتوں، مہینوں کا حساب یا چیزوں کی کمیت و کیفیت کا بیانیہ خواتین کی زبان میں اس بابت بھی کافی دلچسپ اور منفرد تراکیب اور حوالے نظر آتے ہیں۔

خواتین کی بابت ویسے بھی یہ بات مشہور ہے کہ وہ بسیار گو اور باتونی ہوتی ہیں اور چیزوں کی جذیات نگاری اور واقعات کی منظر نگاری اِن سے بہتر شاید ہی کوئی کر سکتا ہے۔ اپنی اس فطری صلاحیت اور استعداد کو وہ روزمرہ اور محاورات میں بھی بخوبی استعمال کرتی آتی ہیں اور آج اُن کے الفاظ و محاورات ہمارے نثر پاروں اور عام روزمرہ گفتگو کا سنگھار بن چکے ہیں اگرچہ اشیاء کے ناپ تول اور گنتی حساب کے پیمانے موجود تھے مستعمل تھے خرید و فروخت کے وقت وزن کے پیمانوں سے لے کر انچ، گز، میل دو میل، فرلانگ، فٹ، مرلہ، کنال، ہر طرح کے پیمانے موجود تھے مگر عورتوں نے اس کے باوجود اپنی فہم و اختراع کے مطابق کئی طرح کے حساب کتاب اور گنتی شمار کی بابت اپنا منفرد انداز متعارف کروایا جیسے:۔ چاند بھرنا(مہینہ تمام ہو جانا) اٹھوارہ یا اٹھورای (ہفتہ یا آٹھ دن) پندرھواڑہ(پندرہ دن) تماہی۔(تین دن) ششماہی (چھ دن) پار سال(پچھلے سال) پرو پرار(پچھلے سے پچھلے سال) ڈیڑھلڑوا(ڈیڑھ کلو) آدھے کا تیہا ہونا(یعنی نصف کا تہائی ہونا) پنج سیرہ یا دھڑی(پانچ کلو) دھون(نصف من) یعنی آدھا من۔

کپڑوں کی سلائی کٹائی کے لیے انچ اور گز کے بجائے ناپ تول بالشت اور انگلی سے کیا جاتا۔ اور محاوروں میں بھی بالشت بھر ہونا۔(ایک ہاتھ جتنا ہونا)جب کہ زبان دراز عورت کو گز بھر کی زبان ہونا، کہہ دیا جاتا تھا اور کپڑوں کے ناپ میں "گز" کا لفظ خواتین کم ہی استعمال کرتی تھیں۔

وحیدہ نسیم "عورت کی زبان" میں لکھتی ہیں

> "اس سلسلے میں ایک دلچسپ امر یہ بھی ہے کہ عورتوں کو بیس سے زائد گنتی یاد نہ تھی اس لیے وہ روپوں عمر اور اشیاء کا حساب کتاب صرف بیس کے ہندسے سے کیا کرتی تھیں مثلاً: بیسی: جس کی عمر بیس برس کی ہو۔ مثل مشہور ہے۔ بیسی کھیسی، ساٹھا پاٹھا"(۳۱)

اسی سلسلے میں وہ آگے جا کر لکھتی ہیں کہ خواتین "چالیس" کے ہندسے کے بجائے دو بیسی اور "ساٹھ" کے بجائے تین بیسی "سو" کے بجائے "پانچ بیسی" کے الفاظ استعمال کرتی تھیں۔

حساب کتاب کے معاملات مین ذاتی وضع کردہ اصطلاحآت متعارف کروانے کے باوجود اُردو زبان میں بے شمار ایسے محاورات بھی موجود ہیں جن میں گنتی یعنی اعداد کا تذکرہ ہے۔ ان کی تعداد سیکڑوں ہے مگر چند کا تذکرہ یہاں کیا جاسکتا ہے۔ جن میں ایک، دو، تین، چار سے لے کر گنتی کے کئی اعداد شامل ہیں جیسے:۔

دو جی سے ہونا۔(حمل سے ہونا) دو بول پڑھوانا، دو حرف بھیجنا، دو دو ہاتھ اُچھلنا، تیسرے دن کے پھول، چار حرف بھیجنا، ، چار میں ہانڈی پکانا، چار ہاتھ زبان سات پردوں رہنا، سات پیڑھی پُن کے رکھ دینا، سات سہاگوں کو ہاتھ لگوانا، سات ماموؤں کا بھانجا ہونا، آٹھ آٹھ آنسو رونا، وغیرہ۔ خواتین کی زبان درازی کو ملاحظہ فرمائیں اور کوسنوں وطعنوں کی فطری عادت کو یاد کریں تو اس کی بھی مختصر سی فہرست بن جائے گی جیسے ہاتھ بھر کی زبان، گز بھر کی زبان، چار ہاتھ کی زبان، دس دس باتیں سنانا، دس گز کی زبان، ستر باتیں سنانا، سو ہاتھ کی زبان وغیرہ جیسے کتنے ہی محاورے تو اسی میں موجود ہیں۔

ز) ما قبل ۱۸۵۷ء نسائی لب و لہجے کے شواہد، روایت اور تناظر

اردو نثر سے پہلے اردو شاعری متعارف ہوئی اور دنیا کی ہر زبان کا ادب نثر کی بجائے شعر سے شروع ہوتا ہے۔ اردو میں اول اول غزل فارسی سے آئی۔ اردو غزل تمام تر فارسی مزاج رکھتی تھی مگر آہستہ آہستہ اس نے اپنا رنگ ڈھنگ بدلنا شروع کر دیا اور غزل کی رومان پرستی کی فضاؤں سے باہر نکلنے لگی۔ جنسی لذت کی خواہش نے اظہار مانگا اور ہزل و واسوخت کی صورت میں ایسی شاعری سامنے آنے لگی کہ جس میں بعض

اوقات مزاح کا رنگ اجاگر کرنے کے لئے عورت کی وضع میں مردوں نے اپنا کلام عورت کے لہجے میں لکھنا اور سنانا شروع کر دیا عورتوں کی زبان کو ریختی کا نام دیا گیا جو کہ ایک نئے رجحان کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ وہ طعنے، کوسنے، وہ ادائیں، وہ جلوے وہ رمز وایما اور اشاراتی و علامتی پہلو اور وہ لفظیات جو صرف عورت کی زبان کا حصہ تھیں وہ سب ریختی میں شامل ہونے لگیں۔

امیر خسرو نے بھی ہندی شاعری کے اس مزاج کو پیش خاطر رکھا جس میں عورت محب ہے اور مرد محبوب ہے۔ انھوں نے عورت کے لب ولہجے میں عشق کی واردات اور ہجر کے صدمات کو بیان کیا۔

ع سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

ع خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ

ع چھاپ تلک سب چھین لی رے موسے نیناں ملائی کے

ان گیتوں اور مختلف لوک گیتوں اور بولیوں کا جائزہ لیا جائے جن کے باقاعدہ تحریری شواہد تو بہت کم ہی ملتے ہیں مگر یہ صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے چلے آئے ہیں تو یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ نسائی زبان کا یہ رنگ خسرو سے پہلے بھی موجود رہا ہو گا۔

۱۸۵۷ء سے قبل کے نثری ادب میں نسائی زبان و محاورہ کے شواہد کا جائزہ اسی مقالے کے باب سوم میں پیش کیا گیا ہے اور لسانی تناظرات کا پس منظر باب دوم میں پیش کیا گیا ہے یہاں ہم مختصراً ان الفاظ و محاورت کا ذکر کریں گے جو بطورِ خاص عورت کی زبان اور عورت کے مخصوص جذبات کے اظہار کے طور پر ایک شعری تحریک کے طور پر سامنے آئے۔ اسے ریختی کا نام دیا گیا اور اس میں خواتین کی زبان کو پہلی بار اس بے باکانہ انداز میں سامنے لایا گیا جس کی اس سے قبل کوئی مثال موجود نہ تھی۔ اس طرز کی شاعری میں بالخصوص خواتین کے خاص محاوروں ،اندازِ گفتگو اور تلفظ کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے موضوعات میں خواتین کی خواتین سے اور خواتین کی مردوں سے آشنائی اور خواتین کی جنسی خواہشات کا اظہار شامل ہوتے ہیں۔"(۳۲)

ریختی وہ صنفِ شاعری ہے جسے اردو زبان و ادب میں وقتی طور پر مخصوص طبقے میں عروج ملا اور اِس کے لکھنے پڑھنے سنانے اور سننے والے بھی مخصوص لوگ تھے ہر خواص و عام اِس میں دلچسپی نہیں لیتا تھا کیونکہ اس میں عورتوں کی زبان تو تھی مگر گھریلو شریف عورتوں کی زبان نہ تھی بلکہ بازاری عورتوں کی زبان سے مخصوص جنسی اور عامیانہ موضوعات کا بیان تھا۔ برِ صغیر پاک و ہند معاشرہ جنسی اور عامیانہ موضوعات کا بیان

تھا۔ برِ صغیر پاک و ہندی معاشرہ دراصل عورت کی سماجی حیثیت اور کردار کے حوالے سے ایک مختلف طرز کا معاشرہ تھا۔

> "ریختی کا لفظ دراصل ریختہ سے ماخوذ ہے۔ اصطلاح شاعری میں اس نظم کو کہتے ہیں جس میں شاعر عورتوں کی زبان اور انہی کے سے انداز میں اُن کے خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے اس صنفِ سخن کو دراصل دلی و لکھنو کے ماحول میں پلنے اور بڑھنے کا موقع ملا مگر فطری مناسبت نہ ہونے کے باعث ترقی نہ کر سکی اور اب تقریباً اس صنف کا نام ہی رہ گیا ہے"(۳۳)

ریختی میں مخصوص عورتوں کی زبان، محاورہ ضرب الامثال اور لہجہ کی ترجمانی کی گئی ہے کیونکہ کسی بھی ادب پارے میں عام شریف عورت کی زبان کا استعمال معیوب نہیں سمجھا جاتا مگر ریختی کی بنیاد ہی فحش گوئی، شہوانی و نفسانی جزبات کی برانگیختی اور سفلی جزبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ جبکہ شریف گھرانوں کی بیگمات کی زبان اس سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ مرزا محمد عسکری کا کہنا ہے: "ہم نے شریف گھر کی عورتوں کے منہ سے وہ بولی کبھی نہیں سنی جو ریختی میں مصنوعی طور پر بولی جاتی ہے۔ ریختی کی زبان مسلمان عورتوں کی عام زبان نہیں ہے۔"(۳۴)

خاص طور پر رنگیں کے ہاں ہمیں جو نسائی محاورات ضرب الامثال اور الفاظ ملتے ہیں وہ عام شریف انسان جس کا واسطہ یا رابطہ کبھی طوائفوں سے نہ رہا ہو وہ سمجھ ہی نہیں پاتا۔ یہ ایک مخصوص طبقے کی عورتوں کی زبان ہے۔ یعنی ہر بر ملا کہہ سکتے ہیں کہ ریختی زبان عورتوں کی ہے مگر عورت کی منفی تصویر پیش کرتی ہے۔ اور یہ ستم مرد کے قلم سے ڈھایا گیا کیونکہ جو طوائفیں خود شاعرہ بھی تھیں انھوں نے بھی اس قسم کے رکیق جزبات یا اوباش لفظیات سے پرہیز کیا۔ ڈاکٹر صابر خان بھی محمد حسن عسکری کی تائید میں کہتے ہیں کہ "ریختی سے مراد ایسی شاعری ہے جس میں عورتوں کے جذبات و معاملات بیان کیے جائیں۔(۳۵)

لفظ "ہریان" کسی کو رد کرنا یا مرد کو مسترد کرنے کے معنوں میں عورتیں بولا کرتیں تھیں اور اسی طرح "نوج" ناپسندیدگی کے معنوں میں صرف عورتیں ہی بولتی ہیں۔ "مردوا" کا لفظ بھی عورت کی زبان سے نکلتا تھا مرد نہیں بولتے تھے۔

سعادت یار خان رنگیں اور انشاء اللہ خان انشا کو ریختی کے اولیں شاعر قرار دیا جاتا ہے مگر ان دونوں میں سے بہت پہلے ہاشمی بیجاپوری نے ریختی میں ہزاروں اشعار لکھے۔ یہ عادل شاہی دور کا شاعر تھا۔

مہ لقاچندا بائی کا دیوان بھی دیکھیں تو اس میں سے عمومی غزل کے رویے کو ہی اپنایا اور ایسا انداز اپنایا جو غزل کی روایت کا امین تھا۔ دراصل ہم یہ سہولت سے کہہ سکتے ہیں کہ "ریختی" ہے تو عورتوں کی زبان و محاورہ مگر اوباش عورتوں کی وہ زبان جو شاید ان سے زیادہ مردوں نے استعمال کی اور ریختی کی صورت میں جمع ہو گئی۔ مگر اردو زبان و ادب میں ریختی کا اضافہ اور اس کا حصہ اس قدر نمایاں اور اہم ہے کہ اس کو نظر انداز کر کے اردو شعری روایت کو مکمل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بہت سے ایسے الفاظ اور نسائی محاورات جو ادبی زبان میں کہیں محفوظ نہ تھے محض زبانی بولے اور سنے جاتے تھے۔ وہ بھی محفوظ ہو گئے بے شک یہ اتنے شائستہ الفاظ اور مذہب مضامین نہیں ہیں مگر ان کے توسط سے ایک مخصوص طبقے کے نسائی فکر، رویوں، خواہشات، محرومیوں، رسوم و رواج، ترجیہات، جنسی بھوک اور نفسیاتی مسائل کا بھی ادارک ہو جاتا ہے۔

کرتی ہے کنگھی چوٹی بڑھاپے میں بیگلا
رسی زناخی جل گئی لیکن نہ بل گیا(۳۶)

یہ کس سکھڑ نے سکھائی تجھ کو ہے کسبوں کی سی اونچی کرتی
کھلا ہے بہت آدھا اوئی نگوڑی ذرا حیا کر ذرا حیا کر (۳۷)

اگرچہ یہ زبان و محاورہ اور لفظیات اس قدر مہذب نہیں ہیں مگر نسائی زبان کے طور پر اردو کا حصہ تصور کیے جاتے ہیں۔

یہ لال میرے ہونٹ کیے چوس چوس کر
صاحب رہی نہ بیڑے جمانے کی احتیاج

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس طبقے کی ایسی سچی عکاسی اور نمائندگی اس سے پیشتر اور اس کے بعد ادب مین کہیں نظر نہین آتی۔ بازار حسن کی ایسی عکاسی جو مبنی بر حقیقت ہے وہ بھی ہمارے ہی سماج کا ایک حصہ ہے۔ انھی شہروں کے اندر ایک الگ وضع کا معاشرہ اسی زبان اور بولی میں اپنی الگ شناخت رکھنے والی زبان اور اصطلاحات رکھتا تھا۔ ہمارا مقصد دراصل انسانی معاشرے میں "نسائی زبان و محاورہ" کی مختلف النوع جہات اور ذائقوں کو متعارف کروانا ہے جو جان صاحب، رنگیں، انشا اور محسن وغیرہ کے توسط سے سامنے آتا ہے۔

ریختی کے حوالے سے جو نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے وہ "جان صاحب "کا ہے پورا نام میر یار علی تھا عرفیت "جان صاحب" تھی سو اسی کو تخلص کرتے تھے وہ فرخ آباد پیدا ہوئے اور لکھنو کے نوابوں میں عمر کا زیادہ حصہ گزارا۔ وہ مشاعروں میں ریختی با قاعدہ دوپٹہ اوڑھ کر زنانہ لب و لہجے میں سنایا کرتے تھے اور خوب داد وصول کیا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنا پہلا دیوان ۱۸۴۵ء میں شائع کروایا اور تقریباً دس برس بعد خود ہی اس کو رد کرتے ہوئے دوسرا دیوان شائع کروایا کہ پہلے میں بہت کجیاں کوتاہیاں رہ گئی تھیں۔

ریختی میں جو نسائی الفاظ و تراکیب کثرت سے استعمال ہوئے اور جو مخصوص نسائی اصطلاحات برتی گئیں وہ یادگار ہیں جیسے:

دگانہ: جڑواں پھل دے کر دوستی کرنا

گوئیاں: رازدار سہیلیاں

ددا: بوڑھی دایہ

کوکا: دودھ شریک بھائی

انگیا کی چڑیا

انگیا کی کٹوری

انگیا کے بازو

انگیا کی کلیاں

تلے دانی: ننھی سی تھیلی جس میں عورتیں سوئی دھاگہ رکھتی ہیں۔

"ہوئی باجی" "اوئی باجی" ایسے الفاظ صرف خواتین بولتی ہیں جیسے اوئی اللہ، اوئی اماں، ہائے ری، اگلے شعر میں "نگوڑی" کا لفظ "زناخی" بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔

"نوج" لفظ اب متروک ہو چکا ہے یہ صرف خواتین بولتی تھیں، اس کا مطلب تھا خدانخواستہ۔ اللہ نہ کرے۔ کوکھ اور مانگ سے ٹھنڈی ہونا بھی محاورہ ہے یعنی سہاگن اور صاحب اولاد ہونا۔

ہزاری روزہ رکھنا اور نوچندی یعنی نئے چاند کا روزہ رکھنا بھی نسائی محاورے ہیں اور نسائی سوچ اور ثقافت کا حصہ ہیں۔ مرد یہ روزے نہیں رکھتے تھے اسی طرح مندرجہ بالا اشعار میں "سرپیٹ لینا" بھی نسائی محاورہ ہے اور پنج سُورے میں دیکھنا سے مراد "پنج سورہ" ہے جس میں قرآنی سورتوں اور وظائف کے ساتھ

ساتھ قرآنی فالنامہ بھی عموماً موجود ہوتا ہے یا استخارہ کی دعا اور طریقے لکھے ہوتے ہیں۔ کسی کام سے پیشتر خواتین ان سے رجوع کرتی ہیں۔

ہماری روایات میں دودھ شریک بھائی کو بھی سگے جیسا ہی مقام حاصل تھا۔ جھلا جھل کی اوڑھنی خواتین کے پسندیدہ لباس میں سے ایک رہی ہے۔ اوڑھنی، چنریا، چولی، انگیا، گھاگھرا، کھڑا پاجامہ، چوڑی دار پاجامہ، کرتی وغیرہ یہ تمام لباس کے نام اردو شاعری میں ریختی کے سبب شامل و محفوظ ہوئے۔ اوڑھنی بارہ گرہ یا دو گز کپڑے کا دوپٹہ لڑکیاں اوڑھا کرتی تھیں۔ چولی عموماً ہندو عورتوں کا لباس تھا یہ سینہ بند کی طرح ہوتی ہیں جس سے پیٹ سے اوپر تک کا حصہ ڈھانپا جاتا۔ دکن کی خواتین چولی پہنتی تھیں اور دکنی ریختوں میں اس کا ذکر بھی ملتا ہے۔ وحیدہ نسیم لکھتی ہیں: "چولی ہندو عورتوں اور دکن کی خواتین میں عام تھی اس میں آستین اور کنواڑ دونوں ہوتے ہیں بغل ایک خاص قسم سے کاٹی جاتی ہے اس کو پہن کر پیٹ سے اوپر گرہ لگادی جاتی ہے۔"(۳۸)

"تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند" کی جلد دوم میں انشاء کا تذکرہ کافی تفصیل سے رقم ہے انشاء کی ذہانت، زباندانی پر مہارت، غزل میں روایت سے ہٹ کر تجربات کی جرات کرنا انشاء کا ہی کمال تھا۔ انھوں نے بہت سی زبانوں پر مہارت حاصل کی تھی جس کے باعث وہ ریختی میں بھی روانی سے "نسائی زبان و محاورہ" کا استعمال کرتے تھے۔ محمد حسین آزاد "آبِ حیات" میں ریختی کے بارے میں لکھتے ہیں "ریختی کا شوخ رنگ سعادت یار خان رنگیں کا ایجاد ہے لیکن سید انشاء کی طبع رنگیں نے موجد سے کم سگھڑاپا نہیں دکھایا۔"(۳۹)

جان صاحب کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مشاعروں میں باقاعدہ دوپٹہ اوڑھ کر شعر سنایا کرتے تھے۔ دیگر ریختی گو شعراء میں سے جان صاحب اپنے فن کی بلندیوں پر نظر آتے ہیں ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں: "جان صاحب کے کلام میں سولہ نام تو صرف انگیا کے مختلف حصوں کے نظم کئے گئے ہیں۔ مثلاً انگیا کا بنگلا، انگیا کا کنٹھا، انگیا کا گھاٹ، انگیا کے پان، انگیا کی چڑیا، انگیا کی کٹوریاں، انگیا کی لہر وغیرہ وغیرہ۔"(۴۰)

رنگین ریختی کا وہ شاعر ہے جس نے اپنے عہد کی جنسی ثقافت کو سب سے زیادہ بیان کیا ہے اس کی اس دلیری اور بے باکی پر اس کا معاشرہ اس پر ناراض بھی ہوا مگر اس کا گناہ صرف اتنا تھا کہ اس نے اپنے معاشرے کی جنسی ثقافت کو ریختی میں عیاں کر دیا۔ اس پر اخلاقی الزامات لگے مگر اس نے جو دیکھا اسے بیاں کر دیا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

> "اس میں پردہ نشیں بیگمات کی زندگی کے بہت سے ان دیکھے پہلو بھی سامنے آتے ہیں جن میں ان کی خانگی زندگی کی جھلکیاں موجود ہیں۔ ان کے ذاتی

مسائل اور جنسی گھٹن کے منظر بھی نظر آتے ہیں۔ یہ جنسی گھٹن بعض
حالتوں میں عورتوں کے درمیان ہم جنس پرستی کی شکل اختیار کر لیتی
ہے۔"(۴۱)

اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ریختی کے مضامین فحش اور اخلاق باختہ ہیں مگر شاعر وہی کچھ لکھتا ہے جو اس کے معاشرے میں اس کے ارد گرد ہو رہا ہوتا ہے۔ یہاں ہمیں نسائی اردو زبان و محاورہ کا ایک ذخیرہ ملتا ہے۔ جو ریختی کے توسط سے محفوظ ہوا۔ رنگیں خود "دیوانِ انگیختہ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"اکثر میں عرسِ شیطانی کی عبارت سے، جس سے تماش بینی خانگیوں کی سے
کیا کرتا تھا اور اس قوم کی ہر ایک فصیح پر دھیان دھرتا تھا۔ کچھ دن اسی طرح
گزرے تب یہ خانگیوں کی بہت سی اصطلاحات اور محاوروں کا علم ہوا۔ ان
کی زبان میں یہ چوتھا دیوان جو "انگیختہ" کے نام سے مشہور ہے ترتیب
دیا۔"(۴۲)

رنگیں نے معاشرت میں خواتین کی ہم جنس پرستی پر کافی اشعار کہے جسے کہا جاتا ہے ایسی عورت کی دریافت رنگین کا قصور ہے، تو ہے۔

وہ لگاتا ہی نہیں چھاتی کو ہاتھ
اپنی چھاتی میں مروڑوں کیسے
رنگین قسم ہے تیری، ہوں میلے سر سے میں
مت کھول کر کے منت و زاری ازار بند
ٹیس پیڑو میں اٹھی اوہی مری جان گئی
مت ستا مجھ کو دوگانا ترے قربان گئی(۴۳)

"دگانہ" اس خاص سہیلی کو کہا جاتا تھا جو ہم جنس پرستی میں فریق دوم ہوا کرتی تھی۔ "زناخی" بھی اسی کو کہا جاتا تھا۔ رنگین نے لکھنوی معاشرے کے جس پہلو ہم جنس پرستی کی طرف اپنی ریختیوں میں اشارہ کیا ہے اور دوگانہ، زناخی الاچی کی جو روایت اس وقت موجود تھی یعنی دو الا ئچیاں اٹھائی اور دو عورتیں اس کو کھول کر دانے شمار کرتیں جس کی الائچی کے دانے جفت ہوتے اس کو فریق نر کا کردار ملتا جبکہ دوسری کو "مادہ" کا۔ سلیم اختر کے اپنی کتاب "عورت جنس کے آئینے میں" لکھا ہے کہ

"زیادہ تر عورتیں ایسی ہی صورت حال میں پائی جاتی ہیں اور اسی سے مردانہ
اور زنانہ ہم جنس پرستی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خصوصیت سے اس تمدن
میں سماجی لحاظ سے مردوں کے مقابلہ میں عورتیں باآسانی جسمانی بے تکلفی
سے کام لے سکتی ہیں اور کوئی ان پر حرف گیری نہیں کرتا۔ عورتیں اگر
آپس میں بوس و کنار کرتی ہیں تو اسے عام طور پر اظہار دوستی سمجھا جاتا ہے۔
امریکہ میں باپ اپنے بیٹے کا منہ چومتے وقت کافی گھبراتا ہے لیکن ماں اپنی
بیٹی کے معاملے میں ایسا محسوس نہیں کرتی۔"(۴۴)

لکھنو میں کوئی ایسا محلہ نہیں تھا جہاں طوائفیں نہ رہتی ہوں۔ گھروں میں بیٹھی بیگمات کی طرف توجہ دینے کے بجائے عموماً مرد باہر کی عورتوں اور طوائفوں کے چکر میں رہتے تھے اس وجہ سے بھی عورتوں کی عورتوں کے ساتھ دوستی اور قربتیں رواج پا گئیں۔

جان صاحب کا نام ریختی کے حوالے سے اس لئے بھی نمایاں تر سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے عورت کے محض سستے جذبات کی نمائندگی ہی نہیں کی بلکہ اس کے گرد بُنی ہوئی مکمل دنیا کو منظر عام پر لائے۔

"اعلیٰ طبقے سے لے کر ادنیٰ طبقے تک کی عورتوں کو جو معاملات پیش آتے ہیں
جو کام وہ کرتی ہیں جو باتیں وہ کہتی ہیں جو خیال ان کے دلوں میں پیدا ہوتے
ہیں سب کا ذکر جان صاحب نے کر دیا ہے باپ کا پیار، ماں کی ممتا، بھائی بہن
کی الفت، میاں بیوی کی محبت، آپس کے جھگڑے، سوت کا جلاپا، آشنا کے ناز
نخرے، ساس نندوں کی لڑائی، دلہن کا حجاب، سالیوں کا مذاق، زچہ خانے کی
کیفیت، بچوں کی حالت، خانہ داری کے امور، شادی بیاہ کی رسمیں، ارباب
نشاط کی باتیں، لونڈی غلام سے برتاؤ، بیمار کا تیمار، مردے کا ماتم، ٹونے ٹوٹکے،
ضعیف الاعتقادی، کپڑے، زیور، بناؤ سنگھار کی چیزیں۔ مختصر یہ کہ دنیا بھر کی
باتیں بتا دیں ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سوسائٹی کو جو حالت تھی اس
کی تصویر یہ دیوان ہے۔"(۴۵)

ضرب المثل و محاورات کے حوالے سے ریختی کے ان اشعار میں جائزہ لیا جائے تو ان میں سیکڑوں ضرب الامثال محاورات اور کہاوتیں اردو زبان کا دامن وسیع کرتے نظر آتے ہیں جیسے:

"وہ سونا پھٹ پڑے جس سے ٹوٹے کان اے گوہر"

"پہن کے بالیاں کندن کی کیا کان کی صورت"

"گر یہ گشتن روز اول مردوں کی ہے مثل"

"فرق تم جورو پہ کرتے ہو اب بیٹا عبث"

"یہ بیل بھی منڈھے چڑھے پھولے پھلے بہو"

"دل باغ باغ ہو وہ خدا اب دکھائے باغ"

"لے گئے اس طرح بالی کان کاٹے چور کی"

"پاؤں چوموں آپ کا ہے کو نسا رہتا قدم"

اسی طرح ان کی ایک ریختی "کپڑوں کے نام" عنوان کی ہے جس کے ہر ہر شعر میں کسی نہ کسی کپڑے کا نام آتا ہے جو اس دور میں موجود تھے۔ مثلا سوسی، بنارس، رادھا نگری، نین سکھ، گلبدن، چھیٹ، کام لیٹ وغیرہ۔۔۔

سہیلیاں یا عورت کی دوست کو دگانا، زناخی، الاچی، چھو چھو، گوئیاں، خیلا بھی کہا جاتا تھا۔ آج ہم ان ناموں سے ناواقف ہیں مگر دیوان جان صاحب کے توسط سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ان میں عورتوں نے مختلف انداز سے قائم کی گئی دوستیوں کو مختلف نام دے رکھے تھے۔ نسائی زبان کا حسن اس وجہ سے جداگانہ ہے کہ وہ زبان اور جذبے کی نزاکت کو ہم آہنگ کرنا جانتی تھیں۔ "دگانہ" عورت کی وہ سہیلی ہوتی جس سے دوستی کی شروعات کوئی پھل، بادام، آخروٹ، کیلا وغیرہ کا آدھا حصہ دے کر شروع کی جاتی تھی۔

اگر لینے والی اس پھل کو دائیں ہاتھ سے لیتی تو دینے والی ایک لفظ فراموش بولتی تھی پھر لینے والی کو وہی پھل دو سو گنا یا دولاکھ گنا لوٹانا ہوتا تھا جو کہ عزیز و اقارب میں بانٹا جاتا تھا یوں دوستی کا اعلان ہو جاتا تھا اسی طرح "الاچی" بھی سہیلی کو کہا جاتا تھا جس کو ایک الاچی کے چند دانے خود کھا کر چند دوسری کو کھلا کر دوستی کی شروعات ہوتی تھیں۔ "زناخی" کا مطلب بھی سہیلی ہی تھا۔ "چھو چھو" ہم عمر کم سن ملازمہ تھا جو ساتھ کھیل کر جوان ہوتی۔ گوئیاں بھی سہیلی کا نام تھا اور "خیلا" پھوہڑ عورت کو کہا جاتا تھا۔ جان صاحب نے ریختی میں ان تمام اسماء کو بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔

مہ لقا چندا بائی نے طوائف ہونے کے باوجود اپنی شاعری (جو کہ زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے) غزل کے مروجہ مزاج کو متاثر نہیں ہونے دیا۔ نسائی جذبات کی عکاسی میں بھی غیر شائستہ انداز نہیں اپنایا۔ انھیں اردو زبان کی پہلی صاحبہ دیوان شاعرہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ان کا تعلق دکن کی محبت بھری زمین سے تھا

جہاں کے محمد قلی قطب شاہ کو اردو کا پہلا دیوان شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ریختی کی بابت جہاں ایک طرف ہمارے پاس رنگیں، انشاء، محسن اور جان صاحب جیسے شعراء کی نسائی زبان سامنے آتی ہے اور نسائی اردو زبان و محاورہ سے ہم متعارف ہوتے ہیں دوسری طرف عورت کی اپنی زبان جو عورت کے اپنے منہ سے ہم سنتے ہیں وہ بالکل غزل کی روایت، رواں بنی اور داخلیت کی کیفیات نظر آتی ہیں۔ مہ لقا چندا بائی جہاں بے تکلفی، شوخی اور بے باکی پر بھی اتر آتی ہیں وہاں بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھتیں۔ شفقت رضوی نے "دیوان مہ لقا چندا" کو مرتب کرتے وقت اس کا طویل مقدمہ بھی تحریر کیا ہے ان کے مطابق: "روز مرے اور محاورے کے استعمال میں بھی چندا ان کو ترجیح دیتی ہے جو عورتوں میں عام ہیں ویسے زبان دانی میں کمال درجے پر فائز ہونے کی وجہ سے اسے ہر نوع کے محاورے پر عبور حاصل ہے۔"(۴۶)

نمونہ کلام مہ لقا چندا:

آلا بالا نہ بتا ملنے میں ہر بات کے بیچ
وعدے کا کب ہے تحمل دل بے تاب کے بیچ
ان کو آنکھیں دکھا دے ٹک ساقی
چاہتے ہیں جو بار بار شراب
تم منہ لگا کر غیروں کو مغرور مت کرو
لگ چلنا ایسے ویسوں سے دستور مت کرو
اشارہ پھر اسی ابرو سے چاہے ہے یہ دل میرا
کہ جس چشم سیہ نے سیکڑوں کے کے پل میں گھر گھالے (۴۷)

درج بالا اشعار میں آلا بالا کرنا یعنی ٹال مٹول کرنا، آنکھیں دکھانا، منہ لگانا، دستور کرنا، گھر گھالے وغیرہ نسائی محاورات ہیں اور پیار و محبت کے معاملات میں بھی ایک خاص تہذیب و شائستگی جھلکتی ہے۔
شفقت رضوی کے مطابق: "وہ بڑی شاعرہ نہیں، اچھی شاعرہ ضرور تھیں اور زندہ رہنے والی زبان کے خمیر سے واقف تھی۔ اسی لئے ایسی زبان میں شاعری کرتیں تھیں جو ہر دور میں با آسانی سمجھی جا سکتی ہے۔"(۴۸)

اردو زبان کی کوئی بڑی اور معروف لغت اٹھا کر دیکھ لی جائے تو ایک ایک لفظ پر مبنی سیکڑوں محاورات لغت کے بیسیوں صفحات پر تسلسل سے ملتے جائیں گے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون " اردو محاوروں اور کہاوتوں کی سماجی توجیہہ "مشمولہ" اردو زبان اور لسانیات" میں محاورات اور کہاوتوں پر تسلی بخش اظہارِ خیال کیا

ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ اردو زبان محاورات کے حوالے سے دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار کی جا سکتی ہے جیسا کہ "فرہنگِ آصفیہ" کی مثال لے لیں تو ایک ایک لفظ پر مبنی سیکڑوں محاورات لغت کے سو پچاس صفحات پر بڑی سہولت سے محیط نظر آتے ہیں۔ان میں زیادہ تعداد بیگماتِ قلعہ سے متعلق محاورات کی ہے جیسے لگائی بجھائی کرنے والی عورت کو "پتنگ چُھری" کہا جاتا، "محل دارنی" کا مطلب معزز خادمہ تھا" اوپر والا" سے مراد چاند لیا جاتا، شہزادے کو "صاحبِ عالم" کہا جاتا، کنیز کو "ناموس" نائی کو "خاص تراش"، حُقہ بردار ملازم کو "بھنڈابردار"، پانی پلانے والی ملازمہ "آب دار" باورچی کو "خاصہ دار"، سکھ کرنا" سے مراد سونا یا آرام کرنا ہوتا تھا، تیکھی یا تیکھا ہونا کا مطلب غصے ہونا ہوتا تھا اور خدا محفوظ رکھے کہنا ہوتا تو "چھائیں پھوئیں" بولا جاتا تھا۔انگلی پر چھلا یا انگوٹھی پہننے کا نشان رہ جاتا تو اس داغ کو "گُل کھانا" کہا جاتا اسی طرح "زمین پکڑنا"، کلیجہ پکڑنا"، "دوڑنگے مچانا"، "تلوے سہلانا"، لپکا(لت) پڑنا"، ہوا کھانا"، "جگر پکڑنا" چھرا چلنا"، چھٹی کا دودھ یاد دلانا" ہونٹ چاٹنا(مزا لینا)، لہو پانی ایک کرنا"، "آپے لونڈے، جاپے لونڈے کرنا" بمعنی فضول کام بولا جاتا اس طرح کے سیکڑوں کی تعداد میں محاورات "بیگماتی زبان" کا حصہ رہے اور آج اردو کے دامن میں اپنا معنوی حسن لیے موجود ہیں

۔۔پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی لکھتے ہیں:

"محاورہ کسی بھی قسم کے تصرف یعنی، کمی بیشی یا تغیر کی مداخلت کو برداشت نہیں کرتا، محاورہ جوں کا توں اور قطعاً مناسب محل پر استعمال ہونا چاہیے۔دیکھو،" جب سے تمھارا عہدہ بدلا ہم تو تم سے ہاتھ دھو چکے "یعنی ملاقات سے مایوس ہو گئے۔یہ محاورہ ہے، اب تم اگر یہ سوچو کہ مایوسی کو زیادہ بڑھایا جائے اور زیادہ شدید بتایا جائے اور کہو "جب سے تمارا عہدہ بدلا ہم تو تم سے دونوں ہاتھ دھو چکے" تو تم بیہودہ گو اور منقلِ محفل بنو گے۔محاورہ اپنے تعینات اور معنی میں مکمل ہوتا ہے۔اور اس میں کسی قسم کی بھی مداخلت ناجائز ہے۔اردو میں محاورات کا ذخیرہ شاید تمام زبانوں سے زیادہ ہے۔یہی نہیں کہ محاورے ہماری زبان میں سب سے زیادہ ہیں بلکہ ان کی نوعیتیں گونا گوں ہیں۔یہ افراط اور یہ تنوع دوسری زبانوں میں نہیں پایا جاتا۔"[۴۹]

پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اپنی کتاب "کیفیہ" میں محاورات کے باب میں سماجی ضرورتوں کے تحت استعمال ہونے والے محاورات کی درجہ بندی کرتے ہوئے محاورات کی اہمیت و افادیت اور مقبولیت

پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے حیوانی محاورے، موسمی محاورے، پوشاکی محاورے، اعضائی محاورے، نباتاتی محاورے، صنعت و حرفت کے محاورے، آبی محاورے، عددی محاورے اور شجاعتکے محاورات سے لے کر اشیائے خورونوش کے محاوروں کینشاندہی کی ہے۔۔نسائی زبان ان محاورات کے تشکیل و ترویج میں پیش پیش رہی ہے۔چیدہ چیدہ محاورات "فرہنگِ آصفیہ" سے بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں جو خالصتاً نسائی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں جیسے پیٹ سے ہونا، پاؤں بھاری ہونا، کلیجہ کٹنا، آٹے کی چڑیا ہونا۔۔۔رسم و رواج کے حوالے سے ٹھیکرے کی منگ ہونا، مانجھے بٹھانا، اُبٹنا، چوتھی کا پھیرا الگوانا، ساچق بھوانا، ساوَنی بھجوانا،نشان چڑھانا، چیکٹ اتروانا، بیاہ مانگنا، اُبٹنا کھیلنا، مانگ بھرنا، مانگ سُونی ہونا، بیٹھے کو ہاتھ لگوانا، خواجہ خضر کی منت ماننا، صدقے کے ماش اور تیل بھیجنا،بی بی کی صحنک، کُونڈا پکانا، نیاز دلوانا، بارہ وفات کی نیاز دلوانا، دہی کھلانا، امام ضامن باندھنا، دہی کا ٹیکا لگانا، ماش کا صدقہ کرنا، کالے تِل کالے ماش صدقہ کرنا، صدقے کی گڑیا دینا،۔۔۔وغیرہ۔

غلام مصطفیٰ خاں نے بھی اپنی کتاب "ثقافتی اردو" میں نسائی رسوم و روایات کی نسبت سے کئی محاورات کی نشاندہی کی ہے جن میں ہندوستانی سماج میں موجود مختلف مواقع پر ادا کی جانے والی رسومات اور اصطلاحات کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے جیسے شہد چٹانا، کھیر چٹانا، رنڈسالہ، رنڈواسے کا جوڑا دینا، چوڑیاں توڑنا، چوڑیاں ٹھنڈی کرنا وغیرہ۔(۵۰)

اردو زبان کے ان محاوروں کو خواص و عام میں قبولِ عام کی سند حاصل رہی اور نہ صرف عام بول چال کی زبان بلکہ اردو شعرا کے شعری مجموعوں میں ایک قابلِ قدر تعداد موجود ہے جس نے ان کے کلام کو بلاغت عطا کی، ذوق اور شاہ نصیر جیسے شعرا نے انھیں اپنی غزلیات میں کثرت سے برتا اور مرزا داغ دہلوی کا کلام ہزارہا محاورات پر مشتمل ہے جسے ولی احمد خان نے جمع کیا اور ایک ضخیم کتاب " محاوراتِ داغ " کے نام سے مرتب کی۔

محاورے کی خاص خوبی جو اسے شعری و نثری اصناف میں یکساں مقبول کرتی ہے وہ اس کا کلامِ جزو بن جانا ہے۔ اسی لیے اس کو غزل اور نظم میں برتنا آسان ہے جبکہ ضرب الامثال یا کہاوتوں کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ وہ اپنے مکمل نحوی وجود کے ساتھ ہی مکمل معنی اور لطف دے سکتی ہیں، اگر ہم کہاوت یا ضرب الامثل کے جملے میں سے کچھ حذف یا تبدیل کریں تو اس کی شکل بگڑ جاتی ہے اور کلام میں نقص پیدا ہو جاتا ہے

اردو زبان کا نسائی پہلو اپنے اندر ایک وسیع دنیا سموئے ہوئے ہے۔ اس کے ہزار ہا رنگ ہیں، نت نئے ذائقے ہیں، سیکڑوں جہات ہیں۔ عورت کی داخلی و خارجی زندگی اس میں سمٹ آئی ہے۔ نسائی زبان کی اس انفرادیت نے اردو زبان کو ہزاروں روزمرہ و محاورات، ضرب الامثال اور کہاوتیں عطا کیں۔ اس کے اندر زبان کا اپنا تہذیبی سفر بھی پوشیدہ ہے اور سماج کا چہرہ بھی، بدلتی ثقافت کے رنگ بھی ہیں اور طبقاتی تمیز کا پردہ بھی۔ عورت کے نفسیاتی مسائل، اس کی سماجی حیثیت، اس کی عائلی زندگی، اس کے معمولات الغرض ہر پہلو کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رؤف پاریکھ، لغات اور فرہنگیں، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۲۱ء ص ۷۵

2. Robin Lakoff, Language and women,s place, department of Linguistics,-University of California,Berkeley,lang sec 2, 45-80.printed in Great Britain.

3. * Sergio Bolaños ,Women's language: a struggle to overcome inequality Cuellar sbolanosc@unal.edu.co Universidad Nacional de Colombia Departamento de Lingüística (At the Collaborative Research Center on Multilingualism of the University of Hamburg, page 138,July 22, 2004

۴۔ عبدالحق، مولوی، عورتوں کی زبان، مشمولہ: اردو میں لسانی تحقیق، عبدالستار دلوی بک ٹاک، لاہور ۲۰۱۸، ص ۱۲۴

۵۔ علامہ نیاز فتح پوری، عورت اور فنون لطیفہ، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۵۳۲

۶۔ ایضاً، ص ۱۲۷

۷۔ www.wright,edu/ chris...htm,code of Hammurabi(1700 B.C.E)

۸۔ مالک رام، حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن، اپنا ادارہ، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۳۲، ۳۳

۹۔ علی عباس جلالپوری، رسومِ اقوام،، تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۸

۱۰۔ علی عباس جلالپوری، روایاتِ تمدن قدیم، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۲۶

۱۱۔ گوپی چند نارنگ، اردو زبان اور لسانیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۶۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۶۵

۱۳۔ قرۃ العین حیدر، جلاوطن (افسانہ)، مشمولہ: پت جھڑ کی آواز، دہلی، ۱۹۶۵ء، ص ۵۸-۵۹

۱۴۔ گیان چند جین، ڈاکٹر، آغازِ نطق سے اردو تک، مشمولہ: اردو میں لسانی تحقیق، عبدالستار دلوی، بک ٹاک لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۴۸

۱۵۔ علامہ نیاز فتح پوری، عورت اور فنونِ لطیفہ ، ص ۱۲۱

16.http://onlinelibrary.wiley.com/doi/10.1525/aa.1888.102.02a00140/pdf

۱۷۔ Imperial Gazetteer of lahore Districtm1883-84, lahore,1889,pp.83,84

۱۸۔ غلام مصطفی سمبل، تاریخ ہند قدیم، فاروق سنز لاہور، س ن، ص ۴۵۲

۱۹۔ عمر زبیری، پروفیسر، قدیم تہذیبیں اور مذاہب، علی فرید پرنٹرز لاہور ۲۰۰۹ء، ص ۴۸

۲۰۔ ابن بطوطہ، عجائب الاسفار، اُردو ترجمہ، ۱۹۳۸ء، ص ۹۳، ۸۳

۲۱۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، ص ۴۸

۲۲۔ روتھ بینی ڈکٹ، نقوشِ ثقافت، (مترجمہ) سید قاسم محمود، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۰

۲۳۔ گوپی چند نارنگ، اردو زبان اور لسانیات، ص ۵۹-۶۰

۲۴۔ علامہ نیاز فتح پوری، عورت اور فنونِ لطیفہ، ص ۳۲۱

۲۵۔ خالد سہیل، ڈاکٹر، مغربی عورت ادب اور زندگی، سٹی بک پوائنٹ کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۴۰۱

۲۶۔ وحیدہ نسیم، عورت اور اردو زبان، غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۱۹۹۴ء، ص ۲۲

۲۷۔ علامہ نیاز فتح پوری، عورت اور فنونِ لطیفہ، ص ۱۵۰

۲۸۔ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، جلد اوّل، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۹ء ص ۱۷

۲۹۔ ایضاً، ء ص ۱۷

۳۰۔ ایضاً، ص ۱۹

۳۱۔ وحیدہ نسیم، عورت اور زبان، ص ۲۲

۳۲۔ ur.wikipedia.org/wiki/;1/2/2020, 10:03am

۳۳۔ تمکین کاظمی (مرتبہ)، تذکرہ ریختی، شمس الاسلام پرنٹرز، حیدر آباد دکن، ۱۹۳۰ء، ص ۱۴۔۱۵

۳۴۔ مجید یزدانی، سعادت یار خان رنگین، مشمولہ: تاریخ ادبیات، مسلمانانِ پاکستان و برِ صغیر پاک و ہند (ساتویں جلد اردو ادب دوم،) پنجاب یونی ورسٹی لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۳۲۵

۳۵۔ صابر علی خان، ڈاکٹر، سعادت یار خان رنگین، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۶ء، ص ۴۰۶

۳۶۔ جان صاحب، دیوان ریختی، مرتبہ، فاروق ارگلی، فرید بکڈپو لمٹیڈ، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۲۸۲

۳۷۔ محسن خان محسن، دیوان رنگیلی بیگم، مرتبہ، فاروق ارگلی، فرید بکڈپو، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۳۴۳

۳۸۔ وحیدہ نسیم، عورت اور اردو زبان، صفحہ نمبر ۱۷۴

۳۹۔ محمد حسین آزاد، مولانا، آب حیات، غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۵۴ء، ص ۲۵۱

۴۰۔ ایضاً ص ۲۵۱

۴۱۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے ۱۸۵۷ تک)، ص ۴۷۰

۴۲۔ صابر علی خان، ڈاکٹر، سعادت یار خان رنگیں، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۴۱۰

۴۳۔ ایضاً، ص ۴۱۰

۴۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس کے آئینے میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۰۳

۴۵۔ ایضاً ص ۵۹-۶۰

۴۶۔ شفقت رضوی، (مرتبہ) دیوان مہ لقاچندا، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۰ء ص ۵۱

۴۷۔ مہ لقاچندا، دیوان مہ لقاچندا، (مرتب) شفقت رضوی، مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۹۰، ص ۵۲، ۵۱، ۵۰

۴۸۔ شفقت رضوی، (مرتب) دیوانِ مہ لقاچندا، ص ۵۵

۴۹۔ برج موہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، انجمن، ترقی اردو (ہند) دہلی، بھارت، ۱۹۷۵، ص ۱۳۵، ۱۳۴

۵۰۔ غلام مصطفیٰ خاں، ثقافتی اردو، ادارہء فروغِ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۲۲، ص ۲۶-۲۷

باب دوم

نسائی زبان و محاورہ کے لسانی تناظرات

الف) اردو قواعد و لغات میں نسائی الفاظ و محاورات (۱۸۵۷ء سے قبل)

انسان نے اس دنیا میں جہاں اور بے شمار علوم و فنون کے حوالے سے قابلِ قدر ایجادات و دریافتوں کا سفر جاری رکھا وہاں اس کا بہت بڑا کارنامہ زبان کی ایجاد و ارتقا بھی سمجھا جاتا ہے۔ زبان نے معاشرتی زندگی کو مربوط و منظم کرنے اور خیالات و تجربات کے ساتھ ساتھ علوم و فنون کی ترویج میں بھی نمایاں ترین کردار ادا کیا ہے۔ اور اسی زبان کو محفوظ کرنے، اس کے مفاہیم کی وضاحت کرنے کے لیے لغات اور قواعد کے مجموعے مرتب کیے جاتے رہے ہیں۔

لفظ کا استعمال ہی اس لفظ کو زندگی دیتا ہے اس کا استعمال کم ہوتے ہوتے ختم ہو جائے تو وہ متروک الفاظ کہلاتے ہیں۔ ایسے الفاظ پھر صرف لغات و فرہنگ میں دیکھے جاسکتے ہیں جو اپنے عہد کی تحاریر اور ادب کے نمونوں کی تفہیم کے کام آتے ہیں۔ خلیل صدیقی اسی حوالے سے "زبان" کا ارتقا" میں لکھتے ہیں کہ الفاظ کے اصل خالق افراد ہی ہوتے ہیں لیکن ان الفاظ کو زندگی سماج کے قبولِ عام سے ہی ملتی ہے۔ زبان کا رشتہ انسانی زندگی سے گہرا ہوتا ہے۔ ضرورت اور وسعت کے ساتھ ساتھ زبان پھلتی پھولتی ہے۔ اور یہ نسلاً در نسلاً منتقل اور متغیر ہوتے رہنے کا نتیجہ ہے۔[1] اردو زبان میں دیگر زبانوں کا عمل دخل بہت زیادہ رہا ہے اس میں عربی، فارسی، سنسکرت، برج بھاشا، پنجابی، گجراتی، ترکی، سریانی و ہریانی جیسی زبانوں کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ آئے دن ان میں تبدیلیاں بھی آتی رہتی ہیں لیکن اب ہم ان سب الفاظ کو اردو کے الفاظ ہی کہتے ہیں اور ان کی اصل بنیاد کا پتا لغات سے ہی چلتا ہے۔

لغت اس کتاب کو کہتے ہیں جس میں کسی ایک زبان کے تمام تر الفاظ بترتیب حروفِ تہجی اندراج کیے جاتے ہیں اور ان کے سامنے ان کے معنی، اشتقاق، مترادفات اور تلفظ بھی درج ہوتے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس کو ڈکشنری کہتے ہیں اور فارسی میں فرہنگ، عربی میں قاموس، ہندی میں شبد کوش کہا جاتا ہے۔ شان الحق حقی نے آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری میں لغت کے معنی ایک ایسی کتاب جس میں الفاظ کے معنی درج

ہوں یا کسی دوسری زبان میں ان الفاظ کے مترادفات لکھنے کے بیان کیے ہیں۔ لغت کی ایک جامع تعریف فرہنگِ عامرہ میں کچھ یوں درج ہے کہ:

"لغت ایک ایسی کتاب ہوتی ہے جس میں بالعموم کسی زبان کی بامعنی اکائیاں (الفاظ) جس میں ان کا املا، تلفظ، قواعدی حیثیت، معاشرتی طور پر قبول معنی، (حقیقی، مجازی، اصطلاحی) کے حوالے سے معلومات،(بعض اوقات اشتقاق، ماخذ اور کسی اہم واقعے کی تفصیلات بھی اپنے اندر سموئے ہو سکتی ہے۔"(۲)

فرہنگ لاطینی زبان کا لفظ ہے جسے گلوسری Glossary کہتے ہیں جس کا مطلب حاشیہ یا تشریح بھی لیا جاتا ہے اس میں کسی خاص موضوع پر لکھے الفاظ کے معنی درج ہوتے ہیں اور اس کو ترتیب دینے کا انداز بھی ضرورتاً مختلف ہو سکتا ہے یعنی کسی خاص نقطہ نظر سے اس کو ترتیب دیا جا سکتا ہے۔ عام لغت میں الفاظ کے تمام معنی درج ہوتے ہیں جبکہ فرہنگ میں اتنی عمومیت اور وسعت نہیں ہوتی جتنی لغت میں ہوتی ہے۔ کیونکہ لغت تمام الفاظ کے تمام معنی کا احاطہ کرتی ہے بشمول متروک الفاظ کے اور فرہنگ کسی خاص کتاب، موضوع، اصطلاحات یا علوم پر بھی مشتمل ہوتی ہیں جیسے بچوں کی فرہنگ، محاورات کی فرہنگ، ضرب الامثال کی فرہنگ، مقولوں کی فرہنگ وغیرہ۔

میسوپوٹیمیا سے ساتویں صدی قبل مسیح کے دور کی فرہنگ کے نقوش ملتے ہیں۔ لغت نویسی ہر لکھی جانے والی زبان میں تاریخ کا حصہ ضرور رہی ہے۔ اردو معارف اسلامیہ، دانش گاہ کے مطابق لغت نویسی میں قدامت کا سہرا عرب قوم کے سر باندھا جاتا ہے قدیم آشوریوں سے لغت نویسی کا آغاز ہوا اور جدید تحقیق کے مطابق قدیم آشوری دراصل قدیم عربی ہی تھے۔ جبکہ چین اور یونان میں بھی عربوں سے پیشتر لغت نویسی کے آثار ملتے ہیں۔ یونانیوں کی قدیم ترین لغت کو یولیوس پولکس کی مرتب کردہ ہے۔ البتہ اس کام میں زیادہ توجہ اور ارتقائی مہارت عربوں میں ہی ملتی ہے۔ انھوں نے ہر فن اور ہر طبقے کے لیے لغات و فرہنگ تیار کیے۔

"فرہنگِ عامرہ" میں لغات و قواعد کی تاریخ کے مطابق برِ صغیر پاک و ہند کی سرزمین کو اس معاملے میں بھی تاریخی حیثیت حاصل ہے کہ زبان و قواعد نویسی کے حوالے سے سب سے قدیم کتاب کا تعلق اسی سرزمین سے ہے اور پہلا ماہرِ زبان پانینی ہے اس کے اس مخطوطہ کا زمانہ چھ صدی قبل مسیح یا چار صدی قبل مسیح کا بتایا جاتا ہے۔ فرہنگِ عامرہ میں درج ہے۔

> "زبان و لسانیات کے محققین کے مطابق زبان کے قواعد کی سب سے پہلی اور باقاعدہ کتاب کی تصنیف اسی خطے میں ہوئی جسے پانینی نے چار صدی قبل تحریر کیا۔ بعض محققین کے مطابق گرامر کی اس کتاب کا عرصہ تصنیف چھ سو قبل مسیح ہے۔ ان دونوں تحقیقات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے یا کسی ایک کو بربنائے دلائل درست مان لینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پانینی ہی دنیا کا سب سے پہلا ماہرِ لسان اور قواعد نویس ہے۔ پانینی کی اس کتاب کا جو مخطوطہ سترہویں صدی عیسوی میں کشمیر کے نواح سے دریافت ہوا وہ برچ (ایک درخت کا نام) کی لکڑی سے تیار کردہ ایک طرح کی ڈونگی پر تحریر کیا گیا ہے۔"[۳]

معروف عالم اور علمِ عروض کے ماہر خلیل بن احمد کی مرتب کردہ لغت "کتاب العین" کو تدوینِ لغت میں اولیت حاصل ہے۔ یہ حروفِ تہجی کے بجائے مخارج حروف کی ترتیب کو پیشِ نظر رکھا۔ بعد میں مختلف زبانوں میں مرتب ہونے والی لغات کو یا تو معنی کی ترتیب سے یا الفاظ کے حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا جاتا رہا۔

جب ہم برِ صغیر پاک و ہند کی سرزمین پر لغت نویسی کے آغاز کا سراغ لگاتے ہیں تو ہمیں دو بڑی ضروریات مقاصد کے طور پر ملتی ہیں ایک تجارتی اور دوسری تبلیغی۔ یہی مقاصد اوّل اوّل مرتب کی جانے والی لغات اور قواعد کا جواز بنے اور طویل مدت تک "برِ صغیر پاک و ہندی انگریزی" کے درمیان تفہیم کا کردار ادا کرتے رہے۔ رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اردو" میں لکھتے ہیں جہاں مستشرقین نے کتاب درسی اور تراجم پر زور دیا وہاں صرف و نحو اور لغات کی طرف بھی توجہ مبذول کی ان کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے برِ صغیر پاک و ہندی گرامر وہ ہے جو ۱۷۱۵ء میں جان جوشوا کیٹلر نے تصنیف کی تھی۔[۴]

ان میں بول چال کی زبان اور محاورات کا اندراج کیا گیا اردو کے الفاظ و محاورات کی فارسی، انگریزی اور عربی زبان میں مترادفات و معنی بیان کیے گئے۔ معنوی سے زیادہ تشریحی وضاحت کا طریقہ اپنایا گیا۔ ان میں زیادہ تر لفظ یا محاورے کے شعری استعمال کو بطور سند لیا گیا۔ اگرچہ یہ تالیفات و اندراجات کا سرمایہ بہت قابلِ قدر اور قابلِ ستائش ہے مگر اس کو اردو زبان کا جامع ذخیرہ نہیں کہا جا سکتا۔

سید حامد حسن قادری نے "داستانِ تاریخ اردو" میں ابن بطوطہ کے سفر نامے میں بہت سے اردو الفاظ کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ابنِ بطوطہ طنجہ افریقہ کا رہنے والا تھا اور اس کی مادری زبان عربی تھی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں ۱۳۳۳ء میں برِ صغیر پاک و ہند آیا اور عربی زبان میں اپنا سفر نامہ لکھا۔ اس نے پردہ، پروانہ، بارگہ، سراچہ، ناخدا وغیرہ فارسی الفاظ کے ساتھ بہت سے اردو کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں مثلاً ٹٹو، منڈی، ڈولہ، کہار، کنگھر۔ ان الفاظ کے ہندی حروف کو عربی حرف سے بدل لیا ہے۔ بعض جگہ الفاظ میں تغیر بھی کر لیا ہے جیسے کشری (کھچڑی)، جوتری (چودھری) جوکہ (جوگی) کتارہ (کٹارہ)۔ء میں ملا نذر محمد دہلوی نے فارسی لغت "ادات الفضلا" لکھی۔ خلیل الرحمن داؤدی لکھتے ہیں کہ مسٹر لے بی ڈف مدارس میں آیا وہ ایک بینڈ ماسٹر تھا اور تقریباً دو سال تک یہاں رہا پھر کلکتہ جا کر اس نے کسی پنڈت سے برِ صغیر پاک و ہندی، بنگالی اور سنسکرت زبان سیکھی۔

> " تھوڑے زمانے کے بعد ہی اس نے دو ناٹکوں کو بنگالی زبان کا جامہ پہنایا ان میں سے ایک ناٹک پبلک میں بہت مشہور ہوا، ایڈلنگ کے بیان کے مطابق اس کے بعد وہ دربار میں دربارِ مغلیہ میں تھیٹر کا مہتمم مقرر ہو گیا اس طرح اس نے مشرق میں بیس سال گزارے اور واپس انگلستان چلا گیا۔ لندن میں اس نے اپنا "رسالہ قواعد "شائع کیا اور اس کی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید بہ نسبت برِ صغیر پاک و ہندی زبان کے اس کا علم بنگالی اور سنسکرت میں زیادہ ہو کیونکہ اس نے برِ صغیر پاک و ہندی گرامر میں نہ صرف الفاظ کا تلفظ غلط لکھا ہے بلکہ قواعد کے بیان کرنے میں بھی بہت سی ساری غلطیاں کی ہیں۔"(۵)

قوام الدین ابراہیم فاروقی نے بنگال میں ۱۴۴۸ء میں "شرف نامہ" کے نام سے فارسی لغت مرتب کی۔ ان کے بعد " موید الفضلا" کا نام آتا ہے جس لغت میں پہلی بار فارسی الفاظ کی تشریح اور الفاظ کے مترادفات اردو میں لکھے گئے تھے

یہاں ہم کبیر داس کو فراموش نہیں کر سکتے کیونکہ یہ ان کا عہدِ حیات بھی تھا جب ۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۸ء کے درمیان انھوں نے اپنے پند آمیز دوہوں اور اشعار میں اردو زبان اور محاورات کو برتا جیسے:

دین گوایو دنی سے، دنی نہ آیو ہاتھ (دنی، دنیا)

پیر کلہاڑی مار لو گا پھل اپنے ہاتھ (گا پھل، غافل)

ہم کہہ سکتے ہیں کہ بر صغیر میں اردو زبان کی بنیادوں میں لغات و فرہنگ کے حوالے سے بھی فارسی زبان ہی روایت مرتب کرتی ہے اور ایک تدریجی معیارات کی رہنمائی کرتی ہے جس نے اردو زبان کی لغات اور فرہنگ مرتب کرنے میں رہنمائی فراہم کی۔

بحر الفضائل " کے علاوہ " موید الفضلا" میں بھی عربی و فارسی کے علاوہ ہندی الفاظ شامل تھے۔ ان فرہنگوں کی حیثیت زبان سکھانے والے قاعدوں کی سی تھی۔ مگر اردو زبان کے اولیں آثار ان میں ملتے ہیں جو آج بھی بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ "بحر الفضائل " کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ اگرچہ یہ لغت عربی فارسی زبان کے الفاظ پر مشتمل ہے مگر اس کے باب چہارم میں ہندی الفاظ، علوم و فنون وغیرہ کا تذکرہ ہے۔ اور وہ الفاظ اردو میں بھی ابھی تک رائج ہیں۔ ڈاکٹر عابدہ بتول "اردو لغت نویسی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ " میں لکھتی ہے:

> "مصنف نے اسے مرتب کرتے وقت ہندوی علوم و فنون، اصطلاحات اور مختلف چیزوں کے مروج ناموں کو ذہن میں رکھا ہے۔ ایک فصل میں برِ صغیر پاک و ہند کے پھولوں کے نام دیے گئے ہیں۔ ان میں اکثر اردو زبان میں مستعمل ہیں۔ حافظ محمود شیرانی کے بقول بلخی نے ڈھائی سو سے زیادہ ہندی الفاظ فارسی و عربی الفاظ کی تشریح کی غرض سے اپنی تالیف میں داخل کیے ہیں۔ ان میں نصف سے زائد ایسے ہیں جو اج بھی اردو میں بغیر کسی رد و بدل کے بعینہ رائج ہیں۔ "(٦)

اس طرح کے قواعد کی کتب اور مخصوص اصطلاحات پر مبنی فرہنگ میں سے چند نام جو معروف رہے وہ "رازق باری"، اللہ باری" صنعت باری"، " واسع باری"، نعمت باری"، اور قادر باری" ہیں۔ ایک " خالق باری" نامی تالیف مدارس میں بطور نصاب بھی شامل رہی۔ مگر ابھی تک چونکہ اردو زبان کو ایک مکمل زبان کا کوئی درجہ حاصل نہیں ہوا تھا اس لیے اس میں نسائی زبان و محاورات کے حوالے سے کوئی خاص تخصیص برتی جانے یا درج کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

نصاب ناموں کے حوالے سے ایک نمایاں ترین نام "خالق باری" از امیر خسرو کا ہے جو اپنے عہد کی زبان کے اردو فارسی کے ملاپ کا بہترین نمونہ قرار دی جا سکتی ہے۔ "خالق باری" سے چند مثالیں پیش ہیں۔

خواہم گفت کہونگامیں۔۔۔۔۔خواہی گفت کہیگا تیں

خواہم گفت کہونگامیں۔۔۔۔۔خواہی گفت کہیگا تیں

خواہم دید دیکھونگامیں۔۔۔۔۔خواہی دید دیکھیے گا تیں

"جامع الغات" میں امیر خسرو کے نصاب نامے "خالق باری" کی بابت خواجہ عبد المجید لکھتے ہیں کہ امیر خسرو نے جو جو پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، گیت وغیرہ رقم کی ہیں وہ اس عہد کی زبان و تصورات اور سماجی زندگی کی مثالیں ہیں۔

خسرو وہ برِ صغیر پاک وہندی شاعر کہے جاسکتے ہیں جنھوں نے نسائی زبان و لہجے کو برتا اور اپنے شعری تصورات کو عورت کا زبان و محاورہ عطا کیا۔ان کے گیت جیسے "چھاپ تلک سب چھین لی رے موسے نیناں ملائی کے"

اور واقعاتی پس منظر کے ساتھ "انمل" کی مثال کہ: کھیر پکائے جتن سے چرخہ دیا جلا، آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا" وہ مثالیں ہیں جو عورت کی زبان کو اردو زبان کا حصہ بناتی چلی گئیں اور معاشرتی زندگی میں عورت کے تجربات اور اس کے جذبات کی نمایاں عکاسی بھی کرتی رہیں ۔خواجہ عبد المجید لکھتے ہیں۔

علاوہ ازیں کئی اور پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں ایسی ہیں جو ملکی زبان میں رائج ہیں۔ مثلا

بچھو۔ آگے سے وہ گانٹھ گنٹھیلا پیچھے سے وہ ٹیڑھا

ہاتھ لگائی قہر خدا کا، بُوجھ پہیلا میرا

پھُوٹ۔ کھیت میں اُپجے سب کوئی کھائے، گھر میں ہووے گھر کھا جائے

پسینہ۔ دھوپوں سے وہ پیدا ہووے، چھاؤں سے مر جائے

اے ری سکھی میں تجھ سے پوچھوں، ہوا لگے مر جائے

پان۔ بن ٹھن کے سنگھار کرے، دہ ہر منہ پر پیار کرے

پیار سے منہ پہ دیت ہے جان۔ اے سکھی ساجن نہ سکھی پان

پانی۔ وا بن منہ کو چین نہ آوے وہ میری تس آن بجھاوے

ہے وہ سب گن بارہ بانی، اے سکھی ساجن نہ سکھی پانی

دوسخنے:۔

روٹی جلی کیوں، گھوڑا اڑا کیوں، پان سڑا کیوں۔۔۔ پھیرا نہ تھا
انار کیوں نہ چکھا، وزیر کیوں نہ رکھا۔۔۔ دانا نہ تھا
گوشت کیون نہ کھایا، ڈوم کیوں نہ گایا۔۔۔ گلا نہ تھا"(۷)

البتہ "غرائب الغات" جسے عبد الواسع ہانسوی نے تالیف کیا اس کو بعد میں آنے والے ناقدین و محققین نے خاص طور پر موضوع بنایا اور اس کے معائن و محاسن بیان کیے۔ڈاکٹر سید عبد اللہ اردو زبان کے حوالے سے خیال کرتے ہیں کہ اردو زبان میں قدیم ترین لغت عہدِ عالمگیری میں مرتب ہوا جسے "غرائب الغات" کہا جاتا ہے۔اسی "غرائب الغات" کو بعد میں سراج الدین علی خان آرزو نے ۱۷۵۰ء میں "نوادر الالفاظ" کے نام سے تدوین کیا۔

اس کے تقریباً چالیس برس بعد ۱۷۹۲ء میں مرزا جان طپش دہلوی کی "شمس اللبیان فی مصطلحات برِ صغیر پاک وہند" کے نام سے ۹۶ صفحات پر مشتمل لغت ان کی وفات کے بعد شائع کی گئی جس میں اردو محاورات والفاظ کی تشریح کے طور پر پورے پورے اشعار یا مصرعے شامل کیے گئے۔اس کے ٹائٹل پر بھی لکھا تھا کہ:

"شمس اللبیان در علمِ لغت مشتمل بر لغات و محاورات اردو با سند اشعار فصحا
وَبلغاء برِ صغیر پاک وہند از مصنفات مرزا طپش جان مرحوم در مطبع آفتاب
عالم تاب واقع بلدہء مرشد آباد و محلہ قطب پور طبع شد۔"(۸)

"اردو کتب خانہ آصفیہ" میں نصیر الدین ہاشمی لکھتے ہیں کہ اس کی خاص بات کہ اس لغت میں اندراجات کو ردیف وار جمع کیا گیا الفاظ و محاورات اردو کے تھے اور تشریح فارسی میں کی گئی۔مثال کے طور پر:

ادھیڑ بننا، ادھیڑ بن، قرآن کرنا۔ جگ بسرام کرنا، بک بک کرنا، ہاتھوں ہاتھ لے جانا، ہاتھ لگانا، رات کا بھیگتے جانا، بھاری پتھر اٹھانا، بھاری پتھر چوم کر رکھ دینا، ہاتھ پتھر تلے دینا، ہوا پھرنی، ہوا لگنی، بستر باندھنا، اور بے شمار محاورات شامل ہیں اور ہر محاورے کو اس کی اصل شکل کے بجائے اس کے شعری استعمال کی صورت میں ہی درج کیا گیا ہے جیسے ہاتھ لگنا کا محاورہ اگر شعر میں "ہاتھ لگنے" کے طور پر استعمال ہوا تو لغت میں بھی "ہاتھ لگنے" کے عنوان کے تحت ہی تلاش کیا جائے گا نہ کہ "ہاتھ لگنا" کے بطور۔اس میں ایک اور خاص بات یہ بھی تھی کہ یہ پہلی برِ صغیر پاک وہندی اردو لغت تھی جس میں اردو زبان کی ہنکاری آوازوں جیسے "بھ، تھ، ٹھ، لھ، پھ، جھ، چھ، وغیرہ کو بطور حروف اندراج کیا گیا۔زمانی اور مکانی سفر میں ہمیں بھگت کبیر پندرہویں صدی میں نمایاں نظر آتا ہے۔ان کے ہاں بھی نسائی رنگ کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔

دوجا صاحب میرا یک ہے دوجا کہا نہ جائے
دو صاحب جو کہوں صاحب کھرا رسائے
سوئی میرا ایک تو اور نہیں دو جا کوئے
جو صاحب دوجا کہے دوجا کل کا ہوئے
مالی آوت دیکھ کر کلیاں کریں پکار
پھولی پھولی جن لیے کال ہماری بار

زبان کے اس سفر میں اگرچہ کوئی نسائی قلم موجود نہیں نہ کسی عورت کی نثری اصناف کا تذکرہ تاریخ کی کتب میں ملتا ہے مگر پھر بھی نسائی زبان مرد قلم کاروں اور اہل علم وادب اہل تصوف اہل فکر و فن اور شعراء کی تحاریر میں ضرور موجود رہا ہے۔ وہ تہذیبی عوامل کوئی بھی رہے ہوں ارتقائی سفر کیسے بھی طے ہوتا رہا ہے۔ اس ارتقا کے لسانی سفر میں ہم جہاں قواعد و زبان دانی کی کتب میں "خالق باری" کا تذکرہ نظر انداز نہیں کر سکتے جو امیر خسرو کا ایک معتبر حوالہ ہے وہاں ہم اُجے چند بھٹناگر سپر دنی چند، سکندر آباد کا ۱۵۵۲ء میں شائع ہونے والا منظوم رسالہ جو "خالق باری" کی طرز پر لکھا گیا۔ مولوی عبدالحق نے اس کے سرورق پر نام نہ ملنے کے باعث اسے "مثل خالق باری" کا نام دے دیا اس کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے اس میں انتیس عنوانات ہیں جیسے فراش خانہ، فراط، آب دار خانہ، فیل خانہ وہاں مطبع خانہ بھی ہے جو نسائی حیات و معمولات پر روشنی ڈالتا ہے۔
مطبع خانہ سے چند اشعار:

مطبع خانہ کہوں رسوئی، ہانڈی دیگہ کفچہ ہے ڈوئی
دال تمام معروف بدانی، چاول نام برنج بخوانی
روغنِ زرد جو گھی کہو، شیر بنوش دودھ ہی پیو
شکر شیرینی، کھانڈ مٹھائی، تبر خرخرہ ترش کھٹائی
نمک دار در ہندوی سلونا، تلخ شدہ ہے کڑوا ہونا
مزہ سواد، خوب ہے نیکا، بدان بے نمک ہندوی پھیکا[۹]

جو عمل واعظ لال اردو زبان کی تاریخ میں لکھتے ہیں زبان چونکہ کوئی شخص ایجاد نہیں کر سکتا اگر چند افراد مل کر خاص محاورے اور الفاظ ایجاد بھی کریں تب بھی انہیں اگر عوام قبول نہیں کرتے تو وہ زبان کا جزو نہیں بن سکتے، اصلی ٹکسالی وہی ہے جس نے خاص و عام میں مقبولیت اور رواج پایا ہو"۔[۱۰]

روز مرہ اور محاورے کے حوالے سے اہلِ زبان کی سند لازمی قرار دی جاتی ہے اور ان کی اصل اہمیت ہی اسی باعث ہے۔ محاورے کا سارا حسن ہی اس کے لغوی اور اصل معنوں سے ہٹ کر اس کے مجازی معنوں میں پوشیدہ ہے۔ خواتین کی زبان میں استعاراتی انداز و مفاہیم نے محاورے کے حسن کو دوچند کر دیا ہے۔ نذیر احمد تشنہ "اردو ضرب الامثال میں" لکھتے ہیں:

"روز مرہ میں محاورہ بڑا اہم ہے محاورے کے لغوی معنی بات چیت کرنے کے ہیں لیکن قواعد میں دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا مجموعہ ہوتا ہے محاورے میں مصدر اپنے حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی میں استعمال ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ محاورے میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں سمجھا جاتا تاہم مصدر کے تمام مشتقات استعمال کیے جاسکتے ہیں محاورے کے بر محل استعمال سے کلام میں حسن، زور، اثر، معنوی گہرائی، ایجاز اور اختصار پیدا ہو جاتا ہے۔ محاورہ کلام کا جزو بن کر اس میں جذب ہو جاتا ہے اور اگر اسے اس کلام سے الگ کریں تو وہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے مثلاً "اس کے آب و دانہ اٹھ جانے کے ساتھ ہی رشتہ داروں نے آنکھیں پھیر لیں اس کا دماغ آسمان پر تھا جب میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا وغیرہ"[۱۱]

عورت کی زبان میں کہاوتوں اور ضرب الامثال کا اپنا ہی حسن ہے اور ایمائیت کا انداز اس نزاکت کو بڑھا دیتا ہے۔ آج جن محاورات اور ضرب الامثال کو ہم پڑھتے ہیں ان میں ایک خاص تہذیبی جھلک ہمارے سامنے ماضی کے دریچے کھول دیتی ہے اور ہمارے سامنے رمز و کنایہ اور نکتہ آفرینی کی تہذیبی رچاؤ میں بسی دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ سید ضمیر حسن دہلوی لکھتے ہیں: "عورتوں کی زبان و محاورات پر نظر ڈالیے تو آنکھوں کے سامنے رمز و کنایہ کا ایک چمن ہو گا، ان کی صناعی طباعی کا جوہر منہ بند کلیوں کی طرح کھلتا اور خندہ گل کی طرح مہکتا نظر آئے گا۔[۱۲]

وہ مزید لکھتے ہیں کہ زبان کی شان اس کے محاورات اور ضرب الامثال ہوتے ہیں اور ان میں ہماری زندگی کے سماجی و ثقافتی پہلو نمایاں طور پر موجود ہوتے ہیں۔ ان تصورات کی ایک تاریخی اہمیت ہوتی ہے ایک عہد کی کہانی ان میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ زبان کی خوبی کی بابت سید ضمیر حسن دہلوی لکھتے ہیں کہ یہ سلاست، نرمی اور موزونی پر مشتمل ہے۔ اس میں سماج کے تصورات سے لے کر تجربات تک سب کچھ سما جاتا ہے۔ ان کا یہ بھی

کہنا ہے کہ عام لوگوں کی زبان کو پایہ اعتبار سے گرانا زبان کے زوال اور عدم مقبولیت کا سبب بن سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"بیگمات نے اپنے محاوراتی اسلوب میں مجاز و مبالغہ تشبیہ اور تمثیل مصوری اور محاکات اور رمزیت اور اشاریت کے سارے جوہر محفوظ کر لئے تھے اس لئے جب ہم ان کی صدائے بازگشت سنتے ہیں تو بے قرار ہو جاتے ہیں۔ اظہارِ خیال اور ادائے مطلب میں پیچیدگی سے بچنے کے لئے بول چال کی زبان اور روزمرہ اور محاورے کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ زبان کا ذوق رکھنے والوں نے ادبی شہ پاروں میں محاورات پر ضرور نظر کی ہوگی۔"(۱۳)

"فرہنگ آصفیہ "کی بابت محمد حسین آزاد نے " مقالات "مرتبہ آغا محمد باقر مجلس ترقی ادب لاہور میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں (جو ۱۹۸۷ء میں لکھا گیا تھا) کہ فرہنگِ آصفیہ اصطلاحات اور محاورات کے لیے جامع نمونہ ہے اور تذکیر و تانیث کا فرق بھی پتا چلتا ہے اور "زنانہ محاورات کو بھی لکھا ہے اور ہر جگہ توضیع کر دی ہے تا کہ ناواقف مرد عورتوں کا محاورہ بول کر اہل زبان کے جلسے میں ندامت نہ اٹھائیں۔"(۱۴)

ڈاکٹر رؤف پاریکھ " اردو لغت نویسی "میں لکھتے ہیں:

"فیلن کے ساتھ حاصل کیا گیا تجربہ ان کے بہت کام آیا البتہ یہ ضرور ہے کہ سید صاحب موصوف کو الفاظ اور محاورات جمع کرنے کا جو شوق ہو گیا وہ بھی فیلن کی صحبت کا اثر ہے۔ ایسے الفاظ اور محاورات لوگوں سے پوچھ پوچھ کر اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر درج لغت کرتے تھے۔ اگرچہ یہ بھی قابل اعتراض نہ ہونا چاہیے کیونکہ فحش الفاظ و محاورات بھی بہر حال زبان کا حصہ ہوتے ہیں اور طب قانون، فقہ، لغت میں کوئی لفظ فحش نہیں ہوتا کیوں کہ یہاں نیت علم اور تحقیق کی ہوتی ہے۔"(۱۵)

رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اردو" میں سید احمد دہلوی کی کتاب "ہادی النسا" کی مقبولیت کی بہت تعریف کی اور اس کے بعد "پیشہ وروں کی اصطلاحات" میں تحقیق الکلام اردو زبان کے نکات متعلق کہتے ہیں: "ریت بکھان اہل ہنود کے رسوم و رواج کے متعلق "ناری کتھا" ہندو عورتوں کی بولی قواعد اردو" تعلیم نسواں

اور عورتوں کے متعلق ان کی حسب ذیل کتابیں بہت مشہور ہیں "لغات النساء"، "تحریر النساء"، "راحت زمانی کا قصہ"، "علم النساء"، "رسوم دہلی"، "اردو ضرب الامثال" اور "روز مرہ دہلی"۔

سید وقار عظیم "فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ" میں انگریزی برِ صغیر پاک وہندی ڈکشنری مطبوعہ ۱۷۹۰ء کے بابت لکھتے ہیں کہ اپنی نوعیت کی یہ انوکھی ڈکشنری ڈاکٹر گلکرسٹ کی کئی سالہ محنت کا نتیجہ تھی۔ اور اس کی تیاری میں انھوں نے اپنے عہد کے ماہرینِ زبان سے مدد حاصل کی۔

دلی کالج کی ایک معروف شخصیت مولانا نذیر احمد بھی ہیں جن کی بابت ان کے اپنے الفاظ ہیں کہ اگر میں کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو مولوی ہوتا تنگ خیال، بہت متعصب، اکل کھرا، اپنے نفس کے احتساب سے فارغ دوسروں کے عیوب کا متجسس برخود غلط، مسلمانوں کا نادان دوست تقاضائے وقت کی طرف سے اندھا بہرا ہوتا۔ "مولانا کی مشہور تصنیفات میں مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوع، ابن الوقت، محصنات، ایامیٰ، رویائے صادقہ، امہات الامہ، اجتہاد صرفِ صغیر، چند پند، مادی الحکمۃ، وغیرہ شامل ہیں۔"[(۱۶)]

پنڈت من پھول نے بھی دلی کالج سے ۱۸۴۵ء تا ۱۸۴۸ء کے دوران جو قابل قدر تالیفات اردو زبان کو عطا کی ان میں زبان اور لسان کی تعلیم وتربیت کو خاصی اہمیت دی ان کی تالیفات میں "تعلیم النساء" اور تذکرہ النساء شامل ہیں مولوی احمد علی کا تعلق بھی دلی کالج سے تھا جہاں انہوں نے ابتدائی اردو قواعد پر مشتمل "چشمہ فیض" کے نام سے کتاب تالیف کی انہی کے ہم عصر اور دہلی کالج کے ساتھ ہی مولوی سبحان بخش نے "محاورات اردو" کے نام سے اردو زبان کے محاورات کی جمع آوری کی۔

اس مثال میں اگر زبانوں اور بولیوں کی آمیزش کا تجزیہ کیا جائے تو انشاء اپنے دعوے میں پورے اترتے نظر آئیں گے نا حق ناحق پوربی سے، اپنا سر کٹوانا پنجابی سے، کاہے کو برج سے اردو میں آئے ہیں۔ "دریائے لطافت" میں ہمیں دلی کے مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کی زبان کا ذائقہ ملتا ہے اس میں کہیں پنجابی، کہیں برج، کہیں ہریانوی کہیں کھڑی بولی کے الفاظ شامل ہیں۔

ان کے لہجے میں فرق ضرور تھا مگر سب ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہ تھیں۔ الفاظ و محاورات ایک دوسرے سے مختلف ضرور تھے مگر سب ایک دوسرے کی بولی کو سمجھتے تھے "دریائے لطافت" سے ایک اقتباس پیش ہے: "جانے میری بلا کہ کس ایسی تیسی کا دوپٹہ اور دو روپے جاتے رہے ہیں اور کون کافرے پیر لے گیا ہے جس پر چوری کا الزام ثابت ہوں گے اس کی اس کی شوق سے لپوا اتار لو اور مشکیں باندھ کر کوڑے

لگاؤ۔"(۱۷) مزید اسی زبان بابت ایک اقتباس ملاحضہ کیجیے جس میں برِ صغیر پاک و ہندی زبان بلکہ دلی کے گلی کوچوں کی زبان کی چاشنی موجود ہے۔

"چھٹے منہ تیرا اچڑیا کے کل یاروں سے چوری چوری نندا بنیے کی بیٹی سے مساس کر رہا تھا۔ حضرت علی مرتضی علیہ السلام کی قسم میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا دل میں آیا تھا کہ پیچھے سے آکر ایک دھپ لگاؤں۔ لیکن میں نے کہا یار ہے کیا ستاؤں، اصل تو یہ ہے کہ بچہ جی تم بڑے بے باک ہو تمہاری پٹھوں کو دو آنے کی مٹھائی رکھ کر شاگرد ہونا چاہیے۔"(۱۸)

سید قدرت نقوی لکھتے ہیں کہ عہد انشا میں عورتوں کی زبان کی طرف بھی توجہ دی گئی اس خصوصیت میں انشاء اور رنگین کو فوقیت حاصل ہے انہوں نے ریختہ کے ساتھ ریختی بھی ایجاد کی۔ انشا عورتوں کی زبان ، محاورات و روزمرہ اور مخصوص الفاظ کے ماہر ہونے کے علاوہ بعض الفاظ کے موجد بھی ہیں انھوں نے "دریائے لطافت" میں بھی عورتوں کی زبان کے نمونے دیے ہیں۔ یہ دو مکالمے دو عورتوں کے ہیں:

"اری سر مونڈی باندی! تو اتنا جوٹھ کیوں بولتی ہے۔ اللہ کرے تیری بوٹی بوٹی اوپر والیاں (چیلیں) لے جائیں۔ اُڑ جائے تو خیلا خندی! میں نے کب کہا تھا ستیاناس گئی تیرے ڈھینگڑے کی جورو کا گلہ کیا۔ کہنے والے کو علی جی کی مار ہو ڈریے! تیرے دید سے بیٹھے بٹھائے کیا اس اُشغلا اٹھایا ہے بُھس میں چنگاری ڈال بی جمالو دور کھڑی۔(۱۹)

ایک جگہ بی نورن امیر صاحب سے کہتی ہیں

"اجی آؤ میر صاحب تم تو عید کے چاند ہو گئے دلی میں آتے تھے تو دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے اور لکھتے پڑھتے تھے لکھنؤ میں کیا کیا ہو گیا کہ کبھیں (کبھی) صورت نہیں دکھاتے اب کے کربلا میں کتنا ڈھونڈا کہیں تمہارا اثر معلوم نہ ہوا ایسا نہ کیجیو کہیں آٹھویں میں بھی نہ چلو ایسا نہ کیجیو! تمہیں علی کی قسم آٹھویں میں مقرر چلیو،۔"(۲۰)

انشاء اور قتیل کی تصنیف "دریائے لطافت" کے بارے میں رام بابو سکسینہ کا لکھنا ہے کہ اس تصنیف کو اردو زبان اور صرف و نحو کے حوالے سے اپنے عہد کی اہم ترین کتاب سمجھنا چاہیے۔ اسے ۱۸۰۲ء میں شائع کیا گیا اور ۱۸۴۸ء میں مرشد آباد سے شائع کیا گیا۔

۱۸۳۳ء میں " دلیل ساطع " کے نام سے مولوی محمد مہدی واصف کی "فارسی اردو و ہندی لغت "سامنے آئی۔ اس میں سے اکثر الفاظ متروک ہو چکے تھے۔ اور اس لغت میں پہلی بار بہت زیادہ محاورات کا اندراج کیا گیا جن میں سے کثیر نسائی محاورات تھے۔ اس کی ایک اور انفرادیت تلفظ کا اندراج بھی تھا۔ انیسویں صدی تک لغات کی تالیف اپنی روایت کو کافی حد تک مستحکم کر چکی تھی۔ اور اردو بھی بطور زبان اپنی حیثیت منوا چکی تھی خط و کتابت کی زبان بن چکی تھی

یوں کہنا ہر گز بے جانہ ہو گا کہ وہ تمام فرہنگ و لغات جو اردو زبان کو نام ملنے سے پیشتر فارسی و عربی میں بھی تالیف ہوئیں یا قواعدِ زبان سکھانے کو تالیف کی گئیں وہ مقامی زبان کے مترادفات الفاظ کے باعث اردو اور ہندی کا حصہ ہی بنتی ہیں اور اردو زبان کی لسانی تدریجی تشکیل کا مضبوط حوالہ ہیں۔

برِ صغیر پاک و ہند کی سرزمین پر سب سے پہلا مغربی سیاح واسکوڈے گاما تھا جو جہانگیر کے عہد میں وارد ہوا جس کی زبان پرُتگالی زبان تھی اور اس کی آمد اور تجارتی مقاصد کے باعث مقامی زبان اور پرتگالی زبان میں روابط قائم کرنے کے لیے لغات و قواعد کی ابتدائی تالیفات کا کام شروع ہوا۔ ۱۵۱۵ء تا ۱۵۶۵ء تک پرتگالیوں کی تجارت، قبضہ اور روابط کا سلسلہ قائم رہا اور ۱۶۰۰ء میں ملکہ الزبتھ سے شاہی فرمان حاصل کرنے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی برِ صغیر پاک و ہند میں وارد ہو گئی اور برِ صغیر پاک و ہندی تاریخ میں ایک نئے عہد کا آغاز ہوا جس نے نہ صرف سیاسی، سماجی، معاشرتی و معاشی زندگی کو تبدیل کیا بلکہ لسانی سطح پر بھی بڑی نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

اردو زبان ان مستشرقین کی خدمات کو کبھی نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتی جو ان غیر ملکیوں نے سرانجام دیں جن کی وجہ سے ۱۷۹۰ء تا ۱۸۲۰ء کے دوران "برِ صغیر پاک و ہندی ڈکشنری" "برِ صغیر پاک و ہندی گرامر"، "اورینٹل لنگوئسٹ"، قصص مشرقی"، "رہنمائے زبانِ اردو"، اور " قواعد اردو اور انگریزی بول چال" جیسی تقریباً پندرہ تصانیف و تالیفات سامنے آئیں۔

ان تمام کاوشوں کے پیچھے بہت سے مستشرقین کی خدمات شامل رہی ہیں۔ جن کے نام ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ پروفیسر سید احتشام حسین "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ میں لکھتے ہیں:

> "اس خصوص میں ٹیلر، روبیک، شیکسپیر، فاربس اور فیلن کے نام قابلِ ذکر و لائقِ احترام ہیں۔ جو بھی ہندوستانی زبان کی لغت پر کام کرے گا اسے ان مصنفین کے کاناموں سے بڑی مدد ملے گی۔ ان میں فیلن نے چار لغت تیار

کیے۔اس کام میں ان کے مددگار لالہ فقیر چند، لالہ چرنجی لال، ٹھاکر داس، لالہ جگوناتھ اور مسٹر والٹن تھے۔ فیلن نے دہلی کے مولوی کریم الدین کے ساتھ مل کر شعرا کا ایک تذکرہ بھی لکھا جس کا زیادہ تر حصہ فرانسیسی فاضل گارساں دتاسی کی تصنیف پر مبنی تھا۔اس طرح بہت سے یورپین علماء اور مصنفین نے اردو کو برِ صغیر پاک و ہند کی قومی زبان اور اس کے ادب کو دلچسپ سمجھ کر اس میں تصنیفات کیں۔"(۲۱)

انیسویں صدی میں لارڈ ولزلے کے حکم پر کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا قیام ۱۸۰۰ء میں عمل میں آیا جو زبان و ادب اور تعلیم و تدریس کے حوالے سے نئے باب رقم کر گیا۔ یہاں کی لسانی خدمات کی تاریخ میں سب سے اہم نام جان گلکرسٹ کا تھا۔ جان گلکرسٹ کی انگریزی برِ صغیر پاک وہندی ڈکشنری کلکتہ سے ۱۷۹۰ء میں مکمل ہوئی۔ وہ فورٹ ولیم کالج میں اردو کے استاد رہے اردو کی لسانیات و صرف و نحو اور عام بول چال پر متعدد کتب تالیف کیں۔ ۱۸۰۱ء میں یہ "برِ صغیر پاک وہندی فولوجی" کے نام سے بھی چھاپی گئی۔اس میں انگریزی کے برِ صغیر پاک وہندی زبان جسے ہندی اور اردو بھی کہا جاتا تھا رومن میں مترادفات لکھے گئے۔ چوبیس صفحات کا مقدمہ جو اردو علم ہجا پر لکھا گیا تھا شامل تھا۔ ایک رسالہ "انڈین گائید" کے نام سے جاری کیا جو ۱۸۰۲ء سے ۱۸۲۰ء تک تین بار شائع ہوا۔

سید وقار عظیم "فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ" میں کے "انگریزی برِ صغیر پاک وہندی ڈکشنری "مطبوعہ ۱۷۹۰ کے بابت لکھتے ہیں کہ یہ ڈکشنری اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے اور کڑی ریاضت کا نتیجہ ہے۔اس کو انگریزی لغات کے اصولوں کے مطابق مرتب و مدون کیا ہے۔(۲۲)

گلکرسٹ نے اپنی لغت میں بعض جگہوں پر بڑی دلچسپ تشریحات اور مترادفات بھی رقم کیے مثلا اس نے جہاں Mistres کا ترجمہ "صاحبہ، خاتون، ببوانی اور بی بی لکھا وہاں "بی بی "کی تشریح میں بیان کرتا ہے کہ ٹکے ٹکے کے برِ صغیر پاک وہندی ہمارے سامنے بی بی کا لفظ اپنی جورو کے لیے استعمال کرتے ہیں اور یہ ہمارے صبر وبرداشت کا امتحان لیتے ہیں۔

حتی کہ ایک نوکر کی بیوی بھی بی بی ہے ایک مشعلچی کی بیوی بھی بی بی، ایک سائیس کی بیوی بھی بی بی ہے۔یعنی کہ ایک موچی، چمار سے لے کر ایک بادشاہ تک سب کی بیوی بی بی کہلائے گی۔ اور اس کے مطابق یہ انتہائی بھونڈا اور مہمل اسلوبِ بیاں ہے۔اس نے خود "لیڈی لارڈ" کا لفظ "بی بی صاحب" کے طور پر درج کیا۔

اسی طرح عام بول چال کے الفاظ و محاورات ہمیں اس تصنیف میں ملتے ہیں جیسے ایک جگہ وہ اپنے انگریز افسران کو برِ صغیر پاک وہندیوں کے اندازِ گفتگو جسے وہ تضحیک آمیز گردانتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ ہماری اردو زبان سے ناواقفیت کا فائدہ اٹھا کر ہمیں برا بھلا کہتے ہیں اور تو تکار کرتے ہیں

جان گل کرسٹ کی ۱۷۸۷ء سے لے کر ۱۸۰۴ء تک برِ صغیر پاک وہند میں موجودگی کے دوران تو بہت سا لسانی کام ہوا ہی مگر ان کے پینشن لے کر واپس انگلینڈ جانے کے بعد بھی کافی عرصہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ قصص مشرقی"، ہندی عربی کا آئینہ "، قواعد اردو"، "اردو رسالہ "، "انگریزی برِ صغیر پاک وہندی بول چال"، کے علاوہ تراجم کی فہرست بہت طویل ہے جس کے کام نے اردو زبان و ادب کو نئی جہات سے متعارف کروایا۔

جان شیکسپئر کی برِ صغیر پاک وہندی انگریزی ڈکشنری ۱۸۱۷ء، ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۴ء، کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کا آخری ایڈیشن کافی ضخیم تھا جس میں وہ تمام الفاظ و محاورات استعمال کیے گئے جو اصل اردو کے مترادفات تھے بمقابل انگریزی کے۔ اس کا چوتھا ایڈیشن ۱۸۴۹ میں آیا جس میں اردو انگریزی پوری ڈکشنری اشاریہ میں شامل تھی۔ مولوی عبد الحق "مقدمہ لغت کبیر میں لکھتے ہیں :

> "اس کے تیسرے اور خاص طور پر چوتھے ایڈیشن میں دکنی الفاظ و محاورات کا بھی اضافہ کیا گیا۔ جو کہ ڈاکٹر ہنری ہیرس کی لغت اور دیگر دکنی کتابوں سے ماخوذ کیے گئے تھے۔ برِ صغیر پاک وہندی، انگریزی ڈکشنری والے حصے میں تمام اردو الفاظ رومن حروف اور اردو رسم الخط دونوں میں لکھے گئے ہیں اور ہندی کے اکثر الفاظ کو ناگری میں بھی لکھنے کی کوشش کی گئے ہے۔" (۲۳)

پلیٹسplats کی لغت جو اردو انگریزی دو زبانوں پر مشتمل تھی اس کا ذکر ناگزیر ہے۔ یہ لغت ۱۸۸۴ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی سے چھپی۔ اس کا انداز گریرسن کے طرزِ تالیف سے ملتا جلتا تھا۔ اس میں زبان کے گرامر کے پہلوؤں پر خاص توجہ دی گئی۔

برِ صغیر پاک وہندی زبان و محاورات کے حوالے سے ایک نمایاں نام کرنل فلپس کا لیا جاتا ہے جنھوں نے اردو زبان کے محاورات کا ذخیرہ لغت کی صورت میں تیار کر کے ۱۸۹۲ء میں لندن سے شائع کروایا۔ جس میں بڑی تعداد میں نسائی زبان کے محاورات بھی شامل تھے اور اسی طرز پر بعد ازاں ۱۹۱۰ء میں اردو محاورات پر

ایک کتاب لکھی۔ فلپس کے ترتیب و تدوین شدہ محاوراتِ اردو مقبول ہوئے اور ان کا دوسرا ایڈیشن بہت جلد کلکتہ سے شائع ہوا۔ڈاکٹر فیلن کی لغت کے پیچھے جن ماہر برِ صغیر پاک و ہندی اہلِ زبان و قلم کا بھی ہاتھ تھا جو ان کے ساتھ معاون و مدد گار تھے ان میں "مخزن المحاورات" کے مصنف منشی چرنجی لال بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر مسعود ہاشمی "اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ" میں اس کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔:

> "یہ لغت نویسی کے جدید اصولوں پر مبنی ایسی ڈکشنری ہے جس میں اردو کے تمام انگریزی مترادفات شامل کرنے کی پوری کوشش کی گئی۔اسی طرح سند کے طور پر پیش کیے گئے حصے ایک طرف برِ صغیر پاک وہندی ادبیات سے ماخوذ ہیں تو دوسری طرف لوک گیتوں اور کہاوتوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ بول چال اور عورتوں کی مخصوص زبان کو بھی پہلی بار شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔اس کے علاوہ برِ صغیر پاک وہندی الفاظ کے معنی، بول چال، روزمرہ کی زبان میں واضح کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔"
> (۲۴)

الغرض سولہویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے نصف اول تک اردو لغت نویسی میں مستشرقین کی خدمات اور ان کے وضع کردہ انداز و معیارات نے اردو زبان کی لغت نویسی کی تاریخ کو ابتدائی ڈھانچہ فراہم کیا۔ اور وہ مضبوط اور قابلِ تقلید بنیادیں فراہم کر دیں جس کے باعث لسانیاتی حوالے سے اردو زبان اپنے تدریجی ارتقا کی طرف بہ آسانی گامزن ہو گئی۔ اگرچہ سولہویں صدی میں لغت نویسی کی ابتدا ذولسانی لغت سے ہوئی مگر اس کے ایک صدی بعد ہی اردو کی اپنی زبان میں فرہنگ مرتب ہونے کی بنا پڑ گئی اور اردو لغت نویسی کی تالیفات کے ساتھ صرف و نحو اور اردو محاورات کی لغات اور فرہنگ بھی مرتب ہونے لگیں۔

انگریزی زبان سے بھی اردو زبان نے اپنی خاص صلاحیت کے باعث بہت سے الفاظ کے لیے اپنا دامن وسیع کیا اور سیکڑوں الفاظ انگریزی زبان سے اردو زبان کے اندر اس طرح آ شامل ہوئے جیسے وہ ہمیشہ سے ہی اردو کا حصہ رہے ہوں اردو نے ان میں سے کچھ الفاظ کو ان کے اپنے درست تلفظ کے ساتھ اپنایا اور انھیں اردو کا لباسِ خاص عطا کرتے ہوئے اسے اردوایا اور بہت سے الفاظ کو اپنے مقامی تلفظ اور رائج قواعد و ضوابط میں یوں مدغم کر لیا کہ گویا وہ ہمیشہ سے اردو زبان کا حصہ رہے ہوں۔ مثلا بوتل، سنتری، ہسپتال،

اسٹیشن، گارڈ، لاٹ صاحب، میم صاحب، لالٹین، رپٹ، روڈ، بیل، لنچ، ڈرائیور، سگنل، فریم، پلیٹ، صوفہ، نہ صرف الفاظ بلکہ کہاوتیں، محاورات، انگریزی کے رموزِ او قاف اور انگریزی اسلوب کی بہت سے باتوں کو اپنایا اور اپنی تحاریر میں ان کو اصول بنا کر برتنا بھی شروع کر دیا۔ تراجم نے جدید اصطلاحات کے در وا کیے۔ اردو زبان اور محاورات میں جہاں عربی، فارسی، ہندی اور پنجابی زبانوں کے اثرات تھے اب اس میں انگریزی کا کسبِ فیض بھی شامل ہو چکا تھا

ب) اردو قواعد و لغات میں نسائی الفاظ و محاورات (۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء)

i :۔ فرہنگِ آصفیہ : سید احمد دہلوی

اردو لغات اور فرہنگ میں اردو سے اردو کی لغت کے طور پر ماہرینِ لسانیات کے نزدیک جامع ترین لغت " فرہنگِ آصفیہ " کو مانا جاتا ہے۔ اس سے پیشتر جتنی بھی لغات و فرہنگ سامنے آئیں وہ اپنے اندراجات کے حوالے سے اپنا الگ ہی انداز اپنائے ہوئے تھیں۔ اکثریت تو شعری اصطلاحات پر مبنی تھیں اور الفاظ کے معنی و مترادفات کے حوالے سے محض اشعار پر اکتفا کیا گیا تھا۔ یہ شعری لغات اپنی افادیت اور جامعیت کے حوالے سے اپنے اصل مقصد سے دور تھیں۔ کچھ کی حیثیت نصاب ناموں کی تھی جن کا مقصد بچوں کو عربی، فارسی و اردو سکھانا تھا جیسے " صمد باری "، " واسع باری "، " اللہ باری "، " نذر سلطانی "، " اللہ خدائی " اور مرزا غالب کے قلم سے " قادر نامہ " وغیرہ۔

اردو کے نصاب ناموں کو ہم با قاعدہ لغت کا درجہ نہیں دے سکتے نہ وہ لغت نویسی کے مروجہ معیارات کے مطابق تھیں۔ پہلی اردو لغت جو با قاعدہ حروفِ تہجی کی ترتیب کو اپناتے ہوئے مرتب کی گئی تھی وہ " غرائب الغات " تھی، ڈاکٹر رؤف پاریکھ کا کہنا ہے کہ اردو لغت نویسی کے ابتدائی تجربات کچھ اس طرح کی مثالیں قائم کرتے رہے کہ اردو لغت کو مترادفات کی جمع آوری کا اندراج ہی سمجھا جانے لگا تھا۔ حالانکہ لغت نگاری میں الفاظ کی تشریح کی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ " غرائب الغات " کے بارے میں اپنی کتاب " اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ " میں ڈاکٹر مسعود ہاشمی لکھتے ہیں: " اس قسم کی لغت نویسی کا اردو میں با قاعدہ آغاز " غرائب الغات " کی صورت میں ہوا جو عہدِ عالمگیر (سترھویں صدی کے اواخر) میں عبد الواسع ہانسوی نے تالیف کی۔ [۲۵]

سید احمد دہلوی کو ڈاکٹر فیلن کے ساتھ کام کرنے کا لغت نویسی کا تجربہ بہت کام آیا۔ اور ان کے ساتھ کام کرنے کے دوران ہی انھوں نے بہت سے الفاظ و محاورات جمع کر لیے تھے۔ اگر چہ اس صحبت کے اثر سے انھوں نے اولین بہت سے فحش الفاظ و محاورات کی جمع آوری بھی کر لی تھی جس پر بعد ازاں کچھ اعتراضات بھی ہوئے۔ مگر معترضین کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ لغت اپنی زبان کے تمام تر الفاظ کا مجموعہ ہوا کرتی ہے اور طب، قانون، فقہ میں کوئی لفظ فحش نہیں ہوتا۔

فرہنگ آصفیہ کی بابت محمد حسین آزاد "مقالات" مرتبہ آغا محمد باقر مجلس ترقی ادب لاہور میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں جو ۱۸۸۷ء میں لکھا گیا تھا۔ "یہ اصطلاحات و محاورات کے لیے جامع ہے تذکیر و تانیث کا امتیاز بتاتی ہے۔ زنانہ محاورات کو بھی لکھا ہے اور ہر جگہ توضیح کر دی ہے تاکہ ناواقف مرد عورتوں کا محاورہ بول کر اہل زبان کے جلسے میں ندامت نہ اٹھائیں۔[۲۶]

سید احمد دہلوی کا لغت "فرہنگِ آصفیہ" مکمل صورت میں شائع ہونے سے قبل "ارمغانِ دہلی" کے نام سے ایک "کُراسہ" کی صورت میں چھپ چکا تھا۔ کُراسہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چھوٹی مجلد کتاب، کاغذ کا دستہ، یا جزو کے ہیں۔ اردو کے چار معروف لغات جن میں فرہنگِ آصفیہ کے علاوہ نور الغات، "جامع الغات" اور "مہذب الغات" شامل ہیں۔ سب اپنی اپنی مکمل صورت میں شائع ہونے سے قبل اسی طرح کے چھوٹے کتابچوں یا اجزا کی صورت میں چھپتے رہے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم نسائی زبان و محاورہ کے تناظر میں "فرہنگِ آصفیہ" کا جائزہ لیں ہم سید احمد دہلوی کے لسانی و ادبی اور سماجی و ثقافتی رجحانات کے ثبوت کے طور پر درجنوں تصنیفات و تالیفات کے نام پیش کر سکتے ہیں جو اس امر کی نشاندہی کرتے ہیں کہ وہ نہ صرف نسائی زبان کے تحفظ و اصلاح کے لیے کوشاں رہے بلکہ انھوں نے عورت کی زندگی کا گہرا مشاہدہ کرتے ہوئے اس کی ضروریات اور تربیت کا بھی خیال رکھا۔

مولوی سید احمد دہلوی کی تمام تر تصانیف و تالیفات کی تعداد اڑتیس ہے۔ اور یوسف بخاری نے مقدمہء "رسومِ دہلی" میں سید احمد دہلوی کی کتب کی فہرست بیان کی ہے۔ ان کی تمام تر تالیفات و تصنیفات میں سے نصف سے زائد کتب ایسی ہیں جو عورتوں کی زبان اور ان کی رسومات پر مبنی ہیں۔ جن کا موضوع عورت کی تعلیم و تربیت اور ان کی زبان و محاورات اور ضرب الامثال و کہاوتوں کو محفوظ کرنا تھا۔ انھوں نے نہ صرف نسائی زبان کی تربیت کے لیے مواد لکھا بلکہ ان کی زبان کو محفوظ کرنے کے لیے بھی عملی قدم اٹھائے

اور محدود وسائل کے باوجود اس بات کا اہتمام کیا کہ ایسی کتب لکھی جائیں جو خواتین کے لیے مفید ہوں اور ان کی لسانی، اخلاقی، سماجی و ادبی تربیت میں بھی مدد و معاون ثابت ہوں۔

"چودھویں صدی "راولپنڈی کے شمارے ۱۵ نومبر ،۱۸۹۸ء کی اشاعت میں ایک مضمون "علم اور علما کی قدر دانی" کے حوالے سے "نواب وقار الامراء بہادر کی فیاضی" کے نام سے شائع ہوا جس سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جس میں سید احمد دہلوی کے نسائی زبان کی تالیف و تصانیف کو موضوع بنایا گیا ہے۔:

> "لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم کے واسطے ان کے سلسلہ تعلیم کی کتب سے بہتر کتابیں اس وقت تک نہیں لکھی گئیں۔ اِن کی متفرق تصانیف بھی ایسی ہی قابلِ قدر ہیں اور "فرہنگِ آصفیہ" کی تصنیف جسکی کمی کے سبب سے بیچاری اردو زبان کو دنیا کی مکمل اور ترقی یافتہ زبانوں کے سامنے آنکھیں نیچی کر لینی پڑتی تھیں۔ ایک دیووں کے کرنے کا کام تھا جو بیس چوبیس برس کی محنت سے انجام پایا ہے۔"(۲۷)

درج ذیل تصنیفات کی فہرست میں سے بھی ہم با آسانی دیکھ سکتے ہیں

تزئینِ کلام (ضرب الامثال جن کی تعداد آٹھ ہزار تھی)، روزمرہ دہلی (نمونہ ءکلام و زبانِ دہلی

مرقع زبانِ دہلی (محاورات و روزمرہ)، ناری کتھا (ہندو عورتوں کی روزمرہ گفتگو اور مکالمے)

"انشائے ہادی النساء" (زنانہ خط و کتابت، خانہ داری، دہلی کی بیگماتی زبان مع رسوم) "تحریر النسا" (انشاہائے ہادی النسا کا حصہ دوم)، "فسانہ ءراحت" (اپنی مرحومہ صاحبزادی محمودہ بیگم کی یادگار میں، عورتوں کے لیے ایک اصلاحی معاشرتی کہانی)، "دلی کی بیگماتی زبان میں"، "قصہ ءمہر افروز" (دلی کے ایک سگھڑ اور دوسرے پھوہڑ گھرانے کی معاشرت)، "چتر بھنیلی" (شہر افروز بیگم کا قصہ)، لڑکیوں کی پہلی کتاب، "ایمنہ مصری کا قصہ "، "رسومِ دہلی"، "ریت بکھان" (ہندوؤں کی پیدائش سے موت تک کی رسوم)، "رسومِ ہنود" (وشنی قوم کی پیدائش سے موت تک کی رسوم) "رس بکھان" (پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، نسبتیں یا دوسخنے، کبت، دوہے، بھجن، گیت) وغیرہ

"تسخیرِ شوہر"، اخلاق النساء (شہزادیوں اور امیر زادیوں کی قابلِ تقلید اخلاقی باتیں) اور بچوں کا رکھ رکھاؤ" تمام کی تمام میں کہیں نسائی زبان سکھانے کو انشا پردازی اور خط و کتابت سکھانے کا مقصد کار فرما نظر آتا ہے اور کہیں دہلی کی خواتین کی زندگی کے معمولات اور سماجی حوالوں سے متعلقہ رسوم کا تذکرہ ہے۔ کہیں

عورت کو بچوں کی دیکھ بھال اور امورِ خانہ داری کو موضوع بنایا گیا ہے اور کہیں زبانِ اردو کے ضرب الامثال اور کہاوتوں کو جمع کیا گیا ہے۔ وہ "فرہنگِ آصفیہ" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> "تذکیر و تانیث کی تمیز اہلِ دہلی و لکھنؤ کے موافق اس میں موجود ہے، زبانوں کا فرق اور اس کی اصلیت کا پتا اس سے لگتا ہے، عام محاورے اس میں درج ہیں، خاص خاص محاورے اس میں داخل ہیں، فقیروں کی صدائیں اس میں سن لو، سودے والے کی آوازیں اس میں دیکھ لو،، دل لگی اس میں ہے، ظرافت اس میں ہے، بعض بعض موقعوں پر جواریوں، ٹھگوں، دلالوں، چابک سواروں، بدمعاشوں، پیشہ وروں کے وہ ملتے جلتے روزمرے جن کے نہ جاننے سے اکثر انسان دھوکہ کھا جاتا ہے، بہ ترتیب حروف اس کتاب میں شامل ہیں، جو الفاظ جس درجے کے آدمیوں میں مروج ہے، وہ انھیں کے نام سے لکھے گیا ہے۔ عورتوں کی بولی اس میں نہیں چھوڑی، جاہلوں کی باتوں سے اس میں پرہیز نہیں کیا، ہاں اگر چھوڑا ہے تو مغلظات اور فحش چھوڑا ہے۔"(۲۸)

مسلم خواتین کے ساتھ ساتھ ہندو عورتوں کی زبان ان کی رسومات اور ان کی دلچسپی کے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا گیا اور نسائی زبان میں موجود گیتوں، لوریوں، اور پہیلیوں کو بھی محفوظ کیا گیا ہے۔

اب اگر ہم سید احمد دہلوی کی معرکتہ الآرا لسانی خدمت "فرہنگِ آصفیہ" کو اسی نسائی زبان و محاورہ کے رجحان کے پس منظری مطالعے کے ساتھ دیکھیں تو کئی شواہد ایسے ملتے ہیں جن سے نسائی زبان اور سماجی زندگی کے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ اور اہتمام کے ساتھ اس کا اندراج نظر آتا ہے۔ سید احمد دہلوی خود "فرہنگِ آصفیہ" کی بابت لکھتے ہیں:

> "ہر ایک محاورے کی سند حتی الوسع کلامِ شعرا، ضرب الامثال، روزمرہ گفتگو،، گیت، کبت، دوہے، پہیلی، مکرنیاں، بھجن وغیرہ سے دی ہے اگر مثال میں موقع آگیا ہے تو پھبتیوں سے بھی قلم کو نہیں روکا ہے۔ نہ بچوں کے کھیل چھوڑے ہیں، نہ عورتوں کے کوسنے اور دعائیں۔ جو محاورے کسی اور زبان سے ترجمہ ہو کر اردو میں رواج پا گئے ہیں انھیں بھی جتا دیا ہے۔ اس کتاب کی تدوین میں ناظرین کے واسطے بہت سہولت کر دی ہے۔ یعنی

انگریزی ڈکشنریوں کی طرح لغت اور ان کے مشتقات اس کے بعد اس کے
معنی اور مثالیں، قلمون اور شروع سطر کے فرق سے معرضِ تحریر میں آئی
ہیں۔"(۲۹)

سید احمد دہلوی نے فرہنگ کے ابتدائی صفحات میں دہلی کی تہذیب کو اردو زبان کی چاشنی کے ساتھ جس طرح پیش کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہاں لغت کے پہلے حرف "الف" سے پہلے انھوں نے جن موضوعات کو اہتمام سے شامل کیا وہ پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، نسبتیں، پوشاکیں اور سودا بیچنے والوں کی آوازیں شامل ہیں جو اس قدر دلچسپ ہیں کہ کوئی ان کو پڑھے بنا آگے صفحہ نہیں پلٹ سکتا۔ اس زمانے میں جب ٹیلی وژن اور انٹرنیٹ کا نام و نشان نہیں تھا اور بچے اپنے گھر کے بزرگوں خصوصاً خواتین جیسے دادی، نانی، والدہ، پھوپھی کو رات کے کھانے کے بعد گھیر لیا کرتے اور کہانیاں سننے کے ساتھ ساتھ پہیلیاں بوجھنے کی مشق ہوا کرتی جو بچوں کو سوچنے اور عقل استعمال کرنے کی تربیت فراہم کرتی تھی۔ خواتین کے ہاں پہیلیوں کا دور چلا کرتا، سکھیاں سہیلیاں آپس میں پہیلیاں یاد کر کے آتیں اور ایک دوسرے کو سنایا کرتی تھیں۔ "فرہنگِ آصفیہ" میں سے چند پہیلیاں یہ ہیں:

"سونے کی وہ نار کہاوے، بنا کسوٹی بان دکھاوے (چارپائی)"
"بعضی بات کہی نہ جاوے، ناری ہو کے نر کہلاوے (باز پرند)"
"بانبی واکی جل بھری، اور اوپر جاری آگ / جبھی بجائی بانسری، نکسو کارو ناگ (حقہ)"
"کیا جانو وہ کیسا ہے، جیسا دیکھو ویسا ہے / ارتھ تو اُس کے بوجھے گا، منہ تو دیکھو سوجھے گا (آئینہ)"
"ایک نار دیکھن کو آوے، جو دیکھے سو آنکھ لگاوے (عینک)"(۳۰)

پہیلیوں میں نسائی زبان کی موجودگی اس بات کی مضبوط ترین دلیل ہے کہ ان پہیلیوں کا استعمال اور فروغ خواتین کے ہی دم سے تھا۔ اکثر پہیلیوں میں "اے ری سکھی، سُن ری سکھی، بوجھ سکھی، بتلارے سکھی، سہیلی بوجھ پہیلی، اری سہیلی بوجھ پہیلی، ایک تھی نار۔۔۔ جیسے الفاظ سے آغاز ہوتا ہے اور پہیلی شروع ہوتی ہے۔ نسائی زبان کا یہ رُوپ بھی اپنی الگ ہی پہچان رکھتا ہے۔ جو اردو زبان کے رنگین اثاثوں میں سے ایک ہے۔

پہیلیوں کی طرح نسائی زبان کا ایک خاص پہلو "کہہ مکرنیاں" بھی ہیں جن کے شوخ اسلوب کا سہارا لے کر ذو معنی باتیں کہی جاتی تھیں۔ یہ بھی اردو ادب کی تاریخ میں نسائی زبان کی دین ہے۔ اس کو سکھنیاں بھی کہتے تھے۔ خالصتاً نسائی اندازِ بیان کی جھلک اس میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انکو شادی بیاہ کے موقع پر باقاعدہ گا کر پیش کیا جاتا تھا۔ سید احمد دہلوی لکھتے ہیں: "کہہ مکرنی میں عورتوں کی زبان سے ذو معنی بات بیان کی جاتی ہے۔ جس میں ایک سے معشوق مراد ہوتی ہے اور دوسرے سے کچھ اور، اُس کا قائل جب چاہتا ہے معشوق کی بات کہہ کر مکر جاتا ہے۔"(۳۱)

" اس بن مجھ کو چین نہ آوے،وہ میری تس آن بجھاوے
ہے وہ سب گُن بارہ بانی، اے سکھی ساجن نی سکھی پانی"
اونچی اٹاری پلنگ بچھایا، میں سوئی میرے سر پہ آیا
کھل گئیں اکھیاں بھئی انند، نہ سکھی ساجن نہ سکھی چند" (۳۲)

کہہ مکرنیوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ زیادہ الفاظ ہندی زبان کے ہیں اور اندازِ بیاں بھی قدیم زبان کا ہے۔ چونکہ ایسی شاعری کا رجحان اردو میں کم ہوتا جارہا تھا اور اردو زبان نے ادب کے نئے افق دریافت کر لیے تھے اس لیے اس صنفِ شاعری میں مزید ترقی نہیں ہوئی اور جدید رجحانات شامل نہ ہوسکے مگر ایک خاص پس منظر کے ساتھ یہ نسائی زبان کا خاص حصہ ضرور رہی ہے۔ نہ صرف یہ کہ یہ محض ایک شعری صنف رہی ہے بلکہ خاص نسائی جذبات کے اظہار کا ذریعہ بھی تھی۔ اس میں ذو معنویت کا عنصر اس کی بلاغت کو پر تاثیر بنا دیتا اور حسنِ کلام کے ساتھ موسیقیت کا احساس جوش وولولہ پیدا کر دیتا تھا۔

نسبتوں کے مختصر تذکرے میں زیادہ تر نسبتیں امیر خسرو کی لکھی گئی ہیں۔ نسبتیں بھی پہیلیوں سے ملتی جُلتی ہین ان میں جواب دینے کے لیے بر جستگی اور حاضر جوابی شرط تھی۔ اس میں انشائی طرز کی مشق کا تاثر ملتا ہے کہ جواب دینے والا مختلف نسبتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایسا لفظ تلاش کرتا جو ان نسبتوں میں قدرِ مشترک بن جاتا جیسے:

انار کھایا کیوں نہیں،وزیر رکھا کیوں نہیں؟

جواب:۔ دانا نہ تھا

جوتا پہنا کیوں نہیں؟ بڑا کھایا کیوں نہیں؟

جواب:۔ تلا نہ تھا

جوگی کیوں بھاگا؟ڈھولکی کیوں نہ باجی؟

جواب:۔منڈھی نہ تھی(۴۳)

محاورہ کسی بھی زبان میں وسعت اور اس کی بلاغت میں حسن کی ضمانت ہوا کرتا ہے۔زبان میں ایک خوشگوار روانی بلاغت سے آتی ہے۔بقول سید احمد دہلوی فصاحتِ کلام اُس صفت کو کہتے ہیں جو تنافر و ضعفِ لفظ سے جملے کو محفوظ رکھتی ہے۔انھوں نے خود جو محاورے کی تعریف فرہنگِ آصفیہ میں بیان کی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ محاورہ اس ہمکلامی اور روز مرہ سے عبارت ہے جس میں عوام الناس خواندہ و ناخواندہ اپنے اپنے ملک کے رواج کے موافق بے فکر و تامل گفتگو کرتے ہیں۔اس میں ترکیبِ نحوی و رعایتِ لفظی سے چنداں بحث نہیں بلکہ عین مستورات کی زبان کو محاورہ کہنا مناسب ہے۔مثال:۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
ان کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

یعنی محاورات کو "عورت کی زبان" کہنا وہ بھی اپنے عہد کے سب سے اہم ماہرِ لسان کی رائے کے مطابق بہت اہمیت کی حامل بات ہے۔اور بلا مبالغہ عورتوں کی زبان نے اردو کو وہ لطف، وہ چاشنی، وہ تیکھا پن، وہ لوچ اور روانی عطا کی جو آج اس کی پہچان ہے۔آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں

"اُن رسموں اور لغتوں پر زیادہ توجہ کی ہے جو عام عورتوں میں بالفعل رائج ہیں اور جہاں تک ممکن ہوا ہے اُن رسموں کے رواج کا زمانہ اور باعث بھی لکھا گیا ہے۔جو ضرب المثل کسی محاورے سے متعلق ہے وہ محاورے میں اور جو کسی مثال سے متعلق ہے وہ مثال میں لکھ دی ہے۔ہر ایک محاورے کی مثالیں انھی لوگوں کی بول چال میں دی ہیں جن سے وہ متعلق ہیں۔بچوں کے کھلانے کے فقرے، لوریاں کھیل وغیرہ بھی کہیں مثال میں کہیں ترتیب میں جہاں جیسا مناسب ہوا لکھے گئے ہیں۔عورتوں کے مہینے بھی مع وجہ تسمیہ اور وقتِ رواج داخل کیے گئے ہیں۔بھنگر اس میں دھرے ہیں۔شرابی اس میں مٹکار رہے ہیں۔ ضلع جگت، چھند، مرہٹی، بارے، انملیاں، دوسخنے، کہہ مکرنیاں، جو کچھ چاہو اس میں نکال سکتے ہو صرف فلوجی ہی نہیں فلاسفی سے بھی اس میں بہت کچھ مدد ملی ہے۔اور جو محاورے آئندہ رواج پانے کے قابل ہیں اُن پر بھی لحاظ کیا ہے۔"(۴۴)

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا کہنا ہے کہ زبان کی وسعت اور ترقی یافتہ ہونے کی دلیل یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کے پاس کتنا بڑا ذخیرہ الفاظ اپنی بلاغت کے ساتھ ایک مربوط لسانی قواعد کے نظام میں جڑا ہوا ہے۔ الفاظ کا استعمال کتنے کتنے مفاہیم کے تحت ہو رہا ہے۔ وہ آزاد فعلیہ اجزا سے مل کر بننے والے مرکب الفاظ کو بھی محاورہ ہی گردانتے ہیں جیسے بیٹھ جانا، چل پڑنا، اٹھ جانا، مان لینا، سمجھ جانا، مار ڈالنا، لے اڑنا، آلگنا، آپڑنا، لے بھاگنا جیسے مرکب الفاظ محاورہ قرار دیے جاتے ہیں۔ مرکب افعال پہلے جزو یا اسم کے ساتھ مل کر معانی میں محاورے کا حسن اور وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں کہ:

"یہی حال ان مرکب افعال کاہ جو اسم کے بعد فعل لگانے سے بنتے ہیں۔ ان میں بھی محاورے کی شان ملتی ہے کیونکہ دوسرے جزو کے ساتھ مل کر پہلے جزو میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور اس سے نیا مفہوم برآمد ہوتا ہے۔ آنکھ سے مل کر بننے والے محاورے "فرہنگِ آصفیہ" میں ۴۵ صفحوں پر آئے ہیں۔ اسی طرح ناک، ہاتھ، پاؤں، آگ وغیرہ اسما سے بننے والے محاورے کئی سو ہونگے"(۳۵)

آگے چل کر جو مثالیں انھوں نے محض ایک لفظ "دل" کے حوالے سے پیش کی ہیں ان میں سے اگر ہم نسائی زبان کے حوالے سے ہی دیکھنا چاہیں تو سیکڑوں مثالیں مل سکتی ہیں جیسے:

دل پسیجنا، دل پھٹا جانا، دل کو دھڑکا لگنا، دل رکھنا، دل ڈوبنا، دل چلنا، دل سنبھلنا، دل کا رونا، دل کھلنا، دل لَوٹنا، دل کُھلنا، دل مارنا، دل دہلانا، دل بجھنا، دل آنا، دل پانا، دل بہلانا، دل پکڑنا وغیرہ اور کتنے ہی محاورے اور کہاوتیں لفظ "دل سے مزید وابستہ ہیں جس وجہ سے بقول ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ہمارا برِ صغیر پاک و ہندی معاشرہ بہت ہی "دل زدہ" معاشرہ کہلایا جا سکتا ہے کا حصہ ہیں۔ جیسے: دل پہ سانپ لوٹنا، دل کباب ہونا، دل ہٹنا، دل ہاتھ میں لینا، دل دریاؤ، دل پھیکا ہونا، دل دار، دل شاد، دل کڑا کرنا، دل لگی کرنا، دل کو دل سے راہ ہونا، دل مسوسنا، دل میں رکھنا، دل مر جانا، دل میں رکھنا، دل کا کنول کھلنا، دل کباب ہونا، دل کڑوا کرنا، دل ہاتھ میں رکھنا، دل میں گھر ہونا، دل میں گرہ پڑنا، دل میں چبھنا، دل شاد ہونا، دل سوختہ ہونا، دل دہلنا، دل جوئی کرنا، دل میں ڈالنا، دل اُچاٹ ہونا، دل کے پھپھولے پھوڑنا، دل جلانا، دل برا کرنا، دل میں چٹکیاں لینا، دل لگی کرنا، دل پر میل آنا اور دل کھٹا ہونا وغیرہ۔ (یہ تمام محاورات فرہنگِ آصفیہ" سے لیے گئے ہیں)

ii :لغات النساء: سید احمد دہلوی

سید احمد دہلوی کا نام اردو میں لغت نویسی کی تاریخ کا بہترین حوالہ ہے "فرہنگ آصفیہ" کی صورت میں ان کے عظیم کارنامے کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ نسائی زبان کے حوالے سے جتنا لسانی کام سید احمد دہلوی نے کیا اتنا شاید ہی کسی اور لغت نویس نے کیا ہو گا۔ "لغات النسا" کی اولین اشاعت ۱۸۷۵ء میں ہوئی اور اس کی پذیرائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تمام اخبارات و جرائد نے اس کی نہ صرف خبر شائع کی بلکہ اس پر تبصرے بھی لکھے۔ خواتین کی زبان و محاورہ پر اس طرح پہلے کسی لغت نویس نے اس خصوصیت کے ساتھ توجہ نہیں دی تھی اس کے یکے بعد دیگرے کئی ایڈیشن شائع ہوئے مختلف اہل ثروت لوگوں اور نوابین نے اس کی سرپرستی کرتے ہوئے سیکڑوں نسخے خریدے اور مصنف کی اس کاوش کو پسند فرمایا جس میں خصوصیت سے "لغات النساء" کے دیباچے میں مصنف نے قیصر ہند حضور جارج پنجم نظام دکن بیگم سلطان جہاں بیگم بھوپال کا ذکر کیا ہے۔ جیسا کہ اس کے تیسرے صفحے پر یہ عبارت کندہ ہے کہ اس میں چار ہزار اکہتر نسائی الفاظ و محاورات کا ذخیرہ موجود ہے اس کی ابتدا میں رقم ہے:

> "دہلی کی بیگموں، قلعہ معلیٰ کی شہزادیوں، عام شریف خاتونوں، متوسط الناس مستورات، ہندو لیڈیوں، کتبِ تعلیماتِ زنانہ کے جدید و قدیم لغات، محاورات، اصطلاحات خاص خاص رمز و کنایات و ضرب الامثال کا گنجینہ تاریخی معلوماتِ زبان کا دفینہ قابلِ اصلاح زنانہ توہمات و عقائد نسواں کا جزو و کل مجموعہ تعداد قلم بند چار ہزار اکہتر الفاظ و مصطلحات کا خزانہ موجود ہے۔ [۳۶]

مصنف نے دیباچے میں تذکرہ کیا ہے کہ "لغات النساء" سے قبل بھی نسائی زبان پر اس کی کاوشیں شائع ہو چکی ہے وہ لکھتے ہیں۔ "بیگماتی زبان میں "انشائے ہادی النسا" شائع ہوئی "سب سے اول بیگماتی زبان میں "انشائے ہادی النساء" شائع ہوئی جس نے اس قدر مقبولیت کا درجہ حاصل کیا کہ ۱۸۷۵ء سے لے کر اب تک اس کے ایڈیشن پر ایڈیشن شائع ہو رہے ہیں۔ [۳۷] لغات النساء کی اشاعت ۱۸۷۵ء کے موقع پر پنجابی اخبار لاہور نے اس پر ریویو شائع کیا۔ پٹیالہ اخبار نے ۱۲ جولائی ۱۸۷۵ء کی اشاعت میں اس پر تبصرہ لکھا، "اخبار انجمن پنجاب"، "اکمل الاخبار" اور "اودھ اخبار" نے اس کی بابت لکھا

سید احمد دہلوی کی نسائی زبان و محاورہ کے حوالے سے خدمات بہت قابل قدر ہیں۔ان کی توجہ سے عورتوں کی زبان کو نہ صرف اہمیت حاصل ہوئی بلکہ اس اہم حصہ کو محفوظ کرنے اور اس کی تخصیص کرنے کے کام کی بھی ابتدا ہوئی بعد ازاں "راحت زمانی کا قصہ"، "اخلاق النساء"، "تحریر النساء"، "بچوں کا رکھ رکھاؤ" طبیعی تعلیم"، "رسوم دہلی" اور ساجن موہنی" جیسی تصانیف نے اردو بولنے والے طبقہ میں خاص مقام بنایا اور ان کا مقصد عورتوں کی زبان کے ساتھ ساتھ ان کی لسانی اور اخلاقی تربیت بھی تھا انہیں خط و کتابت اور گفتگو کے لیے آداب سکھائے گئے اس کی تقاریظ لکھی گئی ہیں جن میں سے ایک اہم تقریظ جناب ایس ڈبلیو ڈاکٹر فیلن صاحب بہادر کی ہے جن کا کہنا ہے کہ یہ برِ صغیر پاک و ہندی عورتوں کی زبان و ادب کی بابت ایک بہت بڑا کارنامہ ہے ان کے الفاظ تھے:

"میں نے اس کتاب کو جستہ جستہ دیکھا ہے مگر جو دیکھا ہے اسکو موافق بول چال مستوراتِ دہلی اور مطابقِ روزمرہ بیگمات کے درست پایا۔ علیٰ الخصوص بابت بیان رسومِ زنان اہلِ اسلام برِ صغیر پاک و ہند جامع و کامل ہے کہ جس سے مولف اس کا قابلِ صد گونہ تحسین و آفرین ہے۔ فی لواقع مدارس زنانہ و مردانہ کے لئے اس کا پڑھنا بہت مفید ہو گا۔ (۳۸)

اخبار انجمن پنجاب کی سات مئی ۱۸۷۵ء کی اشاعت میں رقم ہے:

"یہ کتاب خاص دہلی کی بیگمات اور پردہ نشین مسلمان عورتوں روزمرہ محاورات اور بول چال کے مطابق ہے. عورتِ دہلی کی مادری بول چال اور ان کی نفیس اور لطیف گفتگو سے بخوبی تمام معلوم ہوتی ہے۔۔۔ جس قدر اصلی محاورات و روزمرہ اہلِ دہلی کی مادری زبان کے اس سے معلوم ہوتے ہیں ہمارے قیاس میں اور کسی کتاب سے جو اب تک تصنیف ہوئی ہیں معلوم نہیں ہوتے۔"(۳۹)

سید احمد دہلوی نے الفاظ و محاورات کی جمع آوری میں اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ اپنی ذاتی علمیت و فضیلت جھاڑنے کے بجائے زبان میں کسی قسم کی اختراع یا تصرف کو نہیں برتا۔ عوام وخواص کی عورتوں کی نسائی زبان سے تمام الفاظ و محاورات کو اٹھا کر لغت میں رکھ دیا ہے اس میں انہوں نے کسی خاص طبقے کی زبان کو پیش نظر نہیں رکھا۔ کئی الفاظ فحش گوئی کے زُمرے میں آنے کے باوجود اس لیے لکھے گئے کہ وہ

بولے جاتے تھے لہذا ان پر یہ الزام اس لیے بھی غلط ثابت ہوتا ہے کہ ایک لغت نویس کا کام ہر طرح کے الفاظ جو اس زبان میں موجود ہیں ان کی جمع آوری کرنا، چاہے وہ گالی گلوچ ہو، طعنہ تشنہ ہو یا کوسنا۔

رسالہ "انجمن عرب سرائے" کی ۱۹ جولائی ۱۸۷۵ء کی اشاعت میں "لغات النساء" کی بابت تفصیلی بیان شائع ہوا تھا جس میں سید احمد دہلوی کی نسائی زبان کی جمع آوری کی کاوش کو سراہا گیا۔ اس میں لکھا تھا کہ "ہماری انجمن مصنف کی اس رائے سے کمال خوش ہوئی کہ اس نے عورتوں کے خیالات کو اور لوگوں کی طرح اپنے ڈھنگ پر نہیں ڈھالا۔ مزید لکھا کہ یہ کتاب مستورات کی طبیعتوں اور ان کے خیالات سے ایسی مناسبت رکھتی ہے جیسے بچوں کی طبیعت کھیل تماشوں سے۔

اب ہم لوگ "لغات النسا" کے اصل متن کی جانب بڑھتے ہیں جہاں چار ہزار اکہتر الفاظ نسائی زبان و محاورہ کے جمع کیے گئے ہیں اس میں مفردات بھی ہیں اور مرکبات بھی، با قاعدہ روزمرہ بھی ہیں اور ضرب الامثال بھی، اس کے علاوہ نسائی کہاوتوں کا اندراج بھی ملتا ہے۔

سید احمد دہلوی نے اس بات کا اہتمام بھی کیا ہے کہ جن الفاظ و محاورات کے ساتھ ضرورت سمجھی وہاں اس کے مکمل پس منظر کو بھی بیان کیا ہے۔ جیسے "اُبٹنا" کے سامنے اس کی مکمل تفصیل اور ابٹن تیار کرنے کی مکمل ترکیب اور اجزاء کے ساتھ ساتھ اثرات بھی لکھے گئے ہیں اور آگے جا کر "ابٹنا کھیلنا" کی ذیل میں مایوں کی رسم کا مکمل بیان موجود ہے۔

اس لغت میں نسائی زبان کے ہزاروں الفاظ اس امتزاج سے شامل ہیں کہ اپنی مخصوص لغاتی ترتیب کے باوصف کہیں ہمیں نسائی رسومات کا بیان تفصیلی انداز میں بدل جاتا ہے اور کہیں عام بول چال اور دوسرے کو مختلف ناموں سے پکارنے، نئے نام رکھنے سے لے کر حسد، جلن، رقابت، محبت اور طنز کی آمیزش سے بولے جانے والے الفاظ و محاورات کی طویل فہرست بھی دیکھنے کو ملتی ہے مثلاً ہپو یعنی بہت پوپلی بڑھیا، نگوڑی، کم نصیب، لپ چخنی، کُٹنی، طلاقن، شیطاح (شوخ)، قطامہ (فاحشہ)، شفتل (بیہودہ)، جمالو، جلاتن، تماشا خانم، پخنی (چیخنے والی) بچھل پائی، پچوڑی (پاجی)، بیرن، بھُنڈ پیری (منحوس عورت) بِس بھری، بختوں جلی، پکی پیٹی، تتیا مرچ، اُچھال چھکا وغیرہ۔

خواتین کی زندگی کا ایک اہم حصہ لباس ہوتا ہے جس میں وہ اپنی ضرورت اور ضرورت سے زیادہ پسند وناپسند اور ذوق کا خاص اہتمام کرتی ہیں۔ "لغات النسا" جہاں نسائی زبان، اسماء وافعال کے تذکرے سے بھری

پڑی ہے وہاں گاہے گاہے لباس اور اس سے متعلقہ کا بھی بیان ہے مثلاً ایک "انگیا" کے لفظ کے اندراج پر اکتفا نہیں بلکہ "انگیا" کے تمام حصوں کے الگ الگ اسماء کا بیان بھی ملتا ہے مثلاً

انگیا کے گھاٹ: گریبان

انگیا کے پان: پچھووں کے پیچھے کے ٹکڑے

انگیا کا بنگلہ: پچھوے کے ٹکڑے

انگیا کا ٹھرا: بٹا ہوا سوت کا ڈور

انگیا کی خواصی: بغل کے بیچ کی ایک دھجی

انگیا کے پٹھے: انگیا کی چوڑی گوٹ

انگیا کی چڑیا: وہ سیون جس سے کٹوریاں ملتی ہیں

انگیا کی کٹوریاں: محرم، سامنے کا حصہ

انگیا کی دیواریں: اطراف کا حصہ

اسی طرح آنچل یعنی دوپٹہ اور پھر اس سے دلچسپ محاورات کا بیان نکلتا ہے جیسے "آنچل پڑنا" یعنی جسم یا سر سے آنچل کا چھوا جانا یا آنچل کا پلو ٹکرانا، آنچل کا سایہ پڑنا، اسی طرح "آنچل پھاڑنا" محض ایک محاورہ نہیں اس کے پیچھے برِ صغیر پاک و ہندی رسومات و عقائد اور کمزور العقیدہ کم تعلیم یافتہ ہونے کے باعث جو ٹونے ٹوٹکوں کی کثرت رہی ہے ان کے رجحان کا بھی پتہ چلتا ہے "آنچل پڑنا" سے مراد کسی ایسی خاتون کے پلو کا ٹکڑا یا دھاگا ادھار لینا ہے جو بال بچوں والی ہے اور اس کے آنچل کا ٹکڑا یا دھاگا ایسی عورت کو دینا کہ جس کے اولاد نہ ہوتی ہو اسے نیک شگون کے طور پر لیا جاتا ہے تاکہ بچوں والی کے آنچل کی برکت سے دوسری کے ہاں بھی اولاد ہو۔

"اچھوئی کوکھ" اس عورت کو کہا جاتا ہے جس کا بچہ مرا ہو سید احمد دہلوی نے لغات النساء میں صرف نسائی الفاظ کی جمع آوری نہیں کی بلکہ اس دور کی سماجی و ثقافتی زندگی کی جھلکیاں بھی پیش کر دی ہیں جن کی مدد سے ہم نہ صرف دلی بلکہ برِ صغیر پاک و ہندی نسائی زندگی کے بے شمار پہلوؤں کا جائزہ لے سکتے ہیں لغات النساء میں عام لغات کی طرح صرف الفاظ و محاورات کی جمع آوری کر کے فہرست سازی نہیں کی گئی بلکہ جہاں جہاں جس جس محاورے یا ضرب المثل کہاوت کا تذکرہ آیا ہے اس کی مکمل تفصیلات بھی فراہم کی گئی ہیں اس کا فائدہ یہ ہوا کہ آج تقریباً ڈیڑھ صدی کا زمانی فاصلہ طے کرنے کے بعد بھی ایسے بہت سے الفاظ و محاورات یا کہاوتیں

ہماری روز مرہ کی گفتگو یا موجودہ لکھے جانے والے ادب سے خارج ہو چکے ہیں اور ان کا استعمال زبانی و تحریری طور پر نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے ان کی تفہیم اپنے تاریخی پس منظر کے ساتھ محفوظ ہے اور ہم ان کی مدد سے اس عہد کی حیاتِ روز مرہ کا بخوبی جائزہ لے سکتے ہیں۔

کچھ قصے کہانیاں جو اب تاریخ کا حصہ ہیں اور ہماری داستانوی اور افسانوی ادب کی یاد دلاتے ہیں ان کی تفصیلات بھی فراہم کی گئی ہیں جیسے "آنکھوں کی سوئیاں نکالنی رہ جانا" اس محاورے کے ساتھ مکمل کہانی بیان کی گئی ہے جب ایک شہزادے پر جادو کے زور سے ایسا عمل کیا گیا کہ اس کے پورے جسم کے پور پور میں سوئیاں چبھو دیں گئیں اور وہ جادو کے اثر سے بیہوش ہو گیا۔ اس کی بیوی یا بعض روایات کے مطابق شہزادی فجر کی نماز کے وقت اس حالت میں دیکھتی ہے تو اس کے بدن سے ایک ایک کر کے سوئیاں نکالنا شروع کرتی ہے تکلیف کے خیال سے وہ ہاتھوں کے بجائے ہونٹوں سے نکالتی رہتی ہے سارا دن اسی مشقت میں گزر جاتا ہے اور وہ نماز ظہر کا وقت ہو جاتا ہے نماز کا وقت جب تنگ رہ جاتا ہے تو وہ تب تک سارے بدن کی سوئیاں نکال چکی ہوتی ہے صرف آنکھوں کی سوئیاں باقی رہ جاتی ہے وہاں سے اٹھ کر نماز پڑھنے جاتی ہے اور اپنی ایک کنیز کو وہاں بٹھا جاتی ہے وہ آنکھوں کی سوئیاں بھی نکال دیتی ہے اور شہزادہ فوراً آنکھیں کھول کر ہوش میں آ جاتا ہے وہ سامنے کنیز کو دیکھتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہی کنیز اس کی نجات دہندہ ہے اور اس کا ممنون احسان ہو کر اس سے بیاہ رچا لیتا ہے اور اس کا مطیع و فرمانبردار ہو جاتا ہے۔ صرف ایک مطلب سمجھانے کے لیے کہ کوئی جب سارا کام کر کے صرف آخر میں ذرا سا کام چھوڑ دے تو اس سے ساری محنت اکارت جا سکتی ہے اس کے لیے مکمل واقعہ یا کہانی بیان کی گئی ہے۔

اسی طرح "اونٹ کے گلے میں بلی باندھنا" بھی ایک مضحکہ خیز اور عجیب سا جملہ نظر آتا ہے مگر سید احمد دہلوی نے مکمل واقعہ بیان کر کے قاری کے لیے اس جملے کی تفہیم ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دی ہے۔ بظاہر اونٹ اور بلی کا کوئی جوڑ اور کوئی نسبت نہیں بنتی مگر ایک شخص جس کی بیوی جو اس کے اونٹ سے بہت تنگ تھی وہ غصے میں ایک دن قسم کھا لیتا ہے کہ وہ اس اونٹ کو دس روپے میں بیچ ڈالے گا. اور پھر اونٹ کے گلے میں بلّی باندھ کر کے آواز لگاتا ہے کہ دس روپے میں اونٹ خریدو، دس روپے میں اونٹ مگر سو روپے کی بلی بھی ساتھ خریدنی پڑے گی۔

رمز و ایما، تشبیہ، استعارہ کی مثالیں نسائی زبان کے حسن اور رومانویت کو چار چاند لگا جاتے ہیں ایک خاص ثقافتی پس منظر کی وجہ سے برِ صغیر پاک و ہندی عورت اپنی روز مرہ کی گفتگو میں بہت محتاط ہوا کرتی تھی

اور وہ بہت سے معاملات میں شرم و حجاب کے باعث کھلے لفظوں میں جسم کے مختلف حصوں کے اور بیماریوں اور جسمانی و جذباتی مسائل کا اظہار نہیں کر پاتی تھی اس لیے اس صورتحال میں وہ استعاراتی و علامتی الفاظ کا سہارا لیتی لیا کرتی تھیں۔

اس تناظر میں لغات النساء میں سیکڑوں الفاظ ہمیں دعوت دیتے ہیں کہ کس کس نسبت سے عورت ان امور کی پوشیدگی کے احساس کے ساتھ علامتی راستہ نکالا کرتی تھی۔ جیسے ایک لفظ "پلپلی ٹھیکری "عورت کے جسم کے نازک حصے "اندام نہانی" کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہاوتوں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی نسائی زبان سے الگ کر کے بھی مرتب کیا جاسکتا ہے۔ جو اردو زبان کو نسائی زبان کی دین ہے اوراور اس زبان کے لسانی اور فکری پہلو کی نشاندہی کرتے ہوئے اس میں خوبصورت اور منفرد اضافہ کرتا ہے۔

محمد حسن عسکری کا کہنا ہے کہ آج کل کا ادب جو ہم پڑھ رہے ہیں یا تخلیق کر رہے ہیں اس میں الفاظ کا استعمال آہستہ آہستہ قحط کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے کیونکہ ہم میں سے بہت سے لوگ یہ سمجھنا شروع ہوگئے ہیں کہ محاورات کے استعمال کی ضرورت ہی کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ یہ غور طلب بات ہے کہ

محاورے کب استعمال ہوتے ہیں اور کیوں؟

اور محاوروں میں ہوتا کیا ہے؟

وہ ہمیں کیوں پسند آتے ہیں؟

اور اس سے بیان میں کیا اضافہ ہوتا ہے؟

اس کی مثال وہ ایک جملے سے دیتے ہیں جس میں دو محاورے برتے گئے ہیں۔ یہ جملہ انہوں نے رتن ناتھ سرشارؔ کی تحریر سے لیا ہے

"چراغ میں بتی پڑی اور نیک بخت نے چادر تانی "ان کا کہنا ہے کہ آج کا قاری سوچتا ہے اس کا سیدھا سادہ مطلب تو یہ بنتا ہے کہ شام ہوئی اور لڑکی سرشام ہی سوگئی مگر محمد حسن عسکری کا کہنا ہے کہ چراغ میں بتی پڑنا اور چادر تاننا دو محاوروں کے پیچھے ایک پوری فطری و سماجی عمل کی داستان چھپی ہے۔ شام ہونا فطری عمل ہے اور چراغ میں بتی پڑنا انسانی عمل اور "چادر تاننا" محض سوجانا نہیں بلکہ "دنیا سے منہ موڑنا" اور "دنیا سے بیزاری اور اکتاہٹ "کا احساس ہے اس سماجی فعل کے پیچھے ایک اجتماعی فعل ہے چراغ میں بتی پڑنا ایک ہنگامہ خیز عمل ہے۔ اس خاص سماج اور ماحول کے ساتھ جڑا ہوا جب سرِشام سرسوں کے تیل کے چراغ روئی کی بتی سے بنا کر جلائے جاتے تھے اس طرح محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

"ایک ضرب المثل لیجئے "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا" اس میں عمومی تصور ایک
خاص واقعہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے یہ ایک استعارہ ہے جو بقول ارسطو
شاعری کی جان ہے تو ایسے بھی محاورے اور ضرب المثل ہوتی ہیں جو میں
یہاں سے آگے بڑھ کے شعری بن جاتی ہیں پھر مندرجہ بالا فقرے میں
گھریلو زندگی کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔ خاص طور سے بعض جانوروں کو
انسانوں کی زندگی میں جو دخل ہے اس کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے "(۴۰)

محاورات اور ضرب الامثال کا تعلق ایک مخصوص سماجی نظام اور زندگی کی اصل روح اور رویے سے منسلک ہوتا ہے محاورہ انفرادی یا ادبی مسئلہ نہیں ہے محاورہ ہماری اجتماعی زندگی، انفرادی زندگی کا مسئلہ ہے بلکہ بقول محمد حسن عسکری محاورے تو ہماری اجتماعی زندگی کی شاعری ہیں۔ محمد حسن عسکری مزید لکھتے ہیں:

"غرض محاوروں میں اجتماعی زندگی کی تصویریں سماج کے تصورات اور
معتقدات انسان، فطرت اور کائنات کے متعلق سماج کا رویہ یہ سب باتیں
جھلکتی ہیں محاورے صرف خوبصورت فقرے نہیں یہ تو اجتماعی تجربے کے
ٹکڑے ہیں اور ایسے ٹکڑے جن میں سماج کی پوری شخصیت بستی ہے۔ محاورہ
استعمال کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے انفرادی تجربے کو اجتماعی
تجربے کے پس منظر میں دیکھا جا سکتا ہے "(۴۱)

سید احمد دہلوی کی "لغات النساء" اور "انشائے ہادی النسا" دونوں کی اشاعت کا سال ۱۸۷۵ء ہے شروع میں "ہادی النسا" اور "تحریر النسا" دو الگ الگ تصانیف تھیں۔ مگر بعد ازاں اس کے کئی ایڈیشن یکے بعد دیگرے سامنے آئے۔ جن میں ان دونوں کو ملا کر ایک کتاب کی صورت دی گئی ۱۸۷۵ء تا ۱۹۰۰ء تک اس کے دو ایڈیشن چھپ چکے تھے۔

سید احمد دہلوی جب "فرہنگ آصفیہ" جیسے ایک بڑے منصوبے میں مصروف تھے اس دوران بھی انہوں نے خواتین کی تعلیم و تربیت کے حوالے سے اس پہلو کو قطعاً نظر انداز نہ کیا اور "لغات النساء" اور "انشائے ہادی النسا" اور "تحریر النساء" جیسے بیش قیمت نسخے شائع کروائے جن کی ضرورت و اہمیت کا اہل برِ صغیر پاک و ہند نے بخوشی خیر مقدم کیا۔ جن دنوں "لغات النساء" اور "انشائے ہادی النسا" کے اولین ایڈیشن سامنے آئے ان دنوں برصغیر میں خطوط و انشاء کے مجموعے شائع کروانے کا بازار گرم تھا ۱۸۶۸ء میں "عودِ ہندی" کے

نام سے مرزا اسد اللہ خان غالب کے خطوط شائع ہو چکے تھے۔ خواتین کی زبان و محاورات کا بڑا ذخیرہ اور ان کی تربیت کے مقاصد کے پیش نظر "مراۃ العروس" جیسا اردو کا پہلا ناول بھی چھپ چکا تھا، لغات و قواعد کی کتب مرتب کی جارہی تھیں۔

ان تصانیف کے لئے بنیادی طور پر ڈاکٹر فیلن نے ہی سر سید احمد خان کو اکسایا اور ان کی یہ تحریک تعلیم و تربیت نسواں کے لیے ایک اہم قدم ثابت ہوئی۔ جب "ہادی النسا" اور "تحریر النساء" شائع ہوئیں تو انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ یہی ماجرا "لغات النسا" کی اشاعت سے ہوا جب برِ صغیر پاک و ہند کے تمام بڑے اخبارات نے اس وقت کی اشاعت کا خیر مقدم کیا اور اس پر ریویو لکھے گئے ڈاکٹر فیلن نے تو نسائی زبان کی خاطر اٹھائے گئے اس قدم پر دل کھول کر تعریف کی اور سید احمد دہلوی کی نسائی زبان اور نسائی تربیت کے اقدامات کو بہت سراہا بلکہ "ہادی انساء" کی اشاعت پر ڈاکٹر فیلن کے الفاظ تھے کہ ہم سے پوچھو تو اس کتاب میں "مراۃ العروس" سے بھی کہیں زیادہ عورتوں کے محاورے پائے جاتے ہیں۔ گارساں دتاسی نے بھی علی گڑھ اخبار میں سید احمد دہلوی کی نسائی زبان و بیان کے لیے ان کاوشوں پر بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔ گارساں دتاسی نے ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ اخبار کی گیارہ جون کی اشاعت میں اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:"سید احمد دہلوی نے خاص طور پر عورتوں کے لیے "انشائے ہادی النساء"نامی ایک کتاب لکھی ہے اس کا اندازِ تحریر مصنف کے سلامتِ ذوق کا ثبوت ہے انہوں نے بیگماتی اردو زبان کی بہترین مثال پیش کی ہے۔"(۴۲)

سید احمد دہلوی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے "لغات النساء" میں نہ صرف بیگماتی زبان کا انتخاب شامل کیا اور ان کے روزمرہ محاورات کو جمع کیا بلکہ انہوں نے بیگماتی زبان کے علاوہ بولی ٹھولی اور عام عوامی زبان کے ہزاروں الفاظ کو بھی لغت کا حصہ بنایا۔ کہاوت بھی نسائی زبان میں اپنا الگ ہی ذائقہ اور الگ پہچان رکھتی ہے۔ عورتیں چونکہ گھر اور گھر داری سے جڑی ہوتی ہیں گھریلو زندگی کے معمولات، خانہ داری کی باتیں، سوتن کے جھگڑے، اولاد کے بکھیڑے، سنگھار کی باتیں، لباس اور زیورات کے موازنے، رشتہ داریوں کے تقاضے، وضع داریوں کے قرینے اور زندگی کے ایسے کون سے موضوعات ہوں گے جو ان کہاوتوں میں نہیں سمائے۔ سید احمد دہلوی نے "لغات النساء" میں نسائی ضرب الامثال و کہاوتوں کو بھی شامل کیا جیسے:

آپ یہاں صو بیدار گھر میں بیوی جھونکے بھاڑ۔

آپ پڑوسن گھر بھی لے جا، آپ پڑوسن مجھ سی ہو۔

اپنا گھٹنا کھولیے اور آپ ہی لاجوں مریے۔

اپنا پوت پرایاڈھٹینگر۔
اتنی سی جان گز بھر کی زبان۔
آٹے کا چراغ گھر رکھوں تو چوہا کھائے باہر رکھوں تو کوالے جائے۔
آگ لگائے پانی کو دوڑے۔
ایتر کے تیتر باہر باندھوں کہ بھیتر۔
ایتری نے دیا تیتری نے کھایا جیب جلی نہ سواد آیا۔
ٹاٹ کی انگیا مونجھ کی تنی دیکھ میرے دیور میں کیسی بنی۔
جب دانت نہ تھے تو چنے تھے جب دانت ہوئے تو چنے نہیں۔
جہاں دیکھے توپرات وہاں گاوے ساری رات۔
چوہا بل میں سماتا نہیں دم سے باندھا چھاج۔
چونی بھی کہے مجھے گھی سے کھاؤ۔
داتا دے بھنڈاری کا پیٹ پھٹے۔
دستر خوان بچھانے میں سو عیب نہ بچانے میں ایک عیب۔
دمڑی کی ہانڈی بھی لیتے ہیں تو دیکھ بھال کر۔
دیکھا نہ بھالا صدقے گئی خالہ۔
سر سہلائے بھیجا کھائے۔
سہاگن کا بچہ پچھواڑے میں ہی کھیلتا ہے۔
شاہ عباس کا علم ٹوٹے، وغیرہ وغیرہ

ان کہاوتوں سے ہندو مسلم معاشرے کے ثقافتی پس منظر کا بھی بخوبی جائزہ لیا جاسکتا ہے پھر ہر کہاوت عذر بالمثل اپنے ساتھ اپنے تاریخ کے اوراق اٹھا کر لاتی ہے ضابطہء تحریر میں آنے سے قبل الفاظ وتراکیب نے صدیوں کا سفر کیا ہوتا ہے۔ تب ہی عام روزمرہ گفتگو کا حصہ بنتے ہیں۔ ایک ادیب یا شاعر صرف اپنے عہد کا ترجمان نہیں ہوتا وہ اپنے عہد میں زندہ ان تمام قدیم ثقافتوں اور علوم کے ساتھ ساتھ سماجی شعور کا امیں بھی ہوتا ہے جس نے ان لفظوں کی تصویریں بنا کر ماضی کو حال سے منسلک کرنا ہوتا ہے اور بنانا ہوتا ہے۔ اس طور پر بھی تربیت اس کے قلم سے ہوتی چلی جاتی ہے یہ کہاوتیں، ضرب الامثال اور محاورات وہ دریچے ہیں جن کی

مدد سے، حال کے مکان سے ماضی کے جہان کا دریچہ کھول کر دیکھا جا سکتا ہے، رجحانات کو پرکھا جا سکتا ہے، فکر کے زاویوں کو سمجھا جا سکتا ہے اور سید احمد دہلوی جیسے ادیب اپنی محنت سے بیک وقت لسانی اور سماجی تربیت کا فرض بخوبی ادا کر کے مثال قائم کر جاتے ہیں۔ اردو کہاوتوں اور ان کے سماجی اور لسانی پہلو میں یونس اگاسکر نے مختلف تہذیبی و ثقافتی پس منظر کے علاوہ مختلف طبقات اور شعبوں سے وابستہ برِ صغیر پاک و ہندی ماحول میں جنم لینے والی کہاوتوں کو ترتیب سے مرتب کیا ہے. ان کے اس تحقیقی مقالے کے پیش لفظ میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں :

" کہاوتیں یا ضرب الامثال گھڑی یا بنائی نہیں جاتیں۔ کوئی فردِ واحد یا ادارہ یا انجمن ان کے وضع کرنے یا بنانے پر مامور نہیں ہوتی یہ ان خود رو پھولوں کی طرح ہیں جو نہ صرف دشت و بیابان میں بلکہ چٹانوں کا سینہ چیر کر بھی نکل آتے ہیں اور اپنے حسن اور کشش سے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں۔ زبان کی زمین کی تہوں سے نکلنے والی کہاوتیں اور مثلیں کہیں صدیوں کے عمل میں رواج اور چلن کے ذریعے اس مرتبے پر پہنچتی ہیں جہاں وہ تراشیدہ ہیروں کی طرح چمکنے لگتی ہیں اور ان سے کلام میں نہ صرف حسن اور زور بلکہ معنیاتی گہرائی اور تہ داری بھی پیدا ہوتی ہے۔"(۴۳)

یونس اگاسکر نے اس کتاب میں جو کہاوتیں سماجی و ثقافتی پس منظر میں جمع کیں ان میں نسائی کہاوتوں کی تعداد بھی قابل ذکر ہے۔ مثال کے طور پر:

تھالی پھوٹی نہ پھوٹی لوگوں نے جھنکار سن لی`۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھی۔

تھو تھا چنا باجے گنا۔ من بھاوے منڈیا ہلائے۔ آپڑوسن مجھ سی ہو۔ آپ صو بیدار جورو جھونکے باڑ۔

آپ ہارے بہو کو مارے۔ آملے کا کھایا بزرگ کا فرمایا پیچھے معلوم ہوتا ہے۔ آنکھوں کی سوئیاں نکالنا رہ گئی تھیں۔. بڈھی گھوڑی لال لگام۔ تن پر نہیں لتا پان کھائیں البتہ۔ توا نہ تغاری مفت کی بٹھیاری۔ توے کی تیری ہاتھ کی میری۔ تولہ بھر کی آرسی نانی بولے فارسی۔ خالی گھر دیوانی بیوی۔ ڈولی نہ کہار بیوی بیٹھی ہیں تیار۔ نند کا نندوئی گلے لگ لگ روئی۔

سید احمد دہلوی ایک محقق بھی تھے اور معلم بھی، موءلف بھی تھے اور مصنف بھی، وہ ایک تاریخ دان بھی تھے اور ماہر لسانیات بھی۔ انہوں نے تہذیب و تمدن کو اپنے گرد جیتا جاگتا دیکھا اور اس کے سماجی اور اخلاقی تقاضوں کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے نہ صرف ثقافت کو "رسومِ دہلی" کی صورت میں محفوظ کیا

بلکہ ادبی، معاشرتی، اخلاقی اور اصلاحی امور پر خصوصی توجہ دیتے ہوئے خواتین کی تعلیم وتربیت بابت کئی کتب تصنیف کیں۔ زہرہ جبین لکھتی ہیں:

"ناری کتھا" جس میں عورتوں کے محاورے ہیں "راحت زمانی" میں عورتوں کے لیے اخلاقی افسانے ہیں "ساجن موہنی" میں تسخیر شوہر سے متعلق بہت مفید مشورے ہیں۔ ان کے رسم و رواج پر تفصیلی معلومات ہیں اس سلسلے کی کڑی "رسوم اعلی ہندوان دہلی" ہے زنانی لٹریچر تانیثی ادب سے متعلق دوسری کتابیں "ہدایت النساء "، "تحریر نساء"، "لغات النسا" اور "ہادی النساء" ہیں۔"(۴۴)

سید احمد دہلوی کی نسائی زبان و ادب کے حوالے سے خدمات کو اردو زبان کی اولین خدمات کا درجہ حاصل ہے اس سے قبل کسی مصنف و مؤلف کی اتنی کثیر تعداد میں تصانیف نظر نہیں آتیں جو ان کے ہاں "اخلاق النسا"، ، "تحریر النساء" رسومِ دہلی، رس بکھان "، "راحت زمانی"، "ساجن موہنی" (یعنی تسخیرِ شوہر جو ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی تھی) "علم النساء "، "فسانہء راحت "، " مجالس النساء"، "لغات النسا" اور "ہادی النسا" کی صورت لسانی اور اخلاقی تعلیم وتربیت کی نیت سے لکھی گئیں۔ اور نہ صرف یہ نسخہ بلکہ انہوں نے گاہے گاہے مختلف مضامین بھی اس مقصد کے لیے لکھے۔

زہریٰ جبین "سید احمد دہلوی حیات اور کارنامے" میں لکھتی ہیں:

"ان تصانیف کے علاوہ سید احمد نے مختلف سماجی اور معاشرتی مسائل پر متعدد مضامیں لکھے ہیں جو اس دور کے رسالوں "خاتون" اور "عصمت" وغیرہ میں بھی آئے دن شائع ہوتے رہتے تھے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے مثلاً عام زمانہ `مذاق کی نکتہ چینی کہنے کا رواج، تربیت اولاد، عورتوں کا مادہ قابلیت اور مردوں پر فضیلت، ہمدردی وغیرہ شامل ہیں۔"(۴۵)

مصنفہ لکھتی ہیں کہ برِ صغیر پاک وہند میں پردے کے رواج کی وجہ سے خواتین کی زبان زیادہ خالص اور زیادہ سادہ ہوتی ہے اور ان کو یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے مطالب کی ادائیگی کے لئے نئے الفاظ ایجاد بھی کر لیتی ہیں ان میں سیکڑوں الفاظ و محاورے اور کہاوتیں اس طرح کی موجود ہیں جو صرف اور صرف عورت کی زبان سے متعلق ہیں اور اب اردو زبان کا ادبی اور غیر ادبی سطح پر حصہ بن چکی ہیں۔ "لغات النساء" میں اکثر جگہوں پر مؤلف نے مختلف الفاظ کا اصل ماخذ بھی بتایا ہے جیسا کہ "اشلک لگانا" معنی تہمت لگانا. اصل

میں ترکی زبان کے لفظ "اُشلق" سے نکلا ہے کثرتِ استعمال اور تلفظ کے بگڑنے سے یہ اُشلق" سے اشلک بن گیا۔اب عام روز مرہ میں "اشلکہ چھوڑنا" اور اشلک لگنا، اشغلا اٹھانا، بھی بولا جاتا ہے اور جس کے معنی نیا فساد ڈالنا کے ہیں جو کسی کے افواہ یا تہمت لگانے کے معنوں میں خواتین استعمال کرتی ہیں۔ عموماً پنجابی زبان میں یہ لفظ پنجابی محاورے نیا اشکلہ چھوڑنا یعنی نئی بات کرنا یا پھیلانا یا سنسنی پھیلانے کے معنوں میں بھی بولا جاتا ہے، اختراع نکالنے کے معنوں میں بھی خواتین کو بولتے سنا ہے۔

اسی طرح "ببری" کٹے ہوئے چھوٹے بالوں کو کہا جاتا ہے یہ لفظ بربری نسل کی بکری کے بالوں کی نسبت سے ببری بنا۔ بربری نسل کی بکریوں کے بال عموما میدانی علاقوں کی پالتو بکریوں کی نسبت بڑے اور گھنے ہوتے ہیں۔ پنجابی میں یہ لفظ اب ببری کے بجائے "بودی کٹوانا" یعنی ماتھے کے سامنے کے کچھ بال چھوٹے کروانا کے لیے بولا جاتا ہے۔

"جماگی "بظاہر بے معنی لفظ نظر آتا ہے مگر یہ "جمعگی "کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ جمعگی" بروز جمعہ سے نکلا ہے۔ اس عہد میں گھر کے بچوں کو جیب خرچ جمعہ کے دن ملا کرتا تھا جو ہر جمعہ کے جمعہ یعنی ہفتہ وار جیب خرچ کہلاتا تھا۔ اس طرح لفظ کچلوندی" آدھی اور بچی ہوئی یا کچی کچی روٹی کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ کچی اور ڈھیلی ڈھالی گودے دار روٹی کو بھی کچلوندی یا گلگلی روٹی بولتے ہیں یعنی گیلی گیلی۔

اسی طرح بہت زیادہ گلا کر پکائے گئے سالن کے لیے بھی "بھتہ "کا لفظ بولتے آئے ہیں بڑی بوڑھیاں اکثر کہتیں کہ "آئے ہائے یہ کیا بھتہ بنا دیا" یعنی سبزی یا گوشت اگر پکانے میں زیادہ گل کر اپنی اصل شکل برقرار نہ رکھ سکے اس کو "بھتی" یا بھتہ کہہ دیا جاتا تھا۔ اسی نسبت سے وہ گاڑھا گاڑھا تھوڑا نرم سا حلوہ جسے فوتگی والے گھر جنازہ اٹھنے کے بعد تقسیم کیا جاتا تھا اسے خواتین "بھتی "کہا کرتی تھیں۔

کسی کو کوسنا دینا ہوتا تو تب بھی بولا کرتیں کہ "نگوڑی تیری بھتی پکاؤں "یعنی تو مرے تو تیرے مرنے کا کھانا کھاؤں۔

بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ رسوم و رواج میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ اور یہی تبدیلیاں زبان میں آہستہ آہستہ جگہ بناتی چلی جاتی ہیں جن میں ہر طرح کے الفاظ چاہے وہ ادبی ہوں یا غیر ادبی ہوں، عامیانہ، سوقیانہ سبھی شامل ہوتے ہیں۔ لیکن اس لغت کے لیے انھوں نے یہ اہتمام کیا تھا کہ نسائی زبان کی لغت میں عامیانہ اور فحش الفاظ کی شمولیت سے گریز کیا جائے۔ کیونکہ یہ لغت عام لغت نہیں تھی اس میں تخصیص اور انتخاب کو دخل تھا۔

"موجودہ روزمرہ بھی خود اس کی شہادت دینے کو موجود ہے کہ بے شک یہ شریفانہ لغات الخواتین ہے عامیانہ الفاظ سے سے مبرا، جاہلانہ گفتگو سے پاک بلکہ توہمات کو جتا کر دور کرنے والی محققانہ لغت ہے۔اس وقت قلمبند ۳۹۰۰ لغات و محاورات وغیرہ موجود ہیں یعنی اب تک بہت بڑھ جانے کی امید لگی ہوئی ہے بشر طیکہ اس کا مدون اس وقت تک زندہ وسلامت رہے یہ لغت اس قابل ہے کہ ہر شریف گھر اور ہر زنانہ سکول اور ہر کتب خانہ میں رکھی جائے بعض موقعوں پر تاریخی ثبوت بھی اس کے اندر موجود ہے کہیں کہیں فلسفیانہ مسائل سے بھی کام لیا ہے غرض نے جو کچھ کیا ہے اپنی بساط سے باہر کیا ہے۔"(۴۶)

لفظوں کی اقسام بنا کسی تمیز کے ایک منطقی یا طے شدہ ترتیب کے ساتھ لغت میں شامل ہوتی ہیں مولوی عبدالحق اپنے مضمون "اردو لغات اور لغت نویسی" مشمولہ "اردو لغت نویسی کی تاریخ مسائل اور مباحث" میں لکھتے ہیں لغت نویس نقاد نہیں ہونا چاہیے جو یہ فیصلہ کرتا پھرے کہ کون سا لفظ مستند فصیح اور کونسا ٹکسالی زبان سے باہر کا ہے اس کا کام ہے اندراج کرنا وہ لکھتے ہیں:

"بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو ایک زمانے میں عورتوں سے مخصوص تھے اور اب تمام ادب میں داخل ہوگئے ہیں اور یہی عامیانہ اور پیشہ وروں کے الفاظ اور محاوروں کا حال ہے ہماری زبان میں بہت سے ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو ایک وقت میں صرف بعض پہلو سے مختصر تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ عام الفاظ میں شریک ہو کر ادب کی زینت کا باعث ہوگئے۔ایسے الفاظ خواہ وہ عورتوں کے ہوں یا پیشہ وروں کے ادائے مطلب میں خاص حسن پیدا کرتے ہیں ان کے سوا اجنبی زبانوں کے الفاظ ہیں جو اردو زبان میں داخل ہو چکے ہیں یا ہو رہے ہیں ان کا شمار بھی عام الفاظ میں ہونا چاہیے پھر اعلام ہیں جن کا اگرچہ عام لغت سے کوئی خاص تعلق نہیں لیکن کچھ ان میں ایسے ہیں جن سے ادب میں جگہ جگہ مڈبھیڑ ہوتی ہے۔(۴۷)

مولوی عبدالحق نے سید احمد ہلوی کے ہاں لغت میں درج کیے جانے والے تمام نسائی الفاظ کی بابت واضح طور پر کہا ہے کہ وہ برِ صغیر پاک وہندی تمام نسائی الفاظ جو چاہے کسی بھی طبقے کی عورتیں بولا کرتی تھیں وہ "لغات النساء" میں سید احمد دہلوی نے جمع کر دیے ہیں۔یہ چار ہزار سے زائد الفاظ ہیں جن میں مفردات بھی ہیں مرکبات بھی انھوں نے لکھا ہے کہ سید احمد دہلوی نے نسائی زبان کی تحفیظ و تدوین میں سب سے زیادہ کردار ادا کیا۔ان کے کسی ہم

عصر نے لسانی سطح پر اس قدر اہمیت نسائی زبان کو نہیں دی ہو گی اس لغت میں نسائی زبان سے متعلقہ الفاظ و محاورات کا ایک خزانہ موجود ہے "اس میں روز مرہ اور محاورات بھی ہے اور کہاوتیں و ضرب الامثال بھی الغرض اس لغت میں اس عہد میں بولے جانے والی زبان کی بہت حد تک مکمل تصویر موجود ہے۔"(۴۸)

iii۔ انشائے ہادی النسا: سید احمد دہلوی

"انشائے ہادی النسا" کے نام سے خواتین کی خط و کتابت پر مبنی ایک مجموعہ ۱۸۷۵ء میں سامنے آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے برِ صغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں مقبولیت حاصل کرتا چلا گیا۔ اس کے بعد ازاں کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ "انشائے ہادی النسا" پانچ ابواب پر مشتمل ہے اس کے پہلے باب میں بڑی بوڑھیوں کے نام خطوط ہیں جن میں بچوں کو کھلانے کے فقرے اور لوریاں بھی شامل ہیں اور میاں بیوی کے خطوط بھی ہیں۔

دوسری فصل میں بہنوں کے نام خطوط ہیں جن میں پہیلیاں، شادی بیاہ کے گیت، اور منڈھا یعنی بارات کے گیت شامل ہیں جب کہ اس کی تیسری فصل میں ہم جولیوں اور برابر کی سہیلیوں کے نام خطوط ہیں ان میں پہلیلیاں، برسات کے گیت، کہہ مکرنیاں، گیت اور نظمیں شامل ہیں۔

چوتھی فصل میں گھر کے ملازموں کے نام خطوط ہیں۔ ان میں ماماؤں کے نام خطوط ہیں چھُو چھُو کے نام خط بھی شامل ہیں ان خطوط میں کہاوتوں اور پہیلیوں کا بھی ذکر ہے۔ اس کتاب کا پانچواں باب مردوں کے نام خطوط پر مشتمل ہے کنواری بیٹیوں کے نام خطوط اور کچھ خطوط کاروباری مردوں کے نام، نوکروں چاکروں کے نام عورتوں کی طرف سے عرضی پُرزے بھی اس میں شامل ہیں۔

یہ پانچواں باب دراصل "تحریر النسا" کے نام سے ایک الگ کتاب تھی جس کو بعد ازاں اسی کتاب میں شامل کیا گیا۔ اس میں کاروباری خطوط ہیں اور مردوں کے نام، شوہر کے نام خطوط ہیں۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۷۵ء میں چھپ کر سامنے آیا۔

> "یہ کتاب بظاہر صرف انشاء یا خطوط نویسی کی کتاب ہے لیکن در حقیقت وہ بڑی قدر و قیمت کی چیز ہے اس کتاب سے عورتوں کے خانہ داری کے کل معاملات، ملنے جلنے اور رسم و رواج، بچوں کے کھلانے کے ڈھنگ، کہاوتیں، پہیلیاں، غرض برِ صغیر پاک و ہندی زنانہ زندگی کا ہر پہلو بخوبی ظاہر ہوتا ہے (۴۹)

اس مجموعے میں سے ایک خط کا ذکر کیا جاتا ہے جو دادی اماں کے نام لکھا گیا تحریر کچھ یوں ہے
"دادی اماں! تمہیں خبر بھی ہے بی آپی آئے دن میرا کلیجہ گودا کرتی ہیں۔ سو دشمنوں کی ایک دشمن ہیں چھری کو پائیں تو ان کو نہ پائیں۔ کبھی تو اماں کو لگا دیتی ہیں کہ اماں جان اس کا سینے پر دھیان نہیں ٹکتا۔ کبھی استانی جی کو کہتی ہیں کہ دیکھیں تو جی کتاب کھلی رکھی ہے شیطان پڑھ رہا ہے یہ سارے گھر کے جالے لیتی پھرتی ہے۔ ادھر سے اماں مارتی ہیں ادھر سے استانی جی گُھرکتی ہیں۔ مجھ کم بخت کی شامت آجاتی ہے میرا تو ان کے ہاتھوں ناک میں دم ہے"

اس خط کا فطری انداز بتاتا ہے کہ ایک بچی جو اپنی دادی جان کو چھوٹی چھوٹی باتوں پر شکایت نامہ لکھتی ہے۔ کیوں کہ چھوٹے بچے گھر کے بزرگوں کے بہت قریب ہوتے ہیں اور ان کے لاڈ پیار کے باعث انہیں اپنا ہمدرد و غمگسار سمجھتے ہیں۔ اس مختصر پیراگراف میں بھی کئی محاورات شامل ہیں کلیجہ گودوانا، لگادینا یعنی لگائی بجھائی کرنا، دیدہ نہ ٹکنا اور جالے لیتی پھرنا، شامت آنا، ناک میں دم کرنا وغیرہ

خواتین کی زندگی کے بہت سارے پہلوؤں کا بخوبی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے یہ صرف خطوط نہیں ہیں بلکہ ان کے اندر نسائی زندگی کے بارے میں بہت ساری معلومات اور ان کے طرز فکر اور خیالات کے بابت معلومات ملتی ہیں جیسے کہ ان کی خانہ داری کے اُمور، بچوں کی پرورش کے طور طریقے ان سے لاڈ کرنا، ان کو لوریاں دینا، تقاریب میں جانے کی تیاریوں سے لے کر گیتوں تک ایک دوسرے سے پوچھنا، پھر زبانی یاد کرنا، پہیلیاں بوجھنا الغرض عمومی زندگی کے تمام معاملات شامل ہیں اس کے دیباچے میں سید یوسف بخاری لکھتے ہیں

> "ان خطوط میں ماں باپ، بھائی بہنوں، شوہر، عزیز و اقرباء، نوکروں چاکروں، کاروباری لوگوں، حکومت کے عمال کے نام خطوط اور عرضی پرچے ہیں جن میں اس زمانے کی تہذیب و تمدن، لال حویلی اور شہر کے شرفاء کا طرز معاشرت، رسم و رواج، خانہ داری بچوں کی پرورش کے اُمور دوا دارو تعلیم و تربیت خانگی امور شادی غمی کی تقاریب آپس میں لین دین، ہنسی مذاق، نوک جھونک، صلح اور سیر و تفریح تمام باتوں کو ایسے پیارے اور دل کش مکالمے کے انداز اور روزمرہ کی بولی میں پیش کیا گیا ہے [۵۰]

انداز تخاطب پر غور کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ عین فطری انداز جیسے خالہ کی جان، اے بی چچی، میرے دل کی کنجی، خالہ کی خلیچی، میری لاڈو، بوا جی، اللہ بی فیروزی بوا وغیرہ کہہ کر دوسرے کو مخاطب کرنا جیسا کہ

آمنے سامنے بیٹھے اور گفتگو کر رہی ہو ان کا فطری انداز رقم کرنا بہت غیر معمولی بات تھی۔ اس سے قبل نسائی زبان میں اس قسم کی دھیان کسی کو نہیں آیا تھا۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ۱۸۶۷ میں "عود ہندی" کے نام سے غالب کے خطوط چھپ چکے تھے اور ۱۸۶۷ ء میں ہی "مراۃ العروس" اور "توبۃ النصوح" کے نام سے دو ناول لکھے جا چکے تھے۔ اسی زمانے میں ۱۸۷۵ میں "ہادی النسا" اور "تحریر النساء" جیسے نسائی لب و لہجے کے خطوط کے نمونے سید احمد دہلوی کے قلم سے سامنے آئے تو تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئے۔ ۱۱ جنوری ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر فیلن نے کہا "ہم سے پوچھو تو اس کتاب میں "مراۃ العروس" سے کہیں زیادہ عورتوں کے محاورے پائے جاتے ہیں

ان خطوط میں ہمیں گھروں کے اندر محلات کے اندر بولی جانے والی نسائی زبان کے اندر سننے کو ملتے ہیں جیسے ایک نواسی اپنی نانی سے بچے کو کھلانے کے لیے جو کچھ آپ بولا کرتی تھی وہ مجھے لکھ بھیجیے مثلا

میاں آوے دوروں سے گھوڑے باندھوں کھجوروں سے

میاں آوے دوڑ کے دشمن کی چھاتی توڑ کے

میاں آوے علی، پھول بکھیرے گلی گلی

جُگ جُگ جُگ جُگ جیا کرو دودھ ملیدہ پیا کرو

چندا ماموں دور کے بڑے پکائیں بور کے آپ کھائیں تھالی میں ہم کو دیویں پیالی میں

پیالی گئی ٹوٹ چندا ماموں گئے روٹھ پیالی آئی اور چندہ ماموں آئے دوڑ

اکھو مکھو میری بیوی کو اللہ رکھو

اس میں جو فقرے عام طور پر بچوں کو کھلانے کے وقت بولے جاتے ہیں اور ایک نانی اپنی نواسی کو لکھ بھیجتی ہے تاکہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو لاڈ پیار سے کھلا سکے۔ اسی طرح ماں اپنی بیٹی کو خط لکھ رہی ہے تو اسے کچھ اس طرح سے مخاطب کرتی ہے میرے بنگلے کی مینا! تیرا بولتا خط آیا کلیجہ ٹھنڈا ہوا چھاتی سے لگایا

دل کی کنجی! تیری خاطر بیسہ ٹھیکری کیا ہے خدا تجھے موتیوں میں سفید اور سونے میں پیلا رکھے۔

"لڑکی صورت میں ایسی کے حور کو چھپاؤ اور اسے نکالو رنگ جیسے شہاب انار کا دانہ، نقشہ چاند سا گول، بہت ٹھیک نک سک سے درست، کٹورہ سی آنکھیں، ستواں ناک، بوٹا سا قد، بھنورا سے بال جٹی جٹی بھنویں۔"(۵۱)

ایک جگہ گڑیا کی شادی کا ذکر ہے اور گڑیا کے نکاح کے بول کیسے پڑھائے جاتے تھے دیکھیے

گاجر کی پینڈی گلاب کا پھول کیوں میاں گڈے گڑیا قبول

کالی مرغی سفید انڈے، مہر باندھا بارہ گنڈھے

سلانے کے وقت اکثر خواتین بچوں کو لوری دیا کرتی تھی اور بچہ وہ لوری سننے کا اس قدر عادی ہو جاتا تھا کہ اس کے بغیر سو نہیں پاتا تھا بڑی بہنیں دادی نانی بچوں کو لوریاں دیتی تھی اس کتاب میں سید احمد دہلوی نے کچھ لوریاں شامل کی ہیں مثلاً اللہ اللہ لوری دودھ بھری کٹوری، دودھ میں نکلی مکھی میرے منے کی جان اللہ نے رکھی" (۵۲) اور مزید دیکھیے:

توسو میرے بالے تو سو میرے بھولے جب تک بالی ہے نیند

پھر جو پڑے گا تو دنیا کے پھندے کیسا ہے جھولا کیسی ہے نیند

کھیل تماشے کر لے تو مارے کہتی ہوں تجھ سے آنکھوں کے تارے

زندہ ہے ماں بھی باپ بھی بارے کر لے تو آرام میرے پیارے"

بچوں کو کہ جیب خرچ کے لیے ہفتہ وار جو خرچی ملا کرتی تھی اس کو "جمعگی" کہتے تھے ایک بچی اپنی ماں سے ذکر کرتی ہے کہ اچھی امی مجھ واسطے چھوٹی سی پتیلی کفگیر اور طشتری خرید کر بھیجو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر بچیوں کو بچپن میں چھوٹے چھوٹے برتنوں کے ساتھ کھیلنے کا شوق ہوا کرتا ہے یوں انھیں گھر داری کی عادت ڈالی جاتی ہیں ایک بچی اپنے جمعگی کے چار روپے جمع کرتی ہے اور پھر ساتھ یہ شکایت بھی کرتی ہے کہ اس کا چھوٹا بھائی اس سے وہ پیسے ہتھیانا جاتا ہے جبکہ وہ بچی اپنے لئے چھوٹے چھوٹے برتن خریدنا چاہتی ہے وہ اپنی ماں کو لکھتی ہے اس نے اپنی جمعگی کے چار روپے جمع کر رکھے ہیں اور وہ اپنے لئے چھوٹے چھوٹے برتن خریدنا چاہتی ہے وہ اپنی ماں کو لکھتی ہے کہ اس کا چھوٹا بھائی اس کیسے منانا چاہتا ہے کہ وہ چڑیا اور مہتاب خریدے۔ روایتی مرد کی طرح یہ بھی اظہار کرتا ہے کہ وہ پھلجھڑیوں کی آوازوں سے نہیں ڈرتا کیونکہ وہ مرد ہے اس کا جملہ بڑا خوبصورت ہے کہ ہم تو مردوے ہیں ناں ہوائی چھوڑیں گے ہم کو ڈر نہیں لگتا، اس سے بھی نہیں ڈرتے اور تم پٹاخے کی آواز سے بھاگ جاؤ گی"

ہادی النسا میں گیت بھی ہیں اور برات کے خاص گیت جن کو "مونڈھا" کہا جاتا تھا وہ بھی رقم ہیں۔ کچھ پہیلیاں تو ایسی بھی ہیں جو امیر خسرو کے دور سے آج تک بوجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں

ایک نار کے پیٹ نہ آنت اوپر نیچے دانت ہیں دانت۔ (کنگھی)

ثریا بیٹھی ہو بہو چپکی بیٹھی روبرو۔(آرسی مصحف)

سامنے آوے کر دے دوماراجائے نہ زخمی ہو (آئینہ)

ڈاکٹر فیلن نے کسی حد تک درست ہیں فرمایا ہے کہ کتاب میں بے شمار نسائی محاورات شامل ہیں اس کے علاوہ بہت سارے ایسے الفاظ بھی ہیں مثلانو مہینے کی رسم کو "نوماسہ" کہنا، ننگے سر یا کھلے سر رہنا، میاں کے گھر یہاں میاں سے مراد اللہ کا گھر ہے، نبختی یعنی کمبخت، مردوا (لکھنو میں مردوں کی تحقیر کے لیے مردوا کا لفظ بولا جاتا تھا) مشجر یعنی ریشمی کپڑا پھول دار کپڑا کو کہا جاتا تھا مسی روٹی: یعنی موٹے چھوٹے اناج کی روٹی کو بولا جاتا تھا۔ مونڈھا: دلہن کی رخصتی کا گیت کہلاتا تھا۔

للو پتو کرنا یعنی خوشامد کرنا، مٹھلونا یعنی کم نمک والا سالن کو کہا جاتا تھا۔ ماتی بچوں کو پالنے والی عورت کو کہتے تھے ماما گھر کے کام کرنے والی عورت، گیڑیاں بچوں کے کھیلنے کی لکڑیوں کو کہا جاتا تھا ترکی میں "قلماق "ایشیائے روس کے جنوبی علاقے کی ایک خانہ بدوش عورت اس کو کہتے تھے جو شاہی محل کے سپاہی کے بطور بھرتی کی جاتی تھی اس کو قلمہ قنی کہا جاتا تھا۔

قتامہ، بے حیا، فاحشہ کو" پتنگ چھری" لڑائی کروانے والی عورت کو کہا جاتا۔ "آتو" کا لفظ استانی کے لیے بولا جاتا۔ کلجوٹی کاجل کی ڈبیا، کھنڈلا ٹوٹا مکان، بھات ،بھاتہ اور بھتہ زیادہ گلے ہوئے چاول۔ ہادی النساء" کو نسائی زبان میں خطوط کی پہلی مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ جس نے خواتین کو الگ اسلوب میں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کا راستہ دکھایا وہ جو انیسویں صدی کے ابتدائی نصف تک مفرس و معرب، مقفع و مسجع خطوط ، پر تکلف اور پر تصنع دقیق و پیچیدہ اسلوب میں لکھے جاتے تھے وہ اپنی جگہ ایک واہمہ ہی کہے جاسکتے ہیں مرزا غالب نے "عودِ ہندی" کی صورت میں اس روش کو ماضی کے دبیز پردوں سے نکال کر عام روزمرہ کی زبان بنا دیا اور دوم ان کی دیکھا دیکھی سید احمد دہلوی نے جہاں "فرہنگ آصفیہ "کی تدوین و ترتیب میں از حد مصروف ہونے کے باوجود خواتین کے لیے یہ دو کتب مرتب کی اور ان کے کئی ایڈیشن پے در پے چھاپنا شروع ہو گئے برِ صغیر پاک و ہند کے کونے کونے سے اس کاوش کو سراہا گیا یہ عام عورت کی زبان تھی اور عام عورت کی روزمرہ زندگی کے معمولات تھے۔ خانہ داری اور رشتہ داری کے موضوعات تھے سینے پرونے اور گڑیا کی شادی کے تذکرے تھے لوریاں اور پہیلیاں تھیں منڈھے تھے بہنوں بھائیوں کی نوک جھونک تھی بزرگوں کی سختی اور استانی کی ڈانٹ ڈپٹ کی شکایتیں بھی اس میں رقم تھیں۔

IV. امیر اللغات: امیر احمد امیر مینائی

سر الفریڈ لائل کی ایما پر امیر مینائی نے ۱۸۸۴ء میں کام شروع کیا اور ۱۸۹۱ء میں اس کا پہلا نمونہ "امیر الغات" جلد اوّل کی صورت میں شائع ہوا جس میں ابتدائی طور پر حرف "الف ممدودہ" اور پھر دوسری جلد "الف مقصورہ" کی صورت میں ۱۸۹۲ء میں جلد دوم سامنے آئی۔ تیسری جلد پر مزید کام جاری تھا کہ ۱۸۹۹ء میں آتش زدگی کے باعث دفتر وکتب خانہ خاکستر ہو گیا۔ اور یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ امیر مینائی کی "امیر اللغات جلد سوم" کی تدوین ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے کی اور اس کی اشاعت اورینٹل کالج لاہور سے عمل میں آئی۔

امیر مینائی نہ صرف یہ کہ بہت اچھے شاعر اور لغت نویس تھے بلکہ وہ ایک صوفی، ایک عالم، ایک فقیہ، زبان دان اور علمِ جفر کے ماہر بھی تھے۔ ان کی دو کتب علمِ جفر پر ان کی دسترس کی گواہ ہیں۔ وہ فلسفہ، قانون، طب، منطق اور علمِ موسیقی جانتے تھے۔ ان کی پچاس کے قریب تصانیف اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ وہ ایک نابغہء روزگار شخصیت تھے۔

اس لغت میں جہاں دہلی و لکھنو کی زبان کے مرکبات ضرب الامثال، محاورات، مقولے، تشبیہات، صفات و استعارات، عام بول چال کے الفاظ سے لے کر پیشہ ورانہ و قانونی اصطلاحات، بولیوں ٹھولیوں رسوم و رواج، متضاد و مترادفات کو شامل کیا گیا وہاں یہ اہتمام خاص طور پر برتا گیا کہ عورتوں کی زبان، عورتوں کی دعا، عورتوں کی لڑائی کے دوران طعنے تشنوں، بد دعاؤں، کوسنوں اور عورتوں کے رسوم و رواج اور روزمرہ کو لغت میں شامل کیا گیا۔ شاعرانہ الفاظ اور عام بول چال کے الفاظ کو تخصیص سے شامل کیا گیا۔۔ امیر الغات کی پہلی جلد کی اشاعت پر اس وقت کے ایک مقبول اخبار مفید عام مطبوعہ یکم مئی ۱۸۹۱ء میں ریویو چھپا جس میں رقم تھا:

> "اس لغت کے آٹھ حصے ہونگے جن میں پہلا حصہ صرف الف ممدودہ کا چھپ کر نہایت عمدہ خوشخط تقطیع کلاں ۲۰-۲۶ پر شائع ہوا ہے جس کے صفحات ۳۲۶ ہیں اور جس میں تقریباً تین ہزار مفردات اور مرکبات صرف الف ممدودہ کے درج ہیں۔ اس لغت سے نہ کوئی مثل اور نہ کوئی اصطلاح اور نہ کوئی محاورہ اور نہ عورت کے مخصوص محاورات و اصطلاحات بچے ہیں بلکہ پیشہ والوں اور عوام الناس اور خواص کی

گفتگو کا فرق دکھایا ہے۔ غرض منشی صاحب نے بڑی محنتِ شاقہ اور عرق ریزی شبانہ روز میں اس حصے کو تالیف کیا ہے۔[۵۳]

ڈاکٹر رؤف پاریکھ نے اپنی تصنیف "اردو لغات، اصول اور تنقید" میں ان کے ایک قلمی نسخے کا ذکر کیا ہے جس کا نام "محاورات و مصادر" ہے۔ اس مسودے میں لغت کے انداز میں الفاظ درج ہیں اور سند کے اشعار بھی موجود ہیں مگر تشریح نہیں کی گئی ہے۔ اس قلمی نسخے کے ۷۰۰ صفحات ہیں۔ اس کا پہلا لفظ ان کے قلم سے "آپ بیتی" ہے اور آخری اندراج "یہ کیا زبان نکالی ہے" کے بعد تمام شد لکھا گیا ہے۔ یہ نسخہ ان کے دستخط اور ختم شد کے ساتھ یکم مارچ ۱۸۹۸ء کی تاریخ کے ساتھ محفوظ ہے۔

"امیر اللغات" میں مولوی عبد الحق کے بقول عربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کے جو الفاظ شامل ہو چکے ہیں اور تحریر و تقریر میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں وہ اس لغت میں شامل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ لکھنوی اور دہلوی زبان کے اختلاف کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جہاں ضروری تھا وہاں وضاحت بھی کر دی گئی ہے۔ مولوی عبد الحق "امیر اللغات" بابت لکھتے ہیں

"تذکیر و تانیث کی تحقیقات نہایت خوبی سے کی ہے مستند شعرا کی مثالوں سے اختلاف کی گتھی بھی سلجھا دی گئی ہے۔ نئی اور پرانی زبان کا فرق الگ الگ دکھا دیا گیا ہے۔ جو لغات صرف شاعرانہ خیال کے ادا کرنے میں مستعمل ہیں ان پر ظث کی علامت (اختصاص نظم و نثر) بنا دی گئی ہے۔ جس سے خاص کر شعرا کو بہت مدد مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں کی زبان، پیشہ والوں کی خاص اصطلاحیں، فقرا کی صدائیں، آزادوں کی بولیاں ٹھولیاں، مختلف مذاہب کی تہوہار اور شادہ و غمی کی رسمیں وغیرہ بھی اپنے اپنے موقع پر بیان کی گئی ہیں۔"[۵۴]

امیر مینائی لکھنو سے تھے مگر دہلوی اردو کے الفاظ و محاورات بابت بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ جدید طرزِ فکر کے انسان تھے اس لیے ان کی خواہش تھی کہ لغت بھی جدید خطوط پر مرتب کی جائے مگر کتابت کے معاملے میں انھیں کافی دشواریوں کا سامنا رہا۔ اس کا تذکرہ انھوں نے ممتاز علی آہ کو لکھے گئے ایک خط میں بھی کیا۔ پہلی جلد میں جو کمی بیشی تھی اسے مبصرین کی رائے کے بعد دوسری جلد میں کافی حد تک دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ انھوں نے دہلی اور لکھنؤ دونوں دبستانوں سے برابر اسناد بھی پیش کیں کسی ایک کو ہی پیشِ نظر نہیں رکھا۔ ابو محمد سحر اپنے مضمون "امیر مینائی کی لغت نویسی" میں لکھتے ہیں: " اردو زبان کے عام لغت کے

تقاضوں کے پیشِ نظر انھوں نے دہلی اور لکھنؤ دونوں جگہ کی زبان کالحاظ رکھاہے اور سند میں دہلی اور لکھنؤ کے شعرا کے کلام سے برابر مثالیں دی ہیں۔"(۵۵)

کریم الدین احمد نے بھی اپنے مضمون میں امیر مینائی کے دہلوی زبان اور بالخصوص محاورات کو شاملِ لغت کرنے کی تائید کرتے ہوئے کہاہے جیسا کہ ایک لفظ "آپا" ہی کو لے لیجیے کہ اس سے وابستہ کتنے الفاظ جیسے: بڑی آپا، چھوٹی آپا، آپا اماں، آپا بی بی، آپا جان، آپا جانی، آپا جنیا وغیرہ ہر ایک کی الگ الگ سند پیش کی ہے۔ اکبری اور اصغری کے مکالموں سے مثالیں بطور سند اٹھائی ہیں۔ مولوی عبد الحق، کی رائے جو رسالہ قمر، میں مارچ ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی اور اس کا تذکرہ امیر اللغات میں موجود ہے۔

"قریب قریب ہر محاورہ کی سند میں اساتذہ کا کلام پیش کیا گیاہے۔ جس سے کچھ شک نہیں کہ محاورات و الفاظ کا استعمال ہر دیکھنے والے کی سمجھ میں بخوبی آجاتاہے۔ بعض مقاموں پر صفات و تشبیہات بغیر مثال کے بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر کچھ زیادہ ضروری نہیں لیکن ہماری رائے میں ان کو بھی مثال دے کر سمجھا دینا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر مبتدی کی سمجھ میں اچھی طرح نہیں آسکتا۔"(۵۶)

عورت کی زبان میں کئی الفاظ ایسے ملتے ہیں جو مرد کی عام روزمرہ گفتگو کا حصہ تو ہیں مگر مردوں سے زیادہ عورتیں بولتی ہیں جیسے کل نہیں تو پرسوں اور اَترسوں: پرسوں سے اگلا دن۔ اسی طرح عورتیں اکثر دوسری کسی عورت کو تحقیر کے معنوں میں بھی کہتی ہیں "اُتری ہوئی پاپوش" یعنی بے قدر عورت، امیر مینائی نے الفاظ کو ان کی بنیاد اور ابتدائی مادے کے ساتھ بیان کیاہے جیسے "اَت گَت" کی ذیل میں لکھاہے:

"ات گت: اس کا صحیح تلفظ ات گت ہے۔ بے حد بے انتہا

میر: آج ہمارا جی بیکل ہے تم بھی غفلت مت کیجو جو ہاتھ رکھے تو مت ات گت کیجو

ذوق: چل بے گور ہو تری صورت اتنا بھی چھیڑتے نہیں ات گت

یہ عورتوں کی زبان ہے۔"(۵۷)

اٹکن بٹکن: چھوٹے بچوں کا ایک کھیل کو کہتے ہیں جس کی مکمل تفصیل لغت میں رقم کی گئی۔ عورتیں اکثر یہ جملہ کہتی ہیں کہ فلاں تو گھر کے کام میں دلچسپی نہیں لیتی اور سارا دن اٹکن بٹکن کھیلتی رہتی ہے۔ اٹھاؤنی: ہندوؤں کے ہاں ماتم کا تیسرا دن جب وہ مردے کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ کو چن کر پانی

میں بہاتے ہیں۔ مؤلف نے گنتی کے ہندسوں کو بھی بالخصوص شاملِ لغت کیا ہے جیسے اٹھاون، اٹھہتر، اڑتیس، اڑتالیس، اکہتر، وغیرہ۔

مؤلف نے ایک اور بات کا بالخصوص اہتمام جو کیا وہ اس دور کی دیگر لغات میں نظر نہیں آتا یا شاید اتنی زیادہ تعداد میں نہیں ملتا وہ یہ کہ "امیر لغات" میں ان تمام انگریزی زبان کے الفاظ کا اندراج کیا گیا تھا جو اردو زبان میں شامل ہو چکے تھے۔ ان میں سے چند الفاظ یہ ہیں: ایجوکیشن، ایجوکیشنل، اڈیٹوریل کالم، اڈیٹر، اڈیٹوریل نوٹ، آڈیشن، اڈیشنل، ارتھمیٹک، ارڈلی، ارجنٹ، اسٹام، اسپیچ، انٹرویو، سٹیٹ، اسٹیشن، اسٹیج، ایکٹ، اسٹیل، اسپتال، اسپرنگ، انکم ٹیکس وغیرہ

مؤلف نے سنسکرت الفاظ سے نکلے ہوئے ان ہندی الفاظ کے بنیادی مادے کو بھی بیان کیا جن سے وہ لفظ ترکیب پایا۔ جیسا کہ اُچاپت جس کے معنی اُدھار دینا کے ہیں، کی ذیل میں مؤلف لکھتے ہیں:

> اُچاپت: اُچ سنسکرت میں نہایت اور آپت معتبر کے معنی میں ہے یعنی اچاپت میں اعتبار پر مدار ہوتا ہے اس لیے یہ اشتقاق قریں قیاس ہے۔
>
> جان صاحب: رنڈیوں کی یہ اچاپت میں ادھڑ جائیگا رکھی عیاش نے پرچون کی دکان عبث (۵۸)

ابو محمد سحر اپنے مضمون "امیر مینائی کی لغت نویسی" مشمولہ "اردو لغات، اُصول اور تنقید" میں ان کی مرتب شدہ لغت کا تنقیدی جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اردو کے پہلے لغت نگار ہوں گے جنھوں نے لغت کی تدوین میں لوگوں سے رائے لی اور کئی سو الفاظ و محاورات کا نمونہ شائع کر کے لوگوں کو اشتہارات اور اعلانات کے ذریعے لغت کے اغراض و مقاصد سے آگاہ کیا۔ وہ ایک عام اور قابلِ اعتبار زبان کی لغت ترتیب دینا چاہتے تھے۔ ابو محمد سحر مزید اس لغت کی بابت تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دہلی و لکھنو کے مفردات و مرکبات، جملے، مثلیں، مقولے، محاورے اصطلاحیں، شانِ مثل، کنایات، صفات، تشبیہات، استعارات، شعرا کے خاص مستعملات، مصطلحاتِ قانون، کچہری اور اہلِ دفتر کے خاص محاورات، پیشے والوں کی اصطلاحیں، فقرا کی صدائیں، آزادوں کی بولی ٹھولی، عورتوں کی زبان، ان کے ٹوٹکے، رسمیں، حاص قسمیں اور دعائیں، طبع زاد فقرے اور لوریاں، عام کھیل، شادی و غمی کی رسمیں، تیوہار، کتبِ مذہبی کی ضروری اور کارآمد اصطلاحیں، مشہور

شعرا کے مختصر حالات، لغات کے حقیقی و مجازی معنی، ان کا محلِ استعمال، مترادف و متضاد الفاظ، تذکیر و تانیث اور اختلاف کی صورت میں مؤلف کی رائے، واحد جمع کی حالت میں لغات کے معنی اور محلِ استعمال میں فرق، لفظ لفظ کی تحقیق، اشتقاق اور مادہ، پرانی نئی زبان کا فرق، متروک و مروج اور فصیح و غیر فصیح لغات کی نشاندہی۔۔۔ مختصر یہ کہ اردو زبان سے تعلق رکھنے والی کون سے بات ہے جو اس میں موجود نہیں۔ (۵۹)

امیر احمد امیر مینائی جلد اوّل کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۸۴ء میں جب علوم کے قدردان سر الفریڈ لائل صاحب بہادر نے جو چیف کمشنر اودھ بھی تھے نواب خلد آشیان سے اردو کی ایک جامع لغت کی فرمائش کی اور نواب صاحب نے مجھے اس لغت کی تیاری کا کام سونپا۔ بقول امیر مینائی انھوں نے اوّلین نمونے کے طور پر لفظ آنکھ کا انتخاب کیا اور اس کے معنی و محاورات و متعلقات پر کام کر کے پیش کیا جسے بہت پزیرائی ملی اور ۱۸۸۶ء میں سر الفرڈ لائل نے نہ صرف اسے پسند فرمایا بلکہ مزید ہدایات بھی دیں اور اس لغت کو دیگر ریاستوں کے لیے بھی خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ امیر مینائی نے ۱۸۸۸ء میں اس لغت کو لکھنے کا عملی ارادہ کیا اور مواد کی جمع آوری کا کام شروع کیا۔ یوں پہلی جلد ۱۸۹۱ء میں الف ممدودہ کی چھپ کر سامنے آئی۔ جلد اوّل کے مقدمے میں رقم ہے:

"مناسب مقام پر لوازم و خواص، شعرا کے خاص مستعملات، الفاظ و مصطلحات، کچہری و اہلِ دفتر کے محاورات، پیشہ والوں کی خاص اصطلاحیں، فقرا کی صدائیں، آزادوں کی بولیاں ٹھولیاں، ریختی (عورتوں کی زبان) ٹوٹکے جیسے کہ آنکھ کی پھرک دور کرنے کو پپوٹے پر تنکا یا دھاگہ ٹکا دینا، عورتوں کی رسمیں جیسے خدائی رات، عورتوں کی منتیں جیسے آسا کا کاسا، عورتوں کی خاص قسمیں جیسے آنکھوں کو پاؤں، دعائیں جیسے مانگ کوکھ کی ٹھنڈی ہو، کوسنے جیسے نگوڑے، تکیہ کلام جیسے بھئی اللہ، طبعزاد فقرے جیسے بچوں کو ڈرانے اور بہلانے کے لیے، جیسے شادی بی بی آئیں، چندا ماموں آجا، لوریاں جیسے آجاری نندیا تو آ کیوں نا جا میرے پیارے کی آنکھوں میں گھل مل جا، عام کھیل جیسے گنجفہ، شطرنج، لڑکوں کے کھیل جیسے آنکھ مچولی، لڑکیوں کے کھیل جیسے گڑیا گٹے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی شادی بیاہ کی رسمیں

جیسے مانجھا، تیجا، گونا، کریا بیٹھنا، تیوہار جیسے عید، ہولی، کہیں کہیں کتب مذہبی کی ضروری اور کارآمد اصطلاحیں۔"(۶۰)

اس لغت میں مؤلف نے بھرپور کوشش کی کہ کسی لفظ کا کوئی معنی رقم ہونے سے رہ نہ جائے۔ مثلاً آنکھ کے ایک لفظ اور اس کے متعلقات، لغت میں کئی صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح اچار کے ایک لفظ سے کئی محاورات اور مصادر جڑے ہوئے ہیں جیسا کہ مؤلف نے لکھا مثلاً اچار ڈالنا، اچار کر دینا، مارتے مارتے اچار کر دینا، اچار بنانا، اچار اُٹھنا، اچار پڑنا، اچار نکلنا، اچار ہو جانا، اچاری وغیرہ اسی طرح اشیائے خورونوش میں عورتوں کی زچگی کی خاص خوراک "اچھوانی" کا لغت میں تذکرہ ترکیب و اجزا کے ساتھ موجود ہے۔ ایک خاص غذا "آش" کا بھی ذکر ہے جو بیمار آدمی کے لیے تیار کی جاتی ہے رقیق یعنی نرم غذا کہلاتی ہے۔

لکھنو میں اچھوتی کا لفظ ان چھوئی کے معنوں میں بولا جاتا تھا۔ امیر مینائی نے اس کی تفصیل بیان کی کہ اچھوتیاں کون تھیں۔

اچھوتی: ان چھوئی عورت، پاکباز عورت

اچھوتیاں: بادشاہ نصیر الدین حیدر کے دور میں چالیس بن بیاہی اچھوتیاں امام آخری الزمان کی حرموں کے نام سے ملازم تھیں جن کو بادشاہ صبح اٹھ کر پہلے سلام کرتا تھا،

اختو بختو: تماشا کرنے والوں کے پاس کاٹھ کی دو پتلیاں ہوتی تھیں جن کو وہ کبھی اختو بختو اور کبھی گلابو شتابو کے نام سے آپس میں لڑاتے اور چند فقرے کہے جاتے ہیں۔ اختو نے پکائیں بڑیاں، بختو نے پکائی دال، اختو کی بڑیاں جل گئیں بختو کا برا حال (۶۱)

اڑھائی چاول الگ گلانا، یہ جملہ اکثر اس عورت کے لیے بولتیں جو الگ تھلگ رہتی ہو یا سب کی رائے سے الگ اپنی رائے رکھتی ہو۔

امیر اللغات کی ایک خوبی جو اسے دیگر لغات سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں کہاوتیں اور ضرب الامثال کافی تعداد میں شامل ہیں اور ہر ایک کی مکمل تفصیلات و جزیات بھی رقم کی گئی ہیں۔ محاورات کے سامنے ایک سے زائد مستند شعرا کے اشعار سے مثالیں دی گئی ہیں۔ کہاوتوں میں سے عورتوں کی زبان کو علامت (عو) سے واضح کیا گیا۔ کئی کہاوتیں جن کے پس منظر میں کوئی کہانی موجود تھی اس کو بھی بیان کیا جیسے:

"آبے سونٹے تیری باری، کان چھوڑ کنپٹی ماری": ایک مثل جس کے پیچھے مکمل کہانی شیخ چلی کی بیان کی گئی ہے۔ جس میں امیر مینائی لکھتے ہیں کہ ایک بار شیخ چلی کہیں سفر میں تھے کہ ستانے کو درخت کے نیچے آ بیٹھے اور اپنے زادِ سفر میں سے چار روٹیاں نکالیں اور خود سے کہنے لگے کہ ایک کھاؤں دو کھاؤں، تین کھاؤں یا چار کھاؤں۔ اتفاق سے اس درخت کے اوپر چار پریوں کا بسیرا تھا انھوں نے سنا تو یہ سمجھا کہ یہ شخص ہمیں کھانے کی بات کر رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تم ہمیں مت کھاؤ ہم تمیں جادوئی توا دیتی ہیں جسے جب بھی تم چولھے پہ رکھ کر حکم دوگے کہ پکا روٹیاں تو وہ روٹیاں پکانے لگے گا تم جتنی چاہے کھالیا کرنا۔ شیخ چلی توا لے کر خوشی خوشی گھر کو روانہ ہوا رستے میں ایک چالاک بڑھیا کا گھر تھا۔ اس نے بطور مسافر اس سے رات ٹھہرنے کی اجازت لی اور وہاں توے کو آگ پر رکھ کر کہا کہ "پکاؤ روٹیاں" تو توے نے خود بخود روٹیاں پکانا شروع کر دیں۔ بڑھیا یہ دیکھ رہی تھی اس نے رات کو توا اپنے توے سے تبدیل کر دیا۔ جب شیخ چلی اگلی شام گھر پہنچے اور گھر والوں کو جادو کے توے کا بتایا اور توے کو چولھے پہ رکھ کر کہا کہ "پکاؤ روٹیاں" مگر وہ توا جادو کا ہوتا تو روٹیاں پکاتا۔ گھر والوں نے خوب مذاق بنایا۔ اگلے دن شیخ چلی پھر اسی درخت تلے جا بیٹھے اور لگے بولنے کہ "ایک کو کھاؤں دوسری کو کھاؤں تیسری کو کھاؤں یا چوتھی کو" پریاں یہ سن کر گھبرا گئیں اور اسے ایک کڑاھی پیش کر کے کہا کہ یہ جادو کی کڑاہی جب تم چاہو گے تمارے لیے پوریاں تلے گی۔ کڑاہی کے ساتھ بھی یہی ماجرا ہوا کہ رستے میں بڑھیا کے گھر میں قیام کے دوران تبدیل کر دی گئی۔ گھر پہنچے اور کڑاھی کو حکم دیا کہ "تل پوریاں" مگر وہ کڑاھی جادو کی نہ تھی دوبارہ گھر والوں نے مذاق اڑایا کہ تم سٹھیا گئے ہو۔ اب شیخ چلی سمجھ چکے تھے کہ ماجرا کیا ہے۔ وہ تیسری بار اسی درخت کے نیچے جا پہنچے اور پریوں سے احوال بیان کیا۔ پریوں نے ان کو ایک رسی اور ایک سونٹا دے کر سمجھایا کہ اس رسی کو زمیں پہ رکھ چھوڑنا اور سونٹے سے کہنا کہ

"آبے سونٹے تیری باری، کان چھوڑ کنپٹی ماری"

شیخ چلی وہ سونٹا اور رسی لے کر سیدھا بڑھیا کے پاس جا پہنچے اور یہی جملہ دہرایا۔ رسی نے بڑھیا کو خود بخود باندھا اور سونٹے نے پٹائی شروع کر دی۔ بڑھیا گھبرا گئی اور اپنی چوری کا اعتراف کر کے شیخ کا توا اور کڑاھی واپس کر دیا۔

اس کہانی کی نسبت سے یہ مثل مشہور ہوئی۔

اسی طرح چند اور مثل جن کا پہلا حرف الف ممدودہ یا الف مقصورہ تھا ان کو اندراج کرنا نہیں بھولے مثلاً: آنکھوں کی سوئیاں رہ جانا، آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا (امیر خسرو کی پہیلی) آگ کھائے منہ جلے ادھار

کھائے پیٹ، آنکھ نہ دیدہ کاڑھے کشیدہ، آنکھ نہ ناک بنو چاند سی، آبے لونڈے جابے لونڈے کرنا، آٹے کا چراغ گھر رکھوں تو چوہا کھائے باہر رکھوں تو کوا لے جائے، آپڑوسن مجھ سی ہو، آپڑوسن گھر بھی لے جا، آٹے کی آپا، ،ابتوُ (جب نتیجہ مرتب ہونے کا وقت ہو) اب تو ہوں میں اُونی اُونی جب ہو نگی سب سے دُونی، آپ گھر سے لڑ کر تو نہیں آئے۔۔۔وغیرہ

اسی طرح نسائی زبان و محاورہ کی نسبت سے ایک خاص سماجی شعور اور رسوم و رواج کا مکمل پس منظر اس لغت کے مطالعے سے سامنے آتا ہے۔اس دور کی خواتین کے ہاں کون کون سی ثقافتی اور مذہبی رسومات تھیں جو خواتین کی زندگی کا حصہ تھیں یا اس معاشرے کا حصہ رہیں۔ بدلتے وقت کے تقاضوں کے ساتھ معاشرتی طرزِ فکر میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔اور جوں جوں تعلیم کی کمی دور ہوئی اور خواتین پر علم و آگہی کے دروازے کھلتے چلے گئے تو آج ان سیکڑوں رسومات وتوہمات کا پتا ہمیں ایسی قدیم لغات یا کلاسیکی ادب سے ہی ملتا ہے۔

جیسے: آسا کے نام کا چہلا اٹھانا، امام ضامنی کا روپیہ باندھنا، آئینہ الٹا دکھانا یعنی کسی سجی سنوری عورت یا خاص طور پر دلہن کو آئینہ الٹا دکھایا جاتا تھا تا کہ اسے نظر نہ لگے وغیرہ

"آسا کے نام کا چہلا اٹھانا" آسا کی ذیل میں امیر الغات میں مؤلف لکھتے ہیں:

> "آسا": ایک پاک بی بی جن کے نام سے عورتیں منت مانتی ہیں۔ بعض عورتوں سے معلوم ہوا ہے کہ اصل میں یہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالی عنھا کا نام ہے۔عائشہ سے بدل کر آسا ہو گیا لیکن لکھنو میں اکثر سیدہ خاتون جنت فاطمہ الزہرا رضی اللہ تعالی عنھا سے مراد لیتے ہیں۔
> آسا کے نام کا چہلا اٹھانا: پانی میں غوطہ دے کر چاندی کا سکہ اٹھانا اور پھر اس کی قیمت کی نیاز دینا۔[۶۲]

سید احمد دہلوی کی طرح امیر مینائی نے بھی لغت میں جہاں جہاں ایسی کہاوتیں یا مثلیں رقم کی ہیں ان کے حاشیے میں مکمل تفصیل بھی فراہم کی ہے۔ بچوں کے کئی کھیل جیسے "آتی پاتی" اور "آنکھ موچی دھپ" جس میں لڑکے ایک دوسرے کو چپت رسید کرتے ہیں اور مار کھانے والے کی آنکھیں بند ہوتی ہیں اسے بوجھنا پڑتا ہے کہ پہلی چپت کس نے ماری تھی۔ایک اور کھیل جسے "آل کا انڈا" کا نام دیا گیا تھا اس میں راہ

چلتے کسی غریب کو دیکھ کر لڑکے قسم دیتے کہ جو کوئی اس بندے کو ایک ایک چپت رسید کر کے نہ بھاگے گا اس کو فلاں کی قسم، یوں بچے اس قسم سے بچنے کو اس غریب کو چپت رسید کرنے کو دوڑتے۔

عورتوں کے زیورات، لباس یا ہار سنگھار کی بابت بہت کم الفاظ و محاورات امیر اللغات کی دونوں جلدوں میں ملتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ چونکہ دونوں جلدیں حرف الف پہ مبنی تھیں اگر مؤلف کو موقع ملتا تو اگلی جلدوں میں اس کمی کا ازالہ ہو جاتا۔ ان دو جلدوں میں ان موضوعات پر چند الفاظ و محاورات جو دستیاب ہو سکے وہ کچھ یوں ہیں:

اُبٹن: ابٹن بنانے کی پوری تفصیلات کا اندراج کیا گیا ہے۔ آبِ رواں: ایک باریک کپڑا، آڑھی ہیکل (گلے میں پہننے کا زیور) استرق: ایک ریشمی کپڑا، اڈی: عورتوں کے جوتے کا پچھلا حصہ، انی دار جوتا، اور اس کے علاوہ عورتوں کے لباس کا ایک اہم حصہ "انگیا" ہے جس کا لغت میں تمام تر جذیات کے ساتھ ذکر ہے جیسے:

انگیا، انگیا کا بنگلہ، انگیا کے گھاٹ، انگیا کا کنٹھا، انگیا کے بازو، انگیا کے بند، انگیا کے پان، انگیا کے پٹھے، انگیا کے پچھوے، انگیا کی چڑیا، انگیا کی خواصی، انگیا کی دیواریں، انگیا کی ڈوری اور انگیا کی کٹوریاں۔۔۔

جلی کٹی سنانے اور طعنے کوسنے دینے میں خواتین ویسے بھی بہت مشہور ہیں اردو زبان کے کتنے ہی تیکھے اور مزیدار فقرے اس نسبت سے اردو نسائی زبان کا خاصہ ہیں جیسے اس لغت میں بھی موجود ہیں مثلا:

آبنوس کا کُندہ: (کالا آدمی، سیاہ رنگت والے کو کہتیں) آگ بھی نہ لگاؤں (حقارت اور ناپسند) آنکھ نہ ناک بنو چاند سی، آئی نہ گئی کون ناتے بہن، ادوائن کا توتا (جو شخص ٹانگیں کھول کھول کے چلتا ہو اس کو کہا جاتا تھا ادوائن کا توتا)۔ آبے لونڈے جابے لونڈے کرنا: زنانہ زبان کا جملہ یعنی وقت ضائع کرنا، یہ دہلی میں بولا جاتا تھا۔ آپ گھر سے لڑ کر تو نہیں آئے، آپڑوسن مجھ سی ہو، اُدماتی، (جوشِ جوانی سے بھرپور عورت) آج تک پڑے ہینگ ہگ رہے ہیں، آدمی نہ آدم زاد، آرسی تو دیکھو، ادھار کھانا پھُوس تاپنا برابر ہے، اپنا بالا اور کا ڈھٹینگڑا، اللہ سے پائے (جان صاحب: مجھ پہ تہمت جو لگائے سوکن، اپنے اللہ سے پائے سوکن، اپنی اور تیری جان ایک کر دونگی، اپنے بچے کو ایسا ماروں کہ پڑوسن کی چھاتی پھُوٹے، اپنی بات پہ آجانا، اپنے پوت کنوارے پھریں پڑوس کے پھیرے، اپنی پیڑ پرائی باتیں، اپنے دہی کو کون کھٹا کہتا ہے اپنا سر پیٹو، اپنا سر کھاؤ، اپنا گھر ہگ بھر پرایا گھر تھوک کا ڈر، اپنا مرن جگت کی ہنسی،

اڑھائی چُلو پانی پینا (عورتوں کا کوسنا)

اِزار بندی رشتہ: سسرالی رشتوں کو کہا جاتا ہے جیسے ساس، سسر، سالی، سالا

اَکتائی کمھاری ناخن سے مٹی کھودے

اگلے کو گھاس نہ پچھلے کو پانی، یہ جملہ تواضع کے انتظام میں کمی پر عورتیں بولا کرتی تھیں،

اِزار بند کی ڈھیلی یعنی بد کردار عورت، آبلا پری (نازک عورت،) اُپلے تھاپنا، اپنا تو تن پہلے ڈھانکو دوسرے کو ننگا پیچھے کہنا،

مولوی عبد الحق نے "لغت کبیر" میں جہاں امیر مینائی کی اس کاوش پر انھیں سراہا ہے وہاں انھوں نے ایک اور خاص نکتے کی طرف بھی توجہ مبذول کروائی ہے کہ امیر مینائی نے پہلی جلد میں جن متروک الفاظ کی فہرست پیش کی ہے ان میں سے کئی الفاظ متروک نہیں ہیں اور بعض ایسے عربی الفاظ انھوں نے شاملِ لغت کیے ہیں جو اردو میں مستعمل نہیں جیسے: استتار، صبغ، تفاح، صفدغ، قذف وغیرہ۔ وہ لکھتے ہیں:

> "پہلی جلد کے دیباچے میں متروکات کی ایک طویل فہرست ہے جس میں ایسے لفظ بھی آگئے ہیں جو متروک نہیں، اب بھی عام بول چال اور تحریر میں آتے ہیں۔ کسی شاعر یا استاد کے متروک کر دینے سے کوئی لفظ متروک نہیں ہو جاتا۔ [۶۳]

الغرض "امیر اللغات" کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اس لغت کو نہ صرف یہ کہ کڑی محنت سے مرتب کیا گیا بلکہ اس میں نسائی زبان سے وابستہ الفاظ و محاورات اور کہاوتوں کو بھی جگہ دی گئی۔ کئی ایک الفاظ و محاورات ایسے ہیں جو دیگر اس سے پیشتر کی لغات میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے۔ امیر مینائی نے اسناد کے حوالے سے ایک ان تھک محنت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

"لغتِ کبیر" میں بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبد الحق نے امیر مینائی کی اس لغت کے تجزیے میں لکھا ہے کہ امیر مینائی نے اس کو مرتب کرنے میں کڑی محنت کی ہے۔ ہر لفظ پر اعراب لگائے ہیں، تذکیر و تانیث کی علامات کا خیال رکھا ہے۔ ایک ایک لفظ اور ہر محاورے کے سامنے کئی کئی اسناد پیش کی ہیں اور کچھ الفاظ کی صفات اور تشبیہات و استعارات کی ذیل میں کئی کئی صفحات لکھ ڈالے۔ جس قدر خصوصی اہتمام مستند شعرا کے کلام سے حوالہ جات پیش کرنے میں کیا گیا اس سے قبل نظر نہیں آتا۔

نسائی زبان کے سماجی پہلوؤں، جن میں خاص طور پر رسوم و رواج کی مناسبت سے فروغ پانے والے نسائی محاورات کو جگہ دی، جذباتی حوالے سے محبت، نفرت، رقابت، حسد، رقابت، ممتا، مسابقت کا احساس اور طنز و تحقیر

کے احساسات کے زیرِ اثر جنم لینے والے بیسیوں نسائی الفاظ و محاورات کا اندراج موجود ہے۔ بچوں اور چھوٹی بچیوں کے کھیل کود کے دوران بولے جانے والے مقبول الفاظ، لوریاں اور معروف و مقبول فقرات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

نسائی زندگی کے عام معمولاتِ خانہ داری، دستکاری سے لے کر سنگھار اور زیورات سے وابستہ الفاظ بھی ملتے ہیں اور شادی بیاہ کے ساتھ ساتھ زچگی کے ایام اور مخصوص پکوانوں کا بھی ذکر موجود ہے۔ استعاراتی انداز بھی ہے اور بے باکی کی جھلک بھی۔ اسناد کی موجودگی نسائی زبان کے تمام پہلوؤں کو سمجھنے میں معاونت کر تی ہے۔ اگر انھیں زندگی نے مہلت دی ہوتی تو شاید باقی کی جلدیں بھی ایسی ہی تیار کی جاتیں۔ ان کے بعد اس ادھورے کام کی برسوں کسی کو ذمہ داری اٹھانے کا یارانہ ہوا اور بالاخر مولانا نور الحسن کاکوروی کے حصے میں یہ عظیم کام آیا اور بعد کی جلدیں "نور اللغات" کے نام سے سامنے آئیں۔

V) مخزن المحاورات: منشی چرنجی لال دہلوی

منشی چرنجی لال کا نام اردو زبان و ادب کے حوالے سے برطانوی برِ صغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ڈاکٹر فیلن کے ساتھ کام کرنے والے ان چند نمایاں ترین ساتھیوں میں شامل تھا جنھوں نے اردو زبان کی قابلِ قدر خدمات سر انجام دیں اور لغت نویسی یا زبان کے لسانیاتی حوالوں سے خدمات سر انجام دینے والے اولین دستے میں شامل تھے۔ انھوں نے مولوی سید احمد دہلوی کی طرح لغت نویسی کا کام ڈاکٹر فیلن سے سیکھا اور پھر اپنے تجربے کو اردو محاورات کی پہلی بلکہ تالیف جس میں دس ہزار کے زائد اردو محاورات شامل تھے "مخزن المحاورات" کے نام سے تالیف کی۔ ہر محاورے کے سامنے سند کے طور پر استاد شاعر کا شعر لکھا یا عام روزمرہ کا کوئی جملہ جس سے محاورے کی تفہیم میں آسانی ہو۔ یہ محاورات کا مجموعہ پہلی بار ۱۸۸۶ء میں دہلی سے شائع ہوا۔

وکی پیڈیا کے ریکارڈ کے مطابق

> "مخزن المحاورات برطانوی عہد میں برِ صغیر پاک و ہند سے شائع ہونے والی اردو زبان کی ایک لغت ہے اس کے مؤلف منشی چرنجی لال تھے۔ اور یہ ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بنیادی اندراجات اردو کے تقریباً دس ہزار محاورات پر مشتمل ہیں جس کی وجہ سے اس وقت تک کی مدون شدہ لغات میں سب سے ضخیم کہا جا سکتا ہے۔"(۶۴)

لغت کی تدوین صرف شوق سے کیا جانے والا کام نہیں کہ جب چاہا کر لیا جب چاہا چھوڑ دیا، اس کے لیے نہ صرف مستقل مزاجی کی سخت ضرورت ہوتی ہے بلکہ خاص طرح کی تربیت و فہم بھی درکار ہوتا ہے۔ صبر آزما، برسوں کی مشقت کا کام ہے اور اس فن کا آغاز تو عربیوں نے کیا تھا مگر برطانوی برِ صغیر پاک وہند میں اردو زبان کی لغت نویسی کی ابتدا مستشرقین سے ہوئی۔ لغت نویسی کا ایک بہت بڑا اور اہم نام ڈاکٹر فیلن کا تھا اور پہلی انگریزی اردو لغت جسے ڈاکٹر فیلن نے مرتب کیا تھا اس میں ایک ہزار دو سو سولہ الفاظ کو شامل کیا گیا تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس کی تدوین میں جن برِ صغیر پاک وہندی شخصیات نے حصہ لیا تھا ان میں بھی منشی چرنجی کا نام بھی شامل تھا۔ دیگر مرتبین میں منشی رام پرشاد، کشوری لال اور سید احمد دہلوی بھی شامل تھے۔

اس انگریزی اردو لغت میں یہ اہتمام کیا گیا تھا کہ گھریلو اور ادبی زندگی کے علاوہ رسومات و عقائد، عبادات، اخلاقیات، شادی بیاہ، موت مرگ، شہری و دیہی زندگی کے علاوہ کھیل و ثقافت کے متعلقہ الفاظ اور پیشہ ورانہ اصطلاحات کو بھی شامل کیا جائے۔ اور الفاظ کے انتخاب میں عام بول چال کی زبان کو زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔

اگر ہم اس لغت کا نسائی اردو زبان کے حوالے سے جائزہ لیں تو یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر فیلن نے اس سے قبل کی ریختی یا حرم سرا کی عورتوں کی مخصوص لفظیات سے نہ صرف یہ کہ ہوش مندانہ گریز برتا بلکہ اسے لغت میں شامل کرتے وقت اس کے لیے "زنانی زبان" یا "ریختی" کا نام استعمال کیا، یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ نسائی زبان کو پہلی بار لغت میں تکریم و انفرادیت ہمیں ڈاکٹر فیلن کی لغت میں ملتی ہے اور اس کے مرتبین میں منشی چرنجی لال بھی شامل تھے۔ شاید یہی پس منظر تھا جس کے بعد منشی چرنجی لال نے جب "مخزن المحاورات" کو شائع کیا تو اس کی پہلی اشاعت ۱۸۸۶ء کے ایڈیشن کے سرِ ورق پر یہ عبارت کندہ تھی:

> "ہندی اور اردو کے ہر قسم کے محاورے اور اصطلاحیں، دس ہزار کے قریب بڑی تلاش و جستجو سے جمع کر کے درج کی گئی ہیں ان کے ثبوت میں ناظمانِ بے مثال و تاثراتِ باکمال کا کلام اور روزمرہ کے معنی خیز فقرے اور ضرب الامثال پیش کی گئی ہیں۔ اکثر محاوروں اور اصطلاحوں کی وجہ تسمیہ اور شانِ نزول بھی حتی الوسع بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے مؤلفہ، منشی چرنجی لال صاحب دہلوی، مؤلف اردو زبان کی تاریخ، ڈاکٹر فیلن صاحب

بہادر فلولوجی (علم اللسان) وسابق اسسٹنٹ ڈکشنریات بزریعہ رجسٹری تمام
حقوق محفوظ ہیں۔[۶۵]

اردو محاورات کی بابت آج بھی کئی مباحث سامنے آتے ہیں۔ محاورات کی کتب یا مجموعوں میں کئی ایسے الفاظ وتراکیب یا محاورات بابت اہلِ زبان آپس میں متفق نہیں ہو پاتے کہ یہ واقعی محاورہ ہے یا نہیں ہے۔ محاورے کا استعاراتی پہلو سب سے نمایاں صفت ہے۔ اور یہاں محاورے کی لسانیاتی ساخت پر مزید بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ موضوعاتی سطح پر اس کے استعاراتی، معاشرتی اور نفسیاتی حوالوں سے اس میں نسائی زندگی کے رنگ اور مختلف جہات تلاش کرنا ہے۔ عورت کی زندگی کے جذباتی و معاشرتی بے شمار پہلو ہمیں نسائی زبان کے محاورات میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جہاں ان کے لیے کھلے لفظوں میں بات کرنا دشوار ہو وہاں وہ استعاراتی اندازِ بیاں اپناتی ہیں اور جہاں ان کو جذبات و احساسات کے جہان میں اپنے کیفیات کا اظہار کرنا ہو وہاں بھی محاورات کا استعاراتی پہلو انھیں ایک وسیع جہانِ معنی فراہم کرتا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی اپنے مضمون "اردو لغت اور لغت نگاری" میں لکھتے ہیں:

> "محاورہ وہ عبارت ہے (الفاظ کا وہ مجموعہ ہے) جس کی شکل یعنی ترتیب، ہمیشہ ترمیم نا پذیر اور متعین ہے اور جس کے مفصل معنی خود اس کے اندر موجود ہوتے ہیں مگر اکثر وہ معنی ظاہر نہیں بلکہ Implicitہوتے ہیں۔ کیونکہ محاورے میں استعمال ہونے والے الفاظ زیادہ تر استعاراتی رنگ لیے ہوتے ہیں۔ بلکہ اکثر محاورے استعارہ ہی ہوتے ہیں۔ محاوروں کے معنی بھی سیاق وسباق کے محتاج نہیں ہوتے۔ محاورے عام طور پر مصدری شکل میں ہوتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں۔ محاورے کی ضروری شرطیں ہیں (۱) الفاظ کا ترمیم ناپذیر ہونا (۲) استعاراتی ہونا۔[۶۶]

وہ مزید لکھتے ہیں کہ "مخزن المحاورات" منشی چرنجی لال کی تالیف ہے، جنھوں نے کئی سال ڈاکٹر فیلن کے مددگار کے طور پر کام کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے ہی انھیں زبان دانی کا گہرا ذوق حاصل ہوا۔ اور اردو محاورات پر اب تک جتنی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں ان میں "مخزن المحاورات "سب سے بڑی ہے۔ اس میں کم و بیش دس ہزار محاورات شامل ہیں۔ اس میں خاص ایسے محاورے بھی موجود ہیں جو خاص ہندوؤں کی زبان کے ہیں یا قریب و دور کے قصبات و دیہات میں بولے جاتے ہیں۔ پیشہ وروں کی بھی بعض اصطلاحات پائی جاتی ہیں۔ کئی معروف امثال بھی کہیں کہیں درج ہیں۔ اور مفاہیم واضح ہیں الثر محاوروں کی صراحت میں روزمرہ کے جملے یا اساتذہ کے اشعار دیے گئے

ہیں۔ اوّل بار یہ محبِ ہند پریس دہلی میں ۱۸۸۶ء میں طبع ہوئی بار دوم منشی امیر چند نے اسے ۱۸۹۹ء میں شائع کیا اور خلافِ تہذیب فحش محاورے اور اشعار جو (ڈاکٹر فیلن کے فیض کا اثر تھا) خارج کر دیے گئے۔"[٦٧]

مولوی عبد الحق اپنے مضمون " اردو لغت نویسی " مشمولہ :" اردو لغت نویسی کی تاریخ، مسائل و مباحث "میں لکھتے ہیں کہ "مصطلحاتِ اردو" جس کے مؤلف مولوی اشرف علی لکھنوی مطبع نامی لکھنو میں ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی تھی اگرچہ یہ بھی اردو محاورات پر ہی مبنی تھی مگر اس کے تشریح میں کافی اختصار سے کام لیا گیا اور دوسرا اہم فرق یہ بھی تھا کہ اس میں ہر محاورے کی تشریح کے لیے اشعار درج کیے گئے تھے۔ ہر محاورہ ضروری نہیں کہ شاعری میں استعمال ہوا ہو بہت سے محاورات عام روزمرہ گفتگو یا نثری تحاریر میں بھی موجود ہوتے ہیں۔ مولوی عبد الحق نے اپنے مضمون میں دو غیر مطبوعہ لغات کا بھی ذکر کیا جن میں سے ایک قدر بلگرامی نے اور دوسری شمس الدین فیض نامی ایک شاعر نے مرتب کی تھیں۔

مسعود ہاشمی اپنی تصنیف "اردو لغت نویسی کا پس منظر" کے ابتدائی صفحات میں لکھتے ہیں کہ محاورات اور ضرب الامثال پر مبنی لغات عام لغات سے قدرے مختلف ہوتی ہیں۔ ان کے مطابق محاورے کسی بھی زبان کی اصل روح ہوتے ہیں اور ان کی تشریح و توضیح وقت اور حالات کے مطابق کی جاتی ہے اور ایسی لغات محض لغوی و اصطلاحی معنی تک محدود نہیں رہتیں۔ ان کا ایک خاص تاریخی و لسانی پس منظر ہوتا ہے۔ اور ایسی لغت میں یہ تمام صفات موجود ہوتی ہیں۔ تاریخی لغت میں نہ صرف محاورے کے لغوی و اصطلاحی مفاہیم بیان کیے جاتے ہیں بلکہ وہ محاورہ زبان میں کیسے داخل ہوا، کب داخل ہوا اور اس نے کیا کیا شکلیں تبدیل کیں اس کے معنی میں کہاں کہاں وسعت آتی چلی گئی اور کیا کیا توسیع ہوئی۔

اسی طرح وہ ضرب الامثال یعنی کہاوتوں کی فرہنگ کو بھی بعض اوقات محاورات کی فرہنگ سمجھ لیا جاتا ہے۔ جب کہ کہاوتیں ایک الگ پس منظری حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا تعلق صرف لسانیاتی تاثرات یا استعاراتی مفاہیم تک محدود نہیں ہوتا۔ ان کے پیچھے حقیقی یا تخیلاتی قصہ، کہانی یا روایت موجود ہوتی ہے۔ محاورہ کسی روایت کا محتاج نہیں ہوتا۔ کئی ایک قدیم لغات میں اکثر محاورات کے سامنے فعل لازم یا فعل متعدی لکھ دینے پہ اکتفا کر لیا جاتا تھا اور یہی صورتِ حال ہمیں " مخزن المحاورات " میں بھی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ یہی سمجھی جا سکتی ہے کہ اکثر محاورات اور ضرب الامثال کے مابین تفاوت کرنا دشوار ہو جاتا تھا اور ان کو محض فعل لازم یا فعل متعدی کہہ کر آسان راستہ اپنایا جاتا تھا۔

اس کی بہت اچھی مثال ڈاکٹر مسعود ہاشمی نے اپنے مضمون "اردو لغات کا تنقیدی جائزہ" جسے گوپی چند نارنگ نے اپنی تالیف "لغت نویسی کے مسائل" میں شامل کیا لکھتے ہیں:

"مثال کے طور پر "مہذب اللغات" میں "رگ رگ" کے ایک معنی دیے ہیں دودھ پلانے والی گائے کا اثر، اور حوالہ دیا گیا ہے "نور اللغات" کا۔ اور نور اللغات میں اس کے معنی دیے گئے ہیں "دودھ پلانے والی کا اثر" تحقیق و جستجو کے بعد یہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ معنی کی یہ بوالعجمی تمام تر نقل کی کرشمہ سازی کا نتیجہ ہے، کیونکہ اگ کے ایک معنی مؤلفِ فرہنگ اثر یہ بھی لکھتے ہیں "دودھ پلانے والی گائے-اثر۔ یکے بعد دیگرے نقل کرتے وقت دو حضرات نے فرہنگِ اثر کی عبارت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا[۶۸]

منشی چرنجی لال خود "مخزن المحاورات" کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ ۱۸۷۵ء میں ڈاکٹر فیلن نے انھیں دہلی کالج سے، جہاں وہ تدریس میں مشغول تھے بلا کر محکمہ لغات میں اپنا اسٹنٹ مقرر کیا اور زبان کی تحقیق کے لیے اکثر محکمہ لغات کا دورہ فرماتے تھے۔ ان کی منشا پر پورب سے پٹنہ تک پنجاب میں لاہور تک اور راجپوتانہ سے اجمیر تک ہر جگہ سے تمام مشہور گویوں کو بلوا کر ان کی چیزیں سنی جاتیں اور مختلف زبانوں کی ڈکشنریاں، گریمریں اور فلولوجی کے رسالے و اشتہارات و اخبارات جمع کیے جاتے اور الفاظ و محاورات کی فہرستیں مرتب کی جاتیں۔

اس مجموعے میں شامل اردو محاورات اور اصطلاحات بابت وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس میں ایسے بہت سے محاورات اور اصطلاحات ایسے بھی استعمال کیے گئے ہیں جو اس سے قبل کسی علم و ادب کی کتاب میں تحریری شکل میں موجود نہ تھے۔ اور عوامی زبان سے، عام بول چال سے، لوک گیتوں، بولیوں سے اور دیگر ذرائع سے بڑی مشقتوں کے بعد یہ محاورات اکٹھے کیے گئے۔ مقدمے میں لکھتے ہیں:

"محاورے کا مادی حَوَر سے ہے جس کے معنی پھرنا یا گردش کرنا۔ جب کوئی اصطلاح جس کو چند آدمی اپنے کسی خاص اظہار و مطلب کے لیے مقرر کرتے ہیں زیادہ عام ہو جاتی ہے اور بہت سے آدمیوں میں پھیل جاتی ہے اور اپنے پہلے معانی سے کسی قدر ملتے ہوئے دوسرے معانی پہن لیتی ہے تو اس کو محاورہ کہتے ہیں۔ مثلاً نائیوں کی اصطلاح میں مونڈنے کے معانی "کسی کے سر کے بال اُسترے سے کاٹنا ہیں"۔ چونکہ

مونڈنا میں حجامت بنوانے والے کے بال لیے جاتے ہیں۔اسی سبب سے اس کے
معانی محاورے میں "ٹھگنا یا دھوکہ دے کر کسی کا مال لے لینا" ہو گئے۔[۶۹]

مقدمے میں منشی چرنجی لال مثالوں سے واضح کرتے ہیں کہ اصطلاح وہ ہے جسے چند لوگ بولیں اور سمجھیں جب کہ محاورہ اس کو کہیں گے جس کو بہت سے آدمی بولنے اور سمجھنے لگیں۔اور کسی جگہ کا اہلِ زبان وہی شخص کہلا سکتا ہے جو اس جگہ پیدا ہو اور طویل مدت تک وہ اس کا وطن رہے تب ہی وہ اس جگہ کی زبان اس کے الفاظ وتراکیب اور معانی وبلاغت کو پا سکتا ہے۔یہ اردو زبان میں محاورات کا پہلا سب سے بڑا مجموعہ تھا جس کو مرتب کرتے وقت ہندی اور اردو کی ہر قسم کی اصطلاحات و محاورات کے جتنے معانی کسی بھی پہلو سے بنتے ہیں وہ بیان کیے گئے ہیں۔جن جن الفاظ و محاورات کی اشعار میں استعمال کی روایت دستیاب ہو سکتی تھی ان کی دی گئی۔اپنے وقت کے معروف شعرا کے کلام سے سند دی گئی۔مقدمے میں ان معروف شعراء کی فہرست بھی دی گئی ہے جن میں میر حسن، نظیر، کبیر، تلسی داس، سوز، ذوق سے لے کر میر، داغ، جرات، رنگین، امانت، شیفتہ، غالب، آبرو، اور بہت سے دیگر شعرا کی طویل فہرست بھی مرتب کی ہے۔

"مخزن المحاورات" میں مؤلف نے عام روزمرہ بول چال سے عورتوں اور بچوں کی زبان سے ان کی روزمرہ زندگی کی گفتگو سے، ہر شعبے سے متعلق افراد کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔مقدمے میں لکھتے ہیں:

> "ان شاعروں کے کلام کے علاوہ مثلیں، روزمرہ کے فقرے، دوہے، پہیلیاں، ٹھمریاں، بولیاں، بھجن، گھریلو گیت، چوبولے، فقیروں کی صدائیں، دلی کے ترکاری والوں کی آوازیں اور چھن وغیرہ چیزیں نظر آتی ہیں۔الغرض جو کلام بامحاورہ اور مستند پایا وہی مثال پیش کیا۔[۷۰]

نسائی زبان کے تناظر میں جب ہم لغت کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ تمام نسائی زندگی کے نفسیاتی و سماجی پہلو سے وابستہ الفاظ و محاورات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔وہ جذباتی کیفیات جو کبھی شرم وحجاب کی ہوں یا طعنے تشنے کو سنے خواتین کی زبان کی ذیل میں ایک دلچسپ وچٹپٹے ذائقے کا ساحوالہ رکھتے ہیں۔جیسے کہ منشی چرن جی لال نے بھی شامل کیے مثلاً :ہمارا حلوہ کھائے یعنی مرنے کا کھانا کھائے، میرا حلوہ کھائے، میری بھتی کھائے، تیل توا کالا، ارتھی نکلے،، تیلی خصم کیا پھر بھی سوکھا ہی کھایا، اللہ کا مارا، پیس لوں تو پیٹوں، مینڈکی کو زکام ہوا، تیرہ تالی(تیز طرار، چالاک، مکار عورت)بازار کی مٹھائی، پیاروں پیٹی وغیرہ۔

اس مجموعے میں پیشہ وروں کی اور کچھ خاص فرقوں کی اصطلاحیں بھی شامل ہیں جو عام زبان میں کثرتِ استعمال سے داخل ہو چکی تھیں۔ عورتوں کی زبان کا مخصوص استعاراتی پہلو اس کے اظہار کو زبان میں منفرد پہلو سے متعارف کرواتا ہے جیسے: ٹھنڈی مٹی (دیر سے جون ہونے والا جسم)، خاص سماجی، ثقافتی انداز کی دلالت) چھاتی کے کواڑ پھٹنا (حسد، جلن، رقابت کا شدید اظہار) سینہ کوٹنا، چھائیں، پھوئیں کرنا، کنگھی چوٹی کرنا، مسی کاجل کرنا، کڑوے کسیلے دن (حمل کا زمانہ، خصوصاً آٹھوں مہینہ) کوراپنڈا، پنڈا دھونا، الٰہی رات اور تخت کی رات۔

آگا بھاری ہونا، موئے جیتے اُکھاڑنا، میلے سر ہونا، ناک پر انگلی رکھ کر بات کرنا، ناک چوٹی گرفتار ہونا، نال کاٹنا، نو لکھا ہار پہنا دے گا، نہانی ہونا۔۔۔ جیسے محاورات عورت اور اس کی معاشرت کی مکمل تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ منشی چرنجی لال لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورتیں جتنی موہنی اور خوش وضع ہوتی ہیں ویسے ہی ان کے پیارے دلربا اور معنی خیز محاورے ہوتے ہیں مثلاً بیاہ رچانے کو "پھول کھلنا" اور "پھول کھنڈنا" کہیں گی۔ پورے دنوں سے ہونا بھی حمل کے دن پورے ہونے کو کہا کرتی تھیں۔ پیٹ ٹھنڈا ہونا ان کے ہاں اولاد کے سکھی ہونے کی دعا کے طور پر بولا جاتا تھا۔ اسی طرح حیض آنے کو "پھول آنا" کہتی ہیں۔ پھول آنا چونکہ پھل لگنے سے پہلے کی علامت ہے اس لیے حیض کو بارآوری کے لیے کس خوبی سے اور نزاکت سے بیان کر جاتی ہیں۔

پاؤں کی جوتی" جیسے نسائی محاورات ہمیں عورت کے سماجی مقام کی نشاندہی میں مدد دیتے ہیں جو برصغیر کی عورت کو حاصل تھا یا جس حیثیت و مقام پہ اسے رکھا جاتا تھا۔ چوڑیاں ٹھنڈی کرنا (خاوند مرنے پر چوڑیاں توڑنا، ایک خاص رسم کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خاوند کی موت کے بعد اب عورت پر سنگھار حرام ہے، کانچ کی چوڑیوں کی رنگینی اور اس کی مدھم سی چھنکار کی بھی اب وہ حقدار نہیں رہی۔ پاؤں تلے کی چینٹی اور آٹے کی آپا بھی اس کی کم مائیگی کی دلالت کرتے ہیں۔ شرط لگانی ہوتی تو عورتیں کہتیں کہ "بارہ گنی لکھتی ہوں اسی طرح "مونچھوں کا کُونڈا کرنا"، عورتوں کا نوجوان بیٹے کی نئی نئی مونچھیں آنے پر نیاز دلوانے کی ایک رسم ہوا کرتی تھی اسے کہا جاتا تھا۔

منشی چرنجی لال نے بچوں کی زبان یا ان کے محاورات کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ بچوں کی زیادہ قربت ماؤں سے ہوتی ہے اور اسی نسبت سے "مادری زبان" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ عورتیں بچوں سے توتلی زبان میں باتیں کرتی ہیں انھیں لوریاں سناتی ہیں۔ ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کھیلوں میں شریک رہتی ہیں۔

اسی طرح چھوٹی بچیوں کے سارے بچپن کے کھیل اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ آنے والی زندگی کی تربیت کا پہلو بھی ان میں مضمر ہوتا ہے مثلاً گڑیا کی شادی کرنا اور گھر گھر کھیلنا وغیرہ

منشی چرنجی لال نے بچوں کے کھیل اور کھیل میں بولے جانے والے مخصوص محاورات پر بھی توجہ دی ہے جیسے: اٹکن بٹکن کا کھیل، جس کی مکمل جزیات بھی بیان کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"اَٹکن بٹکن: ایک کھیل ہے جسے چھوٹے بچے اس طرح کھیلتے ہیں کہ کئی بچے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں کھڑی کر کے زمیں پر ٹکا دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک بچہ درج ذیل کہتا جاتا ہے اور ہر اک کے ہاتھوں پر کلمے کی انگلی باری باری سے رکھتا جاتا ہے۔ جس بچے کے جس ہاتھ پر وہ عبارت تمام ہوتی ہے اس سے پوچھتا ہے کہ کھنڈ اماروں یا چُھری؟ اگر اس نے کھڈا کہا تو کہے گا "تیری ماں کا پیٹ ٹھنڈا" اول تو چھری کوئی کہتا ہی نہیں اور جو کسی نے کہہ دیا تو جواب دے گا " تیری ماں بری" وہ عبارت یہ ہے:۔ اٹکن بٹکن وہی چٹکن اگلا جھولا بگلا جھولے، ساون ماس کریلا پھولے پھولی پھول کی بالیاں، باوا گئے کنگا لائے سات پیالیاں۔ ایک پیالی۔ ایک پیالی پھوٹ گئی۔ نیولے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ کھنڈ اماروں یا چھری؟ جس جس کے ہاتھ پر یہ ایک عبارت ختم ہوتی جاتی ہے اُس کا ہاتھ ٹُھا کر اُسکے سینے پر رکھتا جاتا ہے۔ جب سب کے ہاتھ رکھو اُچکتا ہے تو سب مل کر جھونٹ موٹ کی چکی پیستے ہیں گھمر گھمر اس کے بعد دونوں ہاتھوں کی چھینی بنا کر آٹا چھانتے اور یوں زبان پر لاتے ہیں کہ آٹا یہاں رکھو بھوسی یہاں رکھو۔ جب آٹا چھان لیتے ہیں تو بھوسی کا فرضی دودھ بدلوا کر جھوٹے موٹ کی کھیر پکاتے ہیں اور آپس میں بانٹ کر کھا لیتے ہیں۔ تقسیم کی حالت میں بعض لڑکے چھوڑ دیتے ہیں وہ شکایت کرتا ہے تو جواب میں کہتے ہیں تمہارا حصہ رکھا تھا کُتا پاو گیا۔ بلی سونگھ گئی۔ یعنی اپنے ہاتھ چاٹو اور اسی کو کھیر سمجھو۔[۷۱]

منشی چرنجی لال نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ اس تالیف میں دہلوی یا لکھنوی زبانوں میں سے کوئی ایک زبان کا رنگ غالب نہ نظر آئے بلکہ دونوں کو برابر سطح پر شامل کیا جائے۔ دونوں دبستان میں چند الفاظ اور ان کے معانی ایک جیسے ہونے کے باوجود تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ بولے اور لکھے جاتے تھے۔ جیسے "دھنگارنا" اور "دال بگھارنا" اسی طرح "اُبٹن لگانا" اور اُبٹنا" یا "بٹنا"۔۔۔ منشی وجاہت حسین نے

الفاظ و محاورات کے اسی فرق کی بابت ۱۹۰۶ء میں "اختلاف اللسان" کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی جس میں انھوں نے اسی فرق کو مثالوں سے واضح کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

اُبٹن: غازہ، بٹنا، لکھنو میں اُبٹن کہتے ہیں اور دہلی میں بٹنا یا اُبٹنا بولتے ہیں

دامن سے رشکِ گُل کے اُڑی باغ میں جو خاک

بٹنا وہ بن گئی ہے عروسِ بہار کا(۷۲)

اسی طرح انھوں نے دال بگھارنا اور دھنگارنا کا فرق واضح کرتے ہوئے لکھا کہ "دہلی والوں کے ہاں "دال بگھارنا" سے مراد پختہ دال کو گھی سے بُودار کرنے کو بولا جاتا ہے جب کہ لکھنو میں اسی عمل کو "دھنگارنا" کہا جاتا ہے۔

منشی چرنجی لال نے اس مجموعے میں ہندی اور اردو زبان کے محاورات اور اصطلاحوں کو اکھٹا کیا ہے

وہ انیسویں صدی کے ان چند ماہرینِ زبان اور لغات نویسوں میں شامل ہیں جنھوں نے اردو زبان کو آگے بڑھنے میں ساتھ دیا اور اس کے لسانیاتی پہلوؤں کو مضبوط و محفوظ کرنے میں اپنا عملی کردار بھی ادا کیا۔ انیسویں صدی کا دور زبان و ادب کی بنیاد اور تشکیلاتِ اولین کا دور تھا۔ انھوں نے اس نازک ذمہ داری کو مکمل ارتکاز اور محنت سے نبھایا۔ وہ جانتے تھے کہ اصطلاح اور محاورہ کے مفاہیم و مراتب کیا ہیں۔ کوئی اصطلاح کس درجے تک پہنچے تو تب جا کر محاورہ کہلانے کے لائق ہے۔ انھوں نے الفاظ و محاورات اور اصطلاحات کی سند میں مستند اساتذہ کا کلام پیش کیا۔ ایک اور اہم کام جو انھوں نے کیا وہ یہ کہ مقدمے کے آخر میں تمام محاورات جو اس مجموعے میں شامل کی ان کا لسانی وابستگی اور لسانی بنیاد کا ایک چارٹ بھی بنا کر پیش کیا جس کے دو کالم ہیں اور ایک کالم میں "ہندی لفظوں کے محاورے یا ہندی محاورے" اور دوسرے کالم میں "فارسی عربی آمیز لفظوں کے محاورے یا اردو محاورے" کے عنوانات دیے گئے ہیں۔ ان کی ذیلی تفصیلات میں تعداد الفاظ اور تعداد محاورہ الگ الگ درج ہے۔ یوں انھوں نے اردو زبان میں عربی، فارسی اور ہندی الاصل الفاظ و محاورات کی کل تعداد الگ الگ رقم کی ہے۔ یہ بہت دلچسپ نتائج کی حامل رپورٹ ہے جس کے مطابق ہندی الفاظ و محاورات جو اردو میں شامل ہیں وہ ۳۲۷۳ ہیں اور عربی و فارسی الفاظ پر مبنی محاورات کی تعداد ۱۲۷۶ ہے۔ یعنی ہندی محاورات تین گنا زیادہ ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں۔ اس کی وجہ اور جواز بھی پیش کیا ہے کہ عام بول چال کی زبان میں اردو کی شعری و نثری زبان جو عربی و فارسی الفاظ و تراکیب سے بھری پڑی ہے ان کا عام بول چال کی

زبان و محاورہ میں دخل انتہائی کم ہے جیسے بوسہ، وصل، زلف، رخسار و ہجر وغیرہ صرف شاعری میں استعمال ہوتے ہیں عام بول چال میں کم۔ اور محاورہ عام بول چال سے رواج پاتا ہے۔

نسائی زبان کے حوالے سے اگر ہم غور کریں تو اس کا آغاز وارتقا آج بھی ادبی زبان کی سطح پر اس درجہ نہیں شامل ہو سکا۔ ابتدائی دور میں بھی اس کا وجود بہت دیر سے متعارف ہوتا ہے اور جو ہوتا ہے تو وہ بھی چند مرد اہلِ قلم کے توسط سے۔ معاشرے کا مجموعی سماجی و ثقافتی جائزہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد نے بھی جو قابلِ قدر کام کیا تو وہ بھی انھی چند خواتین سے سنے گئے الفاظ و محاورات ہونگے جن سے ان کا اپنی زندگی میں رابطہ رہا۔ وہ چند خواتین ان کی ماں، بہن، بیوی، ساس یا خاندان کی گنی چنی خواتین رہی ہونگی۔ ظاہر ہے کہ وہ چند خواتین بھی مخصوص خاندانی حلقے تک محدود رہتی تھیں کیون کہ اس وقت پردے کا رواج بھی زیادہ تھا اور خواتین کا عملی زندگی یا گھر سے باہر کی زندگی میں مردوں سے سامنا بھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ مختلف طبقات کی نمائندگی کہاں تک ہو سکی یہ سوال تو باقی رہے گا۔

حوالہ جات

۱. خلیل صدیقی، زبان کا ارتقا، قلات پبلشرز، کوئٹہ، ۱۹۷۷ء، ص۹-۸

۲. محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگِ عامرہ، زین نعمان پرنٹرز لاہور، ۲۰۲۰ء، ص۵

۳. ایضاً، ص۳

۴. سید حامد حسین قادری، داستانِ تاریخِ اردو، جامع نگر نئی دہلی، بھارت، ۲۰۰۷ء، ص۵۵

۵. خلیل الرحمن داؤدی، رسالہء گل کرسٹ کے قدیم تر لغات، مشمولہ: اردو لغت نویسی کی تاریخ مباحث و مسائل (مرتبہ) رؤف پاریکھ، سپر مارکیٹ کراچی ۲۰۱۷ء، ص۵۷

۶. عابدہ بتول، ڈاکٹر، اردو لغت نویسی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مکتبہء اخوت اردو بازار، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص۴۶

۷. خواجہ عبدالمجید، جامع اللغات، جلد اول، اردو سائنس بورڈ لاہور، ۱۹۸۹ء، ص۱۵

۸. مرزا جان طپش دہلوی، شمس اللبیان فی مصطلحات برِ صغیر پاک و ہند، (مرتبہ) عابد رضا بیدار خدا بخش، لائبریری پٹنہ، ۱۹۷۹ء، ص۷

۹. مولوی عبدالحق، قدیم اردو، انجمن ترقی اردو کراچی. ۱۹۶۱ء، ص۲۰۵

۱۰. جو عمل واعظ لال، اردو زبان کی تاریخ، مطبع مجتبائی دہلی، ۱۹۲۰ء، ص۳۶

۱۱. نذیر احمد تشنہ، اردو ضرب الامثال، مقبول اکیڈمی، اردو بازار لاہور، ص۹

۱۲. سید ضمیر حسن دہلوی (. مقدمہ)، مشمولہ: اردو محاورات کا تہذیبی مطالعہ، عشرت جہاں ہاشمی، مرکزی پرنٹرز چوڑی دالان، جامع مسجد دہلی، ۲۰۰۶ء، ص۷

۱۳. ایضاً، ص۸

۱۴. محمد حسین آزاد، (مضمون) فرہنگ آصفیہ، مشمولہ، اردو لغت نویسی، رؤف پاریکھ، ص۳۰

۱۵. رؤف پاریکھ، لغت نویسی، تاریخ مسائل اور مباحث، فضلی بکس سپر مارکیٹ کراچی، ۲۰۱۷ء، ص۱۲

۱۶. رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۳۸۰

۱۷. دریائے لطافت، ص۵۳

۱۸. ایضاً، ص۵۴

۱۹. ایضاً ص۵۴

۲۰. ایضاً ص۴۹

۲۱. سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، پانچواں ایڈیشن، ۲۰۰۴ء، ص۱۹

۲۲. سید وقار عظیم، فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ، یونیورسل بکس اردو بازار لاہور ۱۹۸۶ء، ص۲۴-۲۵

۲۳. عبدالحق، ڈاکٹر، لغت کبیر، ص۲۴

۲۴. مسعود ہاشمی، اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ۱۹۹۲ء، ص۵۹

۲۵. ایضاً، ص۴۰

۲۶. محمد حسین آزاد، فرہنگ آصفیہ، مشمولہ: اردو لغت نویسی، رؤف پاریکھ، ص۳۰

۲۷. نواب وقار الامرا بہادر کی فیاضی، اداریہ، چودھویں صدی (اخبار) اشاعت، ۱۵ نومبر ۱۸۹۸ء

۲۸. سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۸۳۵

۲۹. ایضاً، ص۴۰

۳۰. سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ،، ص۴۱

۳۱. ایضاً ص۶۱

۳۲. ایضاً، ص۶۲

۳۳. ایضاً، ص۶۳

۳۴. ایضاً، ص۶۴

۳۵. ایضاً، ص۶۴

۳۶. ارمغانِ دہلی، حال معروف فرہنگِ آصفیہ (تبصرہ) اخبارِ انجمن پنجاب لاہور، ۱۷ مئی ۱۸۷۸ء

۳۷. سید احمد دہلوی، لغات النساء، کاشی رام پریس، سرِ ورق، ۱۸۷۵ء، ص۲

۳۸. ایضاً ص۲

۳۹. انجمن پنجاب، شمارہ ۸، مئی، ۱۸۷۵ء،

۴۰. محمد حسن عسکری، محاوروں کا مسئلہ۔ سنڈے ایکسپریس ادب ایڈیشن یکم نومبر، ۲۰۲۰ء، ص۱۳

۴۱. ایضاً ص۱۳

۴۲. گارساں دتاسی، برِ صغیر پاک و ہندی ادب ۱۹۷۵ء میں، جلد اول، حصہ دوم، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ص۱۴۳-۱۴۴

۴۳. گوپی چند نارنگ، مقدمہ، اردو کہاوتیں اوران کے سماجی پہلو، یونس اگاسکر،ڈاکٹر،موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریاگنج، نئی دہلی،۱۹۸۸ء، ص ۷

۴۴. زہرہ جبین، سید احمد دہلوی حیات اور کارنامے، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریاگنج، نئی دہلی،۲۰۰۶ء، ص ۲۰۳

۴۵. ایضاً، ص ۲۰۳

۴۶. سید احمد دہلوی، لغات النسا، کاشی رام پریس سابقہ نول کشور پریس لاہور،۱۹۱۷ء، ص ۹

۴۷. مولوی عبد الحق، اردو لغات اور لغت نویسی، مشمولہ: اردو لغت نویسی کے مسائل اور مباحث، ص ۱۲۹

۴۸. ایضاً، ص ۱۲۹

۴۹. ممتاز علی، دیباچہ، مالک اخبار، تہذیب نسواں، ص ۵۹

۵۰. سید یوسف بخاری دہلوی، دیباچہ، انشائے ہادی النسا، ص ۷

۵۱. سید احمد دہلوی، انشائے ہادی النسا، ص ۷۵

۵۲. ایضاً، ص ۸۱

۵۳. امیر اللغات، ص ۳

۵۴. ایضاً، ص ۱۵

۵۵. ابو محمد سحر، امیر مینائی کی لغت نویسی، مشمولہ: اردو لغات، اُصول اور تنقید، مرتبہ، رؤف پاریکھ، فضلی سنز کراچی،۲۰۱۴ء، ص ۱۳۷

۵۶. امیر اللغات، جلد دوم، ص ۱

۵۷. ،ایضاً، ص ۹۴

۵۸. امیر اللغات، جلد اوّل، ص ۲

۵۹. ابو محمد سحر، امیر مینائی کی لغت نویسی، مشمولہ: اردو لغات، اُصول اور تنقید، مرتبہ، رؤف پاریکھ، فضلی سنز کراچی،۲۰۱۴ء، ص ۱۳۷

۶۰. امیر اللغات، جلد اوّل، ص ۱۰۲

۶۱. مولوی عبد الحق، لغتِ کبیر اردو، انجمن ترقی اردو، بک کارنر جہلم،۲۰۱۷ء، ص ۴۳

۶۲. ایضا، ص ۴۳

۶۳. ایضا، ص ۴۳

۶۴. Ur.wikipedia.org/wiki' date:14 Dec,2020,Time : 11:09

۶۵. منشی چرنجی لال دہلوی، مخزن المحاورات، مطبع محب ہند فیض بازار دہلی، ۱۸۸۶ء، ص۵
۶۶. شمس الرحمن فاروقی، اردو لغت اور لغت نگاری، مشمولہ، لغت نویسی کے مسائل، گوپی چند نارنگ، کتاب نما، جامعہ نگر نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۹۱،۹۰
۶۷. مولوی عبد الحق، اردو لغت نویسی، مشمولہ: اردو لغت نویسی کی تاریخ، مسائل و مباحث، (مرتب) رؤف پاریکھ، ڈاکٹر، ص ۱۲۰
۶۸. مسعود ہاشمی، اردو لغات کا تنقیدی جائزہ، مشمولہ: لغت نویسی کے مسائل (مرتبہ) گوپی چند نارنگ، ص۱۵۹
۶۹. ایضاً ص۱۵۹
۷۰. منشی چرنجی لال، مخزن المحاورات، مقدمہ، ص۶
۷۱. ایضاً، ص۸
۷۲. ایضاً ص۲۰-۲۱

باب سوم

اردو نسائی زبان و محاورے کے ادبی تناظرات

الف) اردو ادبی نثر میں نسائی زبان و محاورہ (۱۸۵۷ء سے قبل)

اردو ادب کی بیشتر اصناف کی ابتدا دکن سے ہوئی۔ شروع میں تبلیغی مقاصد کے لیے مذہبی موضوعات کی کتابیں اور رسالے لکھے گئے۔ پندرویں صدی میں خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے رسالے "معراج العاشقین" کو اردو نثر کا پہلا نمونہ قرار دیا جاتا ہے۔ اسکا سنِ تالیف ۱۳۱۲ء سے ۱۴۲۱ء کے مابین ہے۔ شمالی ہند میں ابتدائی دور کی نظم و نثر کی تاریخ میں فضلی کی "کربل کتھا" ایک اہم تصنیف سمجھی جاتی ہے جس کے ذکر کے بغیر اردو نثری ادب کی تاریخ نامکمل ہے۔ یہ تصنیف دراصل ملا حسین واعظ کاشفی کی تصنیف "روضتہ الشہدا کا فارسی سے اردو ترجمہ ہے۔ مگر فضلی نے اس کا کچھ حصہ منظوم اور کچھ تصرف برتتے ہوئے نثر میں کیا۔ یہ "دہ مجلس" کے نام سے بھی معروف ہے۔ "طبقات الشعراء ہند" میں مولوی کریم الدین لکھتے ہیں کہ ان کے پاس "کربل کتھا کا قلمی نسخہ موجود ہے ان کے مطابق:

> "فضل علی نام تخلص فضلی، محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں موجود تھا اوس نے ایک کتاب "دہ مجلس" اردو زبان میں قدماء کے محاورات پر لکھی ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ "اون ایام میں میری عمر بائیس برس تھی۔ اوس کتاب کا نام اوس نے "کربل کتھا" رکھا ہے۔ سبب تالیف جو اوس نے بیان کیا ہے بعینہ اوس کی عبارت بے کم و کاست لکھتا ہوں۔"[۱]

حامد حسن قادری نے "داستانِ تاریخِ اردو" میں "ترجمہ طوطی نامہ" کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے مترجم کا نام آج تک سامنے نہ آسکا۔ اسے بھی "الف لیلی" کی طرح بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ سنسکرت زبان کی قدیم تصنیفات میں سے ایک ہے اس میں ستر قصے تھے جن میں سے باون کا فارسی با محاورہ ترجمہ مولانا ضیا الدین بخشی بدایونی نے ۱۳۳۰ء میں کیا۔ اس کے بعد ان باون قصوں میں سے پچیس کا ترجمہ فارسی میں ہی ملا سید محمد قادری نے کی۔ اسی "طوطی نامہ" کا اردو با محاورہ ترجمہ جس مترجم نے کیا اس کا نام اب

تک سامنے نہ آسکا مگر اس کی تصنیف موجود ہے جس میں سے تحریری نمونہ کے طور پر حامد حسن قادری نے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں[۲]

کہانی سے دلچسپی ہر انسانی تہذیب اور ہر زبان کے ادب کا ہمیشہ سے حصہ رہی اردو زبان میں داستان نویسی کی تاریخ انیسویں صدی سے شروع ہوئی "سب رس" جسے اردو کی پہلی داستان اور اس کے مصنف ملا وجہی کو اردو زبان کا انشائیہ نگاری اور غیر مذہبی ادب کا باوا آدم بھی کہا جاتا ہے، نے اس داستان کو ۱۶۳۵ء میں عبد اللہ قلی قطب شاہ کے عہد میں تحریر کیا۔ اردو افسانے کی تاریخ میں "سب رس" کی تصنیف کے بعد تقریباً ایک صدی تک ہمیں کوئی کتاب ایسی خاص نہیں ملتی جسے افسانہ کہا جا سکے۔ اگرچہ چھوٹی موٹی ادبی تحریریں ضرور تخلیق کی گئیں۔ لیکن اہم یہ ہے کہ ان میں سے کتنی کتابوں یا قصے کہانیوں نے باقاعدہ خاص وعام میں پذیرائی پائی اور ادب میں ایک ایسا خاص مقام حاصل کیا جو آج تک ہر دلعزیز ہو۔ ان چند ابتدائی افسانوں کے بعد مہر محمد حسین عطا خان تحسین کی کتاب "نوطرز مرصع" جو "قصہ چہار درویش" کا اُردو ترجمہ بھی شامل ہے۔ یہ قصہ فارسی میں بھی بہت مقبول ہے اور اس کے دونوں ترجمے اُردو میں تحسین اور میر امن نے کئے۔ یہ کتاب ۱۸۰۱ء میں سامنے آئی،

میر امن نے تحسین کے ترجمہ کو خود اپنی زبان میں لکھا۔ اور تمام عربی و فارسی الفاظ نکال کر انتہائی سادہ، صاف و سلیس زبان میں تحریر کیا۔ یہ نہ صرف ایک دلچسپ قصہ ہے بلکہ اس میں اس زمانے کے رسم و رواج اور طرز معاشرت کو انتہائی عمدگی سے پیش کیا۔ تاریخ نثر اردو بنام "نمونہ منثورات" حصہ اوّل میں احسن ماہروی لکھتے ہیں کہ اردو کتب کے ابتدائی نام خالص اردو زبان میں رکھے جاتے تھے جو عام روزمرہ بول چال سے ہوتے تھے وہ لکھتے ہیں "سب رس" اس میں دو لفظ ہیں جو بھاشا کی ابتدا سے سے اردو کے عہد حاضر تک روزمرہ بول چال میں بکثرت شامل ہیں۔"[۳]

۱۸۱۲ء میں عظمت اللہ نیاز نامی ایک شخص کی داستان سامنے آئی جس کا ایک قلمی نسخہ ہردیال میونسپل پبلک لائبریری میں موجود ہے اور "انڈیا آفس کے مخطوطاتِ اردو" میں بھی اس کا نام شامل ہے۔ یہ ایک مختصر رومانوی داستان ہے۔ "قصہ رنگین" کے قلمی نسخے سے ایک نمونہ پیش ہے جس میں اس وقت کی اردو کے محاورات و روزمرہ کا بخوبی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے:

> " سخن مختصر ہمایوں بخت مسکا باندھ کر مستور الھال دریا پر دوشالہ بچھایا اس پر سوار ہو کر ایک آن کی آن میں دوسرے کنارے پر آیا، دیکھا کہ ایک حصار

ہے نہایت بلند استوار کہ فلک دوار اس کی رفعت کے اگے سر جھکاتا ہے۔ کوہ
قاف دیکھا اس کے برجوں کے شکوہ سے دبا جاتا ہے۔"(۴)

اس کے علاوہ اردو کے ادبی سفر میں ایک اور قصے کا ذکر نمایاں نظر آتا ہے جس کا نام "قصہ بہرام گور" ہے۔ یہ قصہ ۱۸۴۵ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ ایک رومانوی قصہ تھا جیسا کہ اس عہد میں عموماً لکھے جاتے تھے اور اس کی زبان فارسی زبان کے زیرِ اثر قافیہ پیمائی سے لبریز تھی اور اس میں محاورات کے باعث کافی فصاحت پائی جاتی تھی۔ آہستہ آہستہ یہ ادبی سفر فارسی کے اثر سے نکل کر برِ صغیر پاک و ہند میں بولی جانے والی زبانِ اردو کے عین فطری اور عوامی رنگِ زبان میں رنگنے لگا تھا۔ ادبی سفر میں داستانوی انداز اب بھی موجود تھا مگر روایت سے قدرے مختلف اپنا ایک جداگانہ رنگ جما رہا تھا۔ زبان و محاورہ کے رنگ گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ نسائی زبان اب ادبی نثر میں شامل ہونا شروع ہو چکی تھی۔

طبع زاد اور ترجمہ شدہ داستانیں اردو زبان و ادب میں اپنے عہد کے طرزِ تحریر و فکر کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ اور زبان کے ارتقائی سفر اور نشو و نما میں ان کا کردار نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدائی اردو نثر کے حوالے سے شیخ محمد بخش مہجور کو انیسویں صدی کا ممتاز مصنف کہہ سکتے ہیں جس نے تین تصنیفات اردو نثر کو عطا کیں، یہ تین تصنیفات "انشائے گلشن نو بہار"، "انشائے چمن"، اور "انشائے نور تن" ہیں۔

"رانی کیتکی کی کہانی" انشا اللہ خان انشا کی ایک یادگار تصنیف سمجھی جاتی ہے اور اس کے ذکر کے بغیر ادبی سفر کی کہانی مکمل نہیں سمجھی جا سکتی۔ اس کی خاص بات اس میں لکھی جانے والی زبان اور انشا کا منفرد اسلوب ہے۔ انشا اللہ خان انشا ۱۷۵۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۱۸ء میں وفات پائی۔

اردو قواعد کی پہلی کتاب کے طور پر ان کی تصنیف "دریائے لطافت" کو بھی اولیت کا خاص مقام حاصل ہے جو فارسی میں لکھی گئی اردو قواعد کی پہلی کتاب ہے۔ "سلکِ گہر" بھی بے نقط داستان کی حیثیت سے کم اہمیت نہیں رکھتی۔ انشا چونکہ زبان دانی کی خاص صلاحیت رکھنے والے ایک نابغہ تھے اس لیے جدت پسندی اور عام روش سے ہٹ کر چلنے کی ان کی فطری صلاحیت نے ان سے منفرد تخلیقی تجربات کروائے۔ ریختی کے حوالے سے بھی وہ خاص شہرت رکھتے ہیں۔

انشا نے ایک دن اپنے کسی ہم عصر دوست سے مشورہ کیا کہ وہ ایک ایسی کہانی لکھنا چاہتے ہیں جس میں صرف مقامی زبانوں کے الفاظ شامل ہوں اور عربی، فارسی، سنسکرت اور ترکی زبان کا کوئی لفظ نہ ہو۔ ان کے

دوست نے کہا کہ ایسا ممکن نہیں۔ انشا کو یہ بات بہت بری لگی اور انھوں نے ٹھان لی کہ وہ ایسا کر کے دکھائیں گے۔ اور واقعی انھوں نے "رانی کیتکی" کی صورت میں ایسا کر دکھایا سید قدرت نقوی لکھتے ہیں:

"رانی کیتکی کی زبان ایک ایسے ہندو خاندان کی زبان کے مماثل ہے جو تعلیم یافتہ اور دوآبہ گنگا و جمن کے دور دراز دیہات میں رہتا ہے اور جسے شہر و قصبے کی زبان سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ ایسی زبان کی جھلک تا حال اس علاقے میں پائی جاتی ہے مثلاً افعال میں جمع مؤنث کی یہ شکل آتیاں، جاتیاں، آئیاں تھیں وغیرہ تو آج بھی اس علاقے کی عوام میں مروج ہے بلکہ آتیاں تھیں کی جگہ آتیاں تھیاں بولتے ہیں۔ انشا کا کمال ہی یہ ہے کہ اس نے اپنے دعوے کے نبھاؤ کے لیے ہندو تہذیب و معاشرت کو منتخب کیا تھا تاکہ دعوی پوری طرح نبھایا جاسکے۔"(۵)

"رانی کیتکی" کو مختلف زبانوں کے الفاظ کا بہترین برتاؤ اور استعمال بھی کہا جاسکتا ہے مگر بنیادی طور پر یہ اردو زبان ہی کہلاتی ہے جس میں ہندو تہذیب کے الفاظ اور عوامی بولی کی خصوصیات نظر آتی ہے چونکہ ان کا تعلق اور کرداروں کا چناؤ ہی ہندو تہذیب و تمدن پر تھا اس لیے زبان بھی انہی کی استعمال کی گئی۔

مرتبین نے رانی کیتکی سے مختلف تراکیب، افعال، مشتقات و مرکبات کو بطور مثال بھی پیش کیا ہے۔ جیسے افعال میں سے رکھے، پڑے، لائے دیں، دیئے، بنایا، دکھایا، پایا، چکھی ہے، اور رگڑ تا ہوں وغیرہ۔ تنقید کے حوالے سے دیکھا جائے تو بات کی بات میں، بڑوں سے بڑے، کل کا پُتلا، مٹی کی باس، سانس کی پھانس، دھیان کا گھوڑا جیسی تراکیب ملتی ہیں۔ اسی طرح محاورات میں سر جھکانا، کھٹائی میں پڑنا، ناک بھوں چڑھانا، رائی کو پربت کرنا، آنکھیں چرانا، چوکڑی بھول جانا اور انگلیاں نچانا وغیرہ جیسے محاورات کا خوب صورت استعمال پایا جاتا ہے جیسے:

" ان کے ہمارے ناتا نہیں ہونے کا اور ان کے باپ دادے ہمارے باپ دادوں کے آگے ہاتھ جوڑ کے باتیں کرتے تھے اور ٹک جو تیوری چڑھی دیکھتے تھے تو بہت ڈرتے تھے۔۔ جن کے ماتھے ہم پاؤں کے انگوٹھے سے ٹیکا لگادیں وہ مہاراجوں کا راجہ ہو جاوے، کسی کا منہ جو یہ بات ہمارے منہ پر لائے"(۶)

مشتقات کے حوالے سے بنانے والا، بھیجا ہوا، کھلاڑی بنایا ہوا، بیٹھے بیٹھے، بڑبولا، کود پھاند، چاہنے والا اور اگر مرکبات دیکھنا چاہیں تو ابتدائی چند صفحات ہیں میں پچیرا بھائی ،بے باک ، `کڑوا کسیلا ،ہندوی

پن، ٹھنڈی سانس، بے سُرا، بے ٹھکانا، اٹھکیل پن، الہڑ پن، اور اچھا پن جیسے مرکبات مل جاتے ہیں۔ ہم "رانی کیتکی" کو ایک ایسی اردو قرار دے سکتے ہیں جس میں فرانسیسی، انگریزی، عربی اور فارسی کے بجائے مقامی زبانوں کے الفاظ و تراکیب پر زیادہ زور دیا گیا ہے عبارت مقفع و مسجع ہے۔ اس کہانی میں خالصتاً برِ صغیر پاک و ہندی ماحول اور معاشرت ملتی ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ "اردو نثر کا آغاز و ارتقا" میں لکھتی ہیں کہ اس کہانی میں انشا کا کمال یہ ہے کہ اس کا سارا ماحول مقامی برِ صغیر پاک و ہندی ہے۔ کہیں جیوتش، پنڈت قسمتوں کا حال بتاتے ہیں تو کہیں لڑکیاں امراؤں میں جھولتی ہیں۔"(۷) اس کے اشعار عام فہم ہیں اور منظر نگاری اپنے عروج پر ہے۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> "شمالی ہند کی انیسویں صدی کی پہلی داستان جو عربی اور فارسی سے مبرا ہے اور تشبیہ، استعارات، رومانیت اور ابہام کے ساتھ ساتھ شگفتگی اور محاورات کے خوب صورت استعمال کی وجہ سے اپنا خاص ادبی مقام رکھتی ہے وہ سید انشاء اللہ خان انشاء دہلوی کی "کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی"(۸)

رانی کیتکی کے مقدمے میں سید قدرت نقوی لکھتے ہیں کہ سید انشاء اللہ خان انشاء اللہ متعدد زبانوں اور بولیوں کے ماہر تھے اور اس کا ثبوت ان کی تصانیف سے ملتا ہے۔ شعری کلیات میں تقریباً ہر زبان اور بولی کے اشعار موجود ہیں جو ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ہیں۔ دریائے لطافت میں اردو زبان کے مختلف روپ، اس کے اپنے علاقے اور لہجے کے ساتھ انھوں نے پیش کئے ہیں جیسے نسائی زبان کے طور پر ملاحظہ فرمایئے:

> "اللہ اللہ تمام شب باجی جان کہتی تھی کہ مجھے چھوٹے بھائی پر بہت تیہا آتا ہے کہ ناحق تگا جی کو ساتھ لے کر کے گھر چھوڑ کے جاتا ہے ایسا نہ ہو کہ اس جھلے کی دوستی میں اپنا سر کٹوا دیے تھے میں نے کہا آپ کاہے کو کڑھتی ہیں اس لڑکے کا اللہ بیلی ہے۔"(۹)

انشا کا زبان کی قدرت پر جو مان تھا اس کا ثبوت اس نے "رانی کیتکی" کی صورت میں پیش کیا اور اپنے قول پر پورا اترا۔ الفاظ کے ایک شاندار ذخیرے کے علاوہ یہ تشبیہات و استعارات کا خوب صورت امتزاج بھی ہے ڈاکٹر شہناز انجم "ادبی نثر کا ارتقا" میں لکھتی ہیں کہ انشا کو زبان پر قدرت حاصل ہے اور بلاشبہ الفاظ کا بڑا ذخیرہ ان کے پاس موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی واقعات ان کا مشاہدہ اور تجربہ بھی ایسا جاندار ہے گویا مناظر

کی حقیقی عکاسی کر رہے ہوں انھوں نے اس کہانی کو دلچسپ بنانے اور زبان کو شگفتہ و شاداب بنانے کے لیے مہارت سے خوب صورت تشبیہات استعمال کی ہیں اور استعارات کے استعمال سے بھی گریز نہیں کیا۔"(۱۰)

"اردو زبان کی تاریخ میں "سب رس" کو وہ اہمیت حاصل ہے کہ اس کے بغیر اردو زبان اور بالخصوص نثری ادب کا تذکرہ ممکن ہی نہیں اور اردو زبان اردو اسالیب اور اس کے ارتقا پر بات کرنے کے لیے "سب رس" سے صرف نظر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اردو تاریخ و زبان و ادب کی اہم ترین نثری تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اس کے مقدمے میں مولوی عبد الحق لکھتے ہیں:

> کچھ ہی دنوں پہلے تک "ولی" اردو شاعری کا باوا آدم مانا جاتا تھا اور بعض کو اب بھی اس پر صرار ہے۔ پرانی باتیں دل سے نکلتے ہی نکلتی ہیں۔ لیکن تحقیق سے اب یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ ولی سے بات پہلے اردو کے بہت اچھے اچھے شاعر ہو گزرے ہیں۔ اس طرح اب تک اردو نثر کی پہلی کتاب فضلی سے منسوب کی جاتی تھی اور اس کی کربل کتھا" اردو نثر کی پہلی کتاب سمجھی جاتی تھی لیکن حال ہی میں معلوم ہوا کہ فضلی سے کہیں پہلے نثر میں بہت سی کتابیں لکھی گئی تھیں مگر پردہ اخفا میں تھیں۔ تحقیق و جستجو نے اب اُنھیں گمنامی سے نکالا ہے۔ انھیں میں سے ایک قابل قدر کتاب "سب رس" ہے۔"(۱۱)

"سب رس" کے مصنف وجہی کا تعلق قطب شاہی بادشاہوں کے دربار سے تھا اور قطب شاہی بادشاہوں کے عہد میں علم و ادب کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ اکثر بادشاہ خود صاحب دیوان شاعر تھے۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ, عبد اللہ قطب شاہ تینوں بہت پائے کے شاعر گزرے اور ان کی خوش ذوقی و علم و ادب کی سرپرستی نے علماء و شعراء کی خوب ادب پروری کی۔ "سب رس" قطب مشتری "اور" تاج الحقائق" تینوں "ملا وجہی" کی تصنیفات ہیں۔ ملا وجہی صرف نثر نگار ہی نہیں بلکہ بہت عمدہ شاعر بھی تھے اور اپنے شعری کلام و غزلیات کو سب رس میں جابجا شامل بھی کرتے رہے۔

تحقیق سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ "ملا وجہی" نے اس قصے کو "فتاحی" کے قصے سے اٹھایا اور تمام کی تمام کہانی "سب رس" میں اپنے لفظوں کی جادوگری سے بیان کر دی۔ فارسی میں یہ قصہ "حسن و دل" کے نام سے داؤد ایلیچی نے بھی مثنوی کی صورت میں لکھا ہے۔ ملا وجہی نے "سب رس" کے دیباچے میں اس کو اپنی طبع زاد تصنیف ہی قرار دیا ہے جبکہ "دستور عشاق" میں یہی قصہ "فتاحی" نے رقم کیا ہے۔ مولوی عبد الحق

مقدمے میں لکھتے ہیں کہ شاید وجہی کو فتاحی کی "حسن و دل" کہیں سے ملی ہو گی اور "دستور العشاق" کہیں نظر سے نہ گذری اس لیے اس نے اپنی نثر میں ویسی مقفیٰ و مسجع عبارت سے کام لیا۔ جبکہ "ملا وجہی" اس قصے کی ابتدا میں وجہ تالیف و تصنیف کے بعد "در زینتِ سخن و در نام کتاب گوید" میں اپنی تحریر کی خوبیاں خود بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غرض بہوت نادر نادر باتاں بولیا ہوں "دریا ہو کر ماتیاں رولیاں ہوں،
موتیاں کی موجاں کا میں دریاہوں، تمام موتیاں سوں بھریاہوں،
اس دریا میں غوطہ کھائیں گے، تو جا گا جا گا کے غواصیاں موتیاں پائیں گے۔
یوں کتاب عجائب ایک بندر ہے۔ اگر سورج منگتا و گر چندر ہے۔
فریاد ہو کر مدونو جہاں تے آزاد ہو کر، دانش کے تیشے سوں پہاڑاں اُلٹایا، تو یو شیریں پایا۔" (۱۲)

"سب رس" کی زبان و اسلوب کی اگر بات کی جائے تو اس عہد کے پس منظر اور نثری کتب کے ناپید ہونے کے باعث یہ ملا وجہی کا بلاشبہ بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے کہ اُس نے حتی المقدور اپنی نثری تحریر کو دلچسپ اور دلکش بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس میں خاص طرح کی فصاحت اور روانی کا احساس ملتا ہے۔

جمیل جالبی "تاریخ ادب اردو" جلد سوم میں لکھتے ہیں جان گلگرسٹ کی خواہش تھی کہ اس قصے کو ٹھیٹھ برِ صغیر پاک وہندی زبان میں لکھا جائے ایسی زبان جو ہندو، مسلمان، مرد، عورت، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کیا جائے میر امن نے لکھا ہے کہ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے"۔ (۱۳)

مولوی عبد الحق "سب رس" کی جلد چہارم کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ "سب رس" کی زبان قدیم ہے اس کے الفاظ اور محاورات قدیم ہونے کی وجہ سے آج کل سمجھ میں نہیں آتے، لیکن اس قدامت کے باوجود اس کتاب کی خوبی اور اہمیت کم نہیں ہوتی۔" اس نے اپنے زمانے کی نہایت بامحاروہ اور فصیح زبان لکھی ہے" (۱۴)

سب رس کی زبان کو خود ملا وجہی نے برِ صغیر پاک وہندی زبان کہا ہے۔ اس امر سے انکار تو ممکن نہیں کہ تین چار صدی پیشتر کی دکنی زبان جس طرح کی تھی ملا وجہی نے وہی انداز اپنایا ہو گا۔ آج وہ زبان تو اُس طرح موجود نہیں بہت سے الفاظ و تراکیب متروک ہو چکے ہیں اور کئی روزمرہ اور محاورات کا استعمال اب نہیں

رہا۔ مگر یہ کتاب اردو کے اہم ترین نثری اثاثوں میں شامل ہے جس کے مطالعے سے ہمیں اردو زبان کی ابتدائی صرف و نحو، بہت سے محاورات اور بہت سے ضرب الامثال اور ہندی، فارسی و مقامی الفاظ کا ذخیرہ ملتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے بھی اس طرف توجہ کروائی ہے اور "سب رس" کو مرتب کرتے وقت اپنے مقدمے میں اس طرح اظہار کیا ہے:

> "ایک کام کی بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ بعض محاورات اُس وقت بھی بعینہ اسی طرح استعمال ہوتے تھے جیسے آج کل مثلاً شان نہ گمان، خالہ کا گھر، کہاں گنگا تیلی کہاں راجہ بھوج، گھر کے بھیدی تے لنکا جائے (گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے) شرم حضوری، دیکھا دیکھی، چائیں مائیں کھیلنا، سوبا ھورر سگند، دودھ کا جلیا چھاچھ پھونک پینا وغیرہ اس سے الفاظ و محاورات کے علاوہ اس کتاب سے قدیم دکنی یا اردو کی صرف و نحو اور بعض الفاظ کے تغیر و تبدل کا پتا بھی لگتا ہے۔"(۱۵)

تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ ملا وجہی نے اسے اپنی طبع زاد تصنیف کے بطور متعارف کروایا تھا جبکہ انھوں نے اس قصے کو "حسن و دل" سے اٹھایا تھا۔ اب تحقیق کے بعد یہ ثابت بھی ہو چکا ہے کہ یہ قصہ طبع زاد نہ تھا مگر ملا وجہی نے اس کشادہ ظرفی سے کام نہ لیا کہ اس قصہ کے اصل ماخذ کا تذکرہ کرتے۔ اصل بنیادی قصے کے خالق یحیٰ بن سیبک فتاحی نیشاپوری تھے۔ وجہی نے وہیں سے اس قصے کو اٹھایا تھا۔(۱۶)

چوسر (Geoffery Chaucer) کی (Canterbury Tales) میں بھی الف لیلیٰ کی طرح کا اساطیری انداز ملتا ہے۔ اسے ۱۳۸۷ء سے ۱۴۰۰ء کے درمیان میں لکھا گیا۔ اس میں زائرین اکھٹے ہو کر سفر کرتے ہیں اور سرائے کا مالک بھی ساتھ ہو لیتا ہے۔ ہر کسی نے دو دو قصے سنانے ہوتے ہیں بہترین قصہ گو کو واپسی پر زائرین دعوت دیتے ہیں۔ اس میں بھی اندازِ بیاں محاوراتی ہے جو دنیا کی تمام زبانوں کے ابتدائی ادب میں قریب قریب ایک جیسا ہے جیسے اگر راہ گیر کو ٹھوکر لگ جاتی تو وہ یوں کہتا تھا کہ پتھر کی ٹکر نے میرے پاؤں میں ڈس لیا، سورج نکل آیا، دیوار کھڑی ہو گئی، چھت گر پڑی، جوتے نے کاٹ لیا۔ آندھی آ رہی ہے۔ گویا یہ سب صاحب ارادہ چیزیں ہیں۔(۱۷)

اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کی کسی بھی تہذیب کا رنگ اس کے ادب میں جھلکتا ہے۔ اس تہذیب میں سینہ بہ سینہ چلی آتی روایات سے لے کر ان کی مجموعی سوچ ان کے رہن سہن کے طور طریقے اور ان کا اثر

موجود ہوتا ہے۔ یہی فرق اسے دنیا کے دیگر ادب سے ممتاز کرتا ہے۔ برِ صغیر پاک وہند بھی ہزاروں برس کی تہذیب کی قدیم روایات کا امیں ہے۔ جو اس کے ادب میں بھی در آئیں۔ مثلاً مغرب سے بالکل برعکس یہاں کے ماحول میں عشق و محبت کے موضوعات پر کھلے لفظوں میں اظہار کو معیوب کیا جاتا ہے اور صدیوں سے ایسا چلا آرہا ہے

اردو زبان میں "قصہ ءچہار درویش" کے تین نسخے شائع ہوئے جن میں سے ایک "نوطرزِ مرصع" اور ایک "باغ و بہار" ہے اور سب سے سادہ اختصار کے ساتھ میر احمد خلف شاہ محمد کا مطبوعہ نسخہ ہے جو مطبع حیدری سے ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا اولیں نسخہ دلی یونیورسٹی کی لائبریری میں آج بھی موجود ہے۔

فورٹ ولیم کالج میں تراجم اور سلیس نگاری کا ابتدائی کام یہی کتاب تھی۔ اور عجیب اتفاق تھا کہ سرکاری مقاصد کے لیے بنایا جانے والا فورٹ ولیم کالج سلیس اور سادہ اسلوب کی تحاریر کے لیے ایک مثال بن گیا۔ اور ترجمہ شدہ کتاب "باغ و بہار" اس کا نقطہ آغاز قرار پائی۔ پروفیسر ڈنکس فارس ایل۔ ایل۔ ڈی نے باغ و بہار کو مرتب کر کے ۱۸۶۴ء میں لندن سے طبع کروادیا تھا۔ اس کے پیش لفظ میں اُنہوں نے یہ بھی لکھا کہ برطانوی حکومت نے برِ صغیر پاک و ہندی زبان میں امتحان پاس کرنا تمام سول، ملٹری اور میڈیکل جونیئر افسران کے لیے ضروری قرار دے دیا تھا۔ اس لیے باغ و بہار کی اشاعت بھی فوری عمل میں لائی گئی تھی۔ اس میں عام برِ صغیر پاک وہندی سادہ زبان کا استعمال وقت کی ضرورت تھا۔

قصہ چہار درویش میں میر امن عورت کی زبان میں تمام امرت رس، حلاوت و محبت اور ہمدردی کی چاشنی اس وقت گھولتے ہیں۔ جب پہلا درویش مدت بعد اپنی خستہ حال بہن کے ساتھ ملاقات کرتا ہے۔ تو بہن کی خدمت اور محبت کا تزکرہ کچھ اس طرح سے کرتے ہیں:

> "وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل ماش اور کالے ٹکے مجھ پر صدقے کئے،۔۔۔ کہنے لگی اے بیرن تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔۔۔ جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں۔۔۔ لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے۔۔۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر رہتا ہے اس کو دنیا کے لوگ طعنہ دیتے ہیں۔ خصوصی اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمھارے آنے پر کہیں گے کہ اپنے باپ کی دولت دُنیا کھو کر، بہنوئی کے ٹکڑوں پر آپڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمھاری

ہنسائی اور ماں باپ کے نام نسب لاج لگنے کا ہے۔ نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا
کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال ڈال رکھوں۔"(۱۸)

اس قصہ میں پہلا با قاعدہ اپنی بہن کا بیک وقت اپنے بھائی سے محبت کا اظہار، مدتوں بعد ملنے کی خوشی، اور بھائی کی خاطر تواضع کے ساتھ ساتھ ایک فطری پریشانی بھی بہن کی زبانی بتائی گئی ہے کہ اگرچہ ایک بہن اپنے بھائی کے لئے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے، لیکن پھر بھی اسے زمانے کی طرف سے بھی ڈر ہے کہ لوگ اُسے نکما، نکھٹو نہ کہیں اور وہ مرحوم والدین کے لئے باعث ننگ و عار نہ ہو۔ وہ لوگوں کا نام لیکر بھائی کو سمجھاتی ہے کہ نکمے مرد کسی عزت کے لائق نہیں ہوتے۔ بلکہ مرد کی عزت و توقیر کمانے اور بوجھ اُٹھانے میں ہے۔

ڈاکٹر ممتاز منگلوری "مقدماتِ باغ و بہار" میں "باغ و بہار" کی فنی خوبیوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اپنے بھائی کو گھر رخصت کرتے ہوئے جو جو رسوم داستان میں ایک بہن ادا کرتی ہے وہ ہماری تہذیب سے متعلق ہیں۔ مثلاً "مٹھائی یا زادِ سفر کے طور پر کوئی پکوان ایک خاصدان میں بھر کر ہرنے سے لٹکانا اور چھاگل پانی کی ساتھ روانہ کرنا، امام ضامن کا روپیہ مسافر کے بازو پر باندھنا، ٹیکا ماتھے پر لگانا اور دعاؤں کی چھاؤں میں جانے والے کو رخصت کرنا۔ یہ سب آج تک ہماری گھریلو خواتین کے مزاج میں شامل ہیں۔۔(۱۹)

اس میں انتہائی سادہ اور عوامی زبان استعمال کی گئی ہے۔ بہن کا بھائی کی بلائیں لینا، باغ باغ ہونا، چمڑے کی جوتیاں بنانا، جیسے روزمرہ اور محاورہ کیسے برمحل استعمال ہوتے ہیں۔ "بلائیں لینا" ور "چمڑے کی جوتیاں بنانا" خاص طور پر عورت کی زبان کا حصہ اور اس کے مزاج کی انکساری اور محبت کی شدتوں کو بیان کرتے ہیں۔ اگرچہ شہزادے کی بہن ہونے کے ناطے بھی بہن کے لہجے میں شہزادیوں والی تمکنت اور وقار نہیں دکھایا گیا۔ بلکہ اس لہجے میں فکر و تدبر، پریشانی اور تاسف کی جھلک نظر آئی ہے۔ اور اسی حالت میں بھائی کو لاچارگی سے رخصت کرتی ہے۔

ہمارے معاشرے کی عورتیں وفا شعار ہیں جان نثار ہیں مگر سوتن کو برداشت کرنا ان کے لیے مشکل ہے لکھتے ہیں کہ عورتوں کو مردوں کی بیوفائی یا زیادہ شادیوں کی وجہ سے ہمہ وقت ایک عدم تحفظ کا احساس ستاتا ہے جو نہ صرف ان کی گفتگو بلکہ توہمات و رسومات کا بھی لازمی حصہ بن چکا ہے اور نجومیوں جوتشیوں اور تعویز گنڈوں والوں کی طرف زیادہ راغب ہوتی ہیں۔ اردو زبان میں نسائی زبان محاورہ کا ایک بڑا حصہ ایسا بھی موجود ہے جو صرف انہی توہمات کی بنیاد پر تخلیق ہوا ابوالخیر کشفی لکھتے ہیں کہ باغ و بہار تہذیبی نقطہ نظر سے بھی بہت

اہم ہے۔ اس میں اپنے دور کے انسانوں کی زندگی متحرک ملتی ہے۔ شہزادیوں کی جنسی الجھنیں ہیں اور خواجہ سراؤں سے جنسی تسکین کے بھی تذکرے ہیں، توہمات کا ذکر ہے، ٹوٹکوں کی بھرمار ہے۔ [20] شکوے شکایتیں اور طعنے تشنے، بد دعائیں عورت کے مزاج کا خاصہ ہوتے ہیں اور زبان کی نمکین لذت بھی ان کے دم سے ہے۔

عورت کی زبان میں ہی طعنے تشنے اور کوسنے ملتے ہیں وہ بنیادی طور پر شدید جذباتی ہوتی ہیں اور ان کے پاس سماجی سطح پر اتنے تعلقات اور وسیع مواقع نہیں ہوتے کہ وہ اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کر سکیں اس لیے اس گھٹن زدہ ماحول میں وہ لذتِ زبان سے ہی کام لے کر دل کا غبار نکال لیا کرتی ہیں۔ جیسا کہ "اے کمبخت، بے وفا، اے ظالم، پُر جفا، بدلا اس بھلائی اور محبت کا یہی تھا جو تو نے کیا' بھلا ایک زخم اور بھی لگا، میں نے تیرا انصاف خُدا کو سونپا۔" [21]

جبکہ یہی حسینہ جب درویش کی معشوقہ بن جاتی ہے تو اس کا لہجہ محبت اظہار کا جواب کچھ اس طرح سے دیتا ہے۔ تیکھی ہو کر، تیوری چڑھا کر، خفگی سے بولی، یہ خوش! آپ ہمارے عاشق ہیں؟ مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ اے بے وقوف اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں بنانا خیال خام ہے۔ چھوٹا منہ بڑی بات، بس چپ رہ۔

میر امن نے عام بول چال کی زبان کو ارادتاً اس طرح اس داستان میں برتا ہے کہ عوامی تلفظ کو بھی صحتِ زبان پر فوقیت دی ہے۔ اور عام بول چال کو ہی تحریر میں بھی شامل کر دیا ہے۔ اصطلاحات اور تراکیب انھوں نے خصوصاً مکالمات میں ہندی الفاظ استعمال کر کے اسے عام آدمی کی زبان کے قریب تر کر دیا۔ اسی خوبی کی بابت سید وقار عظیم "فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ" میں لکھتے ہیں میر امن نے اس کو عام روز مرہ کی زبان میں لکھ کر قبولیت عام کے درجے پر پہنچا دیا اور ایک ایسے اسلوب کی بنیاد رکھی جس نے ادب کو عام آدمی کی سمجھ بوجھ اور دلچسپی کی سطح تک لے آیا۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> "میر امن کی عبارت کا ہر فقرہ ایک خاص طرح کے ادبی لطف کا حامل ہے۔ اس کی روز مرہ میں انتہائی سادگی کے باوجود ایک ہر جگہ انشا پردازی کی شان ہے۔ وہ قواعد کی صحت سے زیادہ روز مرہ کی لذت اور محاورے کی حلاوت و چاشنی کو اہمیت دیتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک زبان کے روز مرہ کی سادگی و گھلاوٹ اور محاورے کی بے تکلفی و برجستگی میں ایک مخصوص معاشرت کی روایتوں کا عکس بھی ہوتا ہے۔" [22]

یہاں تک کہ خواتین کا کردار چاہے وہ بہن کا تھا، بیٹی کا تھا، محبوبہ کا تھا اسے اس کی فطری زبان دی۔ دوسرے درویش نے جب اپنے وعدے کے مطابق بعد از نکاح بیوی سے ازدواجی تعلق نہ رکھا تو وہ شہزادی

اس وقت اپنا حق لینے کے لئے روایتی بیویوں کی طرح طنز کے نشتر چلاتی ہے۔ جب شہزادہ سویرے نہانے کے لئے گرم پانی مانگتا ہے۔ نسوانی کردار اپنی زبان، رشتوں کی لاج نبھانے والے، موقع کی مناسبت سے بر محل گفتگو و محاوروں پر مکمل عبور رکھتے ہیں جبکہ تیسرے درویش کی داستان میں ایک کردار کٹنی خاتون کا ہے۔ جو کہ ہر دور، ہر مسلک و مذہب اور ہر معاشرے میں پائی جاتی ہے۔ میر امن بھی اس لہجے کو کچھ یوں ظاہر و عیاں کرتے ہیں:

> "تیری نتھ، چوڑی، سہاگ سلامت رہے اور کماؤ کی پگڑی قائم رہے۔ میں غریب رنڈیا فقیرنی ہوں۔ ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دوجی پورے دنوں سے ہے، دردِزہ سے مرتی ہے۔ اور مجھ کو اتنی فرصت نہیں کہ آدھی کا تیل چراغ میں جلاؤں۔ کھانے پینے کو تو کہاں سے لاؤں۔ اگر مر گئی تو گور و کفن کیونکر کروں گی اور جنی تو دائی جنائی کو کیا دوں گی۔ اور بچہ کو سٹھورا اچھوانی کہاں پلاؤں گی (۲۳)

باقی نسائی کرداروں کی طرح بھی اس بڑھیا کی زبان، الفاظ اور لب و لہجہ ہی اس کی عیار طبیعت اور فطرت کا عکاس ہے۔ اور اس کی پوری گفتگو سے اس کی چالاکی ظاہر ہوتی ہے۔ میر امن نے اس دور کی عورتوں اور اُن کے سماجی رویوں کی اُن کی عادت، گفتگو سے مکمل طور پر تصویر پیش کی ہے۔ یہاں ہم جن خالص نسائی زبان کے الفاظ کا مشاہدہ کرتے ہیں وہ نتھ چوڑی سلامت رہنا (سہاگ قائم رہنے کی دعا کیونکہ بیوہ کی نتھ اتروالی جاتی تھی اور چوڑیاں توڑ دی جاتی تھیں صرف بیاہتا عورت ہی نتھ چوڑی پہنتی ہے)، دوجی سے ہونا، پگڑی قائم رہنا، پورے دنوں سے ہونا، آدھی کا تیل، دائی جنائی، سٹھورا، اچھوانی (زچہ کے لیے تیار کی جانے والا سونٹھ، گوند، اجوائن وغیرہ کا شیرہ)

نسائی زبان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کا موضوع اس کے گہرے مشاہدات کی بنیاد پر بعض اوقات ایسی ایسی باتیں بھی بن جاتی ہیں جو مردوں کی زندگی میں کبھی اس اہمیت کی حامل نہیں ہوتیں۔ عورت کی نگاہ عموماً چھوٹی چھوٹی جزیات پر ہوتی ہے جن سے مرد اکثر صرفِ نظر کر جاتے ہیں۔ باغ و بہار کے صفحہ پچپن پر جہاں ملکہ کا صرف ایک جملہ بہت سے داخلی معاملات کو بے نقاب کر جاتا ہے وہاں اس کے طنز کی چبھن بھی چھپائے نہیں چھپتی جب وہ دولہا کے شادی کے آٹھ دن بعد تک ہم بستری نہ کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہے جب غسل کے لیے خواص سے پانی گرم کرنے کو کہا جاتا ہے تو ملکہ مسکرا کر کہتی ہے کہ "کس برتے پر تتا پانی؟ ااور مزید کہنے لگی کہ تم عجب آدمی ہو، اتنے گرم پانی یا اتنے ٹھنڈے پانی، اسکو کیا کہتے ہیں؟ اگر تم میں

قوت نہ تھی تو کیوں ایسی کچی ہوس پکائی۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ "میر امن سے عبد الحق تک" میں لکھتے ہیں کہ اسی طرح کی مقامی زبان کے الفاظ و محاورات کے استعمال نے باغ و بہار کو دیگر داستانوں میں منفرد مقام عطا کیا۔ اپنی اپنی طرف سے ہر داستان نویس اپنی زباندانی کی بھرپور صلاحیتوں کا استعمال کر رہا تھا مگر جس عام فہم سادہ انداز نے باغ و بہار کو عوامی مقبولیت بخشی وہ عام عوام کے قریب تر بولی جانے والی زبان ہی تھی ان کے الفاظ ہیں:

"باغ و بہار میں کہنے اور باتیں کرنے کا انداز پایا جاتا ہے اور کبھی مقامی بول چال کے الفاظ مثلاً بانہہ، بیلی وغیرہ محاوروں کا رنگ گہرا کرنے کے لیے تابع مہمل مثلاً کپڑے وپڑے، ننگا منگا، مناونا وغیرہ لکھتے ہیں جس سے دلکشی میں اضافہ ہوتا ہے۔"(۲۴)

یہاں ہم شہزادی کو اپنے جذبات کی لاپرواہی، توہین یا درویش کی بے اعتنائی اور مردانگی پر مشکوک ہو کر اُبلتے دیکھتے ہیں۔ لیکن اس میں بھی بے حیائی کے پہلو کو مدِ نظر رکھنے کی بجائے اعتماد سے اپنا حق مانگنے کا کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اور طنزیہ لہجہ تو عورت کی ایسی مواقع پر پہچان اور خاصیت ہے۔ باغ و بہار میں دہلوی تہذیب کا مکمل عکاسی کی گئی ہے اور اس کے تمام کردار چاہے ان کا تعلق ترکی و ایران سے ہو وہ اپنے تمام رسوم وعقائد اور طرزِ رہن سہن کے حوالے سے کسی طور دہلی سے باہر کے نہ لگیں گے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کا کہنا ہے: کہ دلی کی مکمل تہذیب ہمیں اس میں نظر آتی ہے، دلی کے میلے ٹھیلے، اس کے سیر تماشے، ضیافتیں، اسکی تقریبات، اس کے رسومات اور آداب و مراسم وغیرہ جو اس زمانے کی دلی میں ہو سکتا ہے۔"(۲۵)

ڈاکٹر سید عبد اللہ آگے چل کر باغ و بہار کی نثر کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہوئے اس میں الفاظ و محاورات کے استعمال پر بحث کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ باغ و بہار کی تحریر زبان کی ارتقایافتہ شکل کی دلالت کرتی ہے کیونکہ کسی بھی زبان کو دیکھا جائے تو ناپختگی کی حالت میں اس کے پاس نہ صرف ذخیرہ الفاظ کی کمی ہوتی ہے بلکہ اس کے پاس اصطلاحات، محاورات، ضرب الامثال، کہاوتوں اور معروف ادبی اصطلاحات کا خزانہ بھی نہیں ہوتا جو باغ و بہار میں ملتا ہے۔ زبان کا ایسی صحت کے ساتھ استعمال ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اردو زبان میں وہ تمام مندرجہ بالا خواص شامل ہو چکے تھے۔ جن سے رواں اردو نثر تشکیل پا سکے۔

باغ و بہار کی تالیف کے وقت میر امن دہلی سے بہت دور کلکتہ میں مقیم تھے اور فسانہ ء عجائب کی تصنیف کے زمانہ میں سرورؔ کانپور میں تھے دونوں اپنے وطن کی تہذیب و تمدن روایات اور زبان و بیان کے شیدائی تھے۔ سید عبداللہ نثر کی اس خوبی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "نثر جب درجہ بلوغ تک پہنچ جاتی ہے تو اُس میں محاورے کے صحیح اور باسلیقہ استعمال کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے۔ محاورے کا با سلیقہ استعمال محاورات کی بھر ماراور اسرافِ الفاظ کا نام نہیں۔ یہ تو لفظی کفایت کاری کا ایک خوش نما عمل ہے۔ یعنی تھوڑے لفظوں میں اجتماعی یا انفرادی زندگی کا کوئی مرقع اگر پیش کرنا ہو تو اس کیلئے اچھے اور بر محل محاورے سے بہتر کوئی وسیلہ نہیں۔ میر امن کی نثر میں زندگی اور خود شناسی کی شان ہی ان کی محاورہ بندی نے پیدا کی ہے "(۲۶)

ان زریں خیالات کا ثبوت ہم ان نسائی محاورات میں دیکھتے ہیں جو باغ و بہار کی نثر کا نمونہ ہیں۔ جیسے:۔ باغ باغ ہونا، چمڑے کی جوتیاں پہنانا، انگلیاں دانتوں میں دابنا، مینڈ کی کو زکام ہونا وغیرہ کے ساتھ کے ساتھ ساتھ ہم باغ و بہار کی اگر سلیس اور رنگین عبارت پر غور کریں تو بے شمار نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ جیسے "کمال شوق ہوا کہ ایک دم اس عالم میں وہاں کی سیر کیا چاہیئے "، "کم بختی جو آوے اونٹ چڑھے کتا کاٹے" جیسے کتنے ہی رواں جملے نسائی زبان کی عکاسی کرتے ملتے ہیں۔

باغ و بہار کے نسائی زبان و محاورہ کے تنقیدی تجزیے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ باغ و بہار ہی فسانہ عجائب کی تخلیق کا باعث بنا۔ کیونکہ میر امن نے خود کو فخریہ طور پر دلی کا روڑہ کہا تھا۔ جو بات سرورؔ سے ہضم نہیں ہو پائی اور جواباً اُنھوں نے فسانہ عجائب لکھنے کی ٹھانی۔ میر امن دہلوی کی یہ داستان نثری ادب کی ایک تحریک بھی قرار دی جاسکتی ہے کیونکہ اس کے بعد تین اور داستانیں اس کی تقلید اور ردِ عمل کے طور پر سامنے آئیں۔ باغ و بہار میں میر امن نے اپنی زباندانی کا مظاہرہ کیا اور خود کو فخریہ طور پر "دہلی کا روڑہ" کہا۔ اس پر رجب علی بیگ سرورؔ نے جوشِ زباندانی میں "فسانہ ء عجائب" جیسی داستان اردو نثر کے باب میں رقم کر دی۔

بقول ڈاکٹر سہیل بخاری:

> " یہ بات سرورؔ کو چاٹ گئی اور اُنھوں نے اس کے جواب میں فسانہ عجائب رکھ دیا۔ جواب الجواب میں سخن دہلوی نے "سروش سخن "لکھی۔ جس کا جواب لکھنؤ والوں کی طرف سے "طلسم حیرت "کی شکل میں دیا گیا۔ اس طرح "باغ و بہار "کی

بدولت تین اور داستانیں وجود میں آئیں۔جو اپنی اپنی جگہ منفرد خصوصیات رکھتی ہیں۔ان چاروں داستانوں میں انشاپردازی پر زور ہے۔اور چاروں میں معاشرے کے مرقعے بھی ملتے ہیں۔یہ گویا "باغ و بہار" کے براہ راست اثر کا ہی نتیجہ تھا"(۲۷)

دوسری داستان سرورؔ کی "فسانہ عجائب" ہے۔جو ۱۸۲۴ء میں تحریر ہوئی۔جو کہ اول تا آخر پڑھنا ہی انتہائی دِل گردے کا کام ہے۔نیند لانے کا اچھا نسخہ بھی ہے۔اور اپنے اور جمائیوں کی صورت میں نحوست طاری کرنے کا عذاب بھی۔لیکن خیر،وجہ شائد یہ ہے کہ اس میں تصنع اور بناوٹ ہے۔اور آمد کی بجائے آورد کی زیادتی ہے۔اس کے باوجود آج تک پائے کی کتاب مانی جاتی ہے۔اور سرورؔ کی کئی کتابیں ہونے کے باوجود شہرت دوام اسی کتاب نے اُنھیں بخشا۔اور اسکی ظاہری خامیاں ہی اس کی خوبیاں ہوئیں۔حالانکہ نہ تو کوئی خاص موضوع ہے نہ حقائق۔حقائق تو چلیں داستانوں میں کم ہی ہوتے ہیں اور عمدہ داستان مافوق الفطرت عناصر پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔

اس قصے میں وہی طلسم،وہی جادوگروں کی لڑائیاں،دیویوں دیوتاؤں کی دخل اندازی،وہی تعویذ دھاگے وہی اوہام وعقائد اور لکھنوی تہذیب کا بھرپور اظہار نظر آتا ہے۔فسانہ عجائب کی سب سے بڑی خوبی اسکی زبان ہے۔اسکی عبارت انتہائی مقفیٰ و مسجع ہے۔کیونکہ یہی اُس زمانے کا طرزِ عام تھا۔اور لکھنوی معاشرے کی خصوصیت بھی تھی۔جنھیں اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔اس لئے یہ زبان اُن کے خمیر میں شامل تھی۔اس لئے اول تا آخر تعارف تا خاتمہ اس کے ہر جملے میں قافیہ پیمائی نظر آتی ہے۔سرورؔ نے اس قصہ کے اندر حسب موقع اور حسب ضرورت انتہائی خوبصورتی سے منظر کشی کی ہے۔جس میں مختلف فنون کی اصطلاحیں،مختلف سازوسامان کی تفصیل،جس میں خواتین کے زیورات سے لیکر شہزادہ،شہزادی کی شادی میں شامل ہونے والی رسموں کے نام،مختلف کھانوں کے نام تک شامل تھے۔مختلف طبقات کے لوگوں کی بولی جانے والی زبان کا بھی خاص طور پر خیال رکھا گیا۔اور طبقات کی گفتگو میں اُنھی کے موزوں الفاظ کا چناؤ رہا ہے۔

اس کے علاوہ عربی اور فارسی کے الفاظ کا بھی بکثرت استعمال ہوا ہے جو اُس دور کے لوگوں کی اس زبان کی مہارت کو ظاہر کرتے ہیں۔جملوں میں قافیہ پیمائی،عبارت کی آرائش و تزئین اور شوکت الفاظ اور ان کی نمائش ایک اہم خوبی ہے۔البتہ محاورے اور ضرب الامثال وغیرہ پورے قصے میں گنے چنے ہی نظر آتے ہیں۔جیسا کہ،ٹکے کو ڈھیر لگانا،جوبن کی جھلک دکھانا،مزہ انگور کا نگتروں میں،عبیر ہے نہ گلال ہے کتھے چونے سے ادھی میں کلھڑا لال ہے،جون پور کا قاضی،شام اودھ صبح بنارس،راج ہٹ،،شیشے میں اُتارنا،آفت کا

پر کالا، حلوہ خوردن راروے باید، نیکی برباد گناہ لازم،، یک نہ شد دو شد، چونچ سنبھالو، دودھ کا جلا، چھاچھ کا پھونک کر پینا،، بالک ہٹ، سوکھے میں پھسل کر گرنا وغیرہ۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ سرورؔ نے روز مرہ اور محاورہ پر توجہ دینے کی بجائے قافیہ پیمائی اور آرائش عبارت پر رکھی ہے۔

ڈاکٹر آغا سہیل اپنی کتاب "داستان لکھنو کے داستانی ادب کا ارتقا" میں "گلشن نو بہار" اور "فسانہ عجائب" کا موازنہ کرتے ہوئے دونوں میں موجود واقعاتی و موضوعاتی مماثلتوں کا ذکر کرتے ہیں اور وہ اپنی رائے کی توثیق و تصدیق ڈاکٹر گیان چند جین کی رائے کا حوالہ بھی دیتے ہیں جنھوں نے "فسانہ عجائب" اور "گلشن نو بہار" پر بات کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرورؔ کے انداز نگارش پر زیادہ بحث نہیں کی۔ ڈاکٹر آغا سہیل کا کہنا ہے کہ سرورؔ اپنی داستان میں زبان کو ایک خاص ارتقا یافتہ سطح تک لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مہجور نے داستان کو واقعاتی و موضوعاتی ارتقا تو بخشا مگر لفظیات و اسلوب کے حوالے سے وہ رجب علی بیگ سرورؔ کا مقابلہ نہیں کر سکتے ان کے الفاظ ہیں:۔

> "صنائع لفظی و معنوی، خلع جگت وغیرہ میں مہجور کی عبارتوں میں وہ چستی، روانی، بے باکی اور شگفتگی نہیں ہے جو سرورؔ کے یہاں پائی جاتی ہے یعنی سرورؔ نے اس لحاظ سے زبان کو آگے بڑھایا ہے اور ترقی کے کئی زینے طے کر لئے ہیں۔ سلیس اور محاورہ دیکھئے تو سرورؔ کو مہجور پر فوقیت حاصل ہے۔"(۲۸)

آگے چل کر ڈاکٹر سہیل اس بات کا بھی اقرار کرتے ہیں کہ لکھنوی معاشرت اس کے میلے ٹھیلے، اس کے بازار اور ثقافت کو سرورؔ سے بہتر انداز میں کوئی اور نہیں بیان کر سکا۔ لیکن ایک بات بہت اہم ہے جس کی طرف ڈاکٹر سہیل آغا نے توجہ دلائی ہے کہ لکھنوی معاشرت کی مرقع سازی میں سرورؔ حد سے زیادہ تجاوز کرتے ہوئے یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ داستان میں ہر جگہ، ہر مقام، ہر دیس میں ہر ملک میں صرف اور صرف لکھنوی معاشرت ہی دکھانے کی غلطی کرتے رہے ہیں، اور خواتین کے سنگھار سے لے کر پکوانوں تک اور گھریلو سجاوٹ سے لے کر اور رکھ رکھاؤ سے محافل کے آداب تک معمولات حیات سے لے کر خاص خاص رسومات تک اور عام استعمال کے برتنوں سے لے کر خصوصی آرائیشوں حتا کہ موسیقی اور رقص و سرورؔ تک ہر چیز برِ صغیر پاک و ہندی بلکہ خالصتا لکھنوی دکھائی گئی ہے آغا سہیل لکھتے ہیں:

> "انجمن آرا سے جان عالم کی شادی میں تمام ریتیں، رسمیں ہند ایرانی ہیں اور غور سے دیکھئے تو لکھنوی ہیں۔ سانچھا، ساچق، شادی جہیز، جاہ و چشم، کروفر کی سواری، جلوس،

آر سی مصحف، کپڑے، وہی سالیوں کی چھیڑ چھاڑ، وہی بلبل کے گیت، جملہ استعمال میں آنے والی اشیاء، زیورات، ظروف، سازوسامان، عہدے داروں، منصب داروں، کارندوں، متعدیوں کے حفظ مراتب کے ساتھ نام اور کام اور ماہی مراتب نوبت ،نقارہ، سازوآواز کا جادو، موسیقی، رقص، سجاوٹ،روشنی، پاندان، ناگردان، اگالدان، فرش پوش،میز پوش وغیرہ"(۲۹)

داستان میں خواتین کے لباس اور بناؤ سنگھار کے سامان سے نسائی ثقافت کا بھی بہت تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اطلس و کمخواب اور زربفت کے لہنگوں، ململ کے دھنک رنگ دوپٹوں، گوکھروں کی کرتیوں، کنگن، کڑوں، چوڑیوں کا ذکر کیا ہے۔

سرورؔ نے فسانہ عجائب میں خصوصی طور پر اپنے کرداروں کی بہترین کردار نگاری کی ہے اور اس کے لئے مکالموں کی مہارت سے بھی کام لیا ہے جو اس سے پیشتر داستانوی ادب، میں اس قدر رواج پذیر نہ تھا۔ اُنھوں نے مکالموں کی زبان اور محاورات کے ذریعے کرداروں کی شخصیات اور کیفیات و جذبات کا اظہار کروایا اور یوں لطیف زبان کو اہلِ زبان کے لئے دوچند کر دیا۔ لکھنوی زبان کا پر تکلفانہ انداز، القاب و آداب، بناوٹ ادب، شائستگی، برجستگی اور ذومعنویت کو اردو ادب میں متعارف کروانے کی روایت ڈالی اور مردانہ و زنانہ کرداروں کو وہی الفاظ وہی زبان و محاورات عطا کئے جو لکھنوی زبان کا معمول رہے تھے۔

بیگمات کی زبان، ملازماؤں، ماماؤں کی زبان، دکانداروں، کہاروں کی گلی محلے کی زبان، بھٹیارن کی زبان، جان عالم اور انجمن آراء کے مکالمے سب اپنی اپنی جگہ اپنی حیثیت و مقام کے علاوہ اپنی کیفیات سے آگاہی فراہم کرتے ہیں جیسے کہ "غریب" کو "گریب" کہنا اور "غرض" کو "گرج" بولنا۔

"ہم" کو "ام" اور "ضرورت" کو "جرورت" کہنا۔ ایک بھٹیارن کے کردار کی سچی عکس بندی کرتا ہے۔یوں پھر لکھنوی بیگمات کا لکھنو کی ٹکسالی زبان میں محاورات اور روزمرے سے سجی گفتگو کا مشاہدہ ہوتا ہے جیسے ایک جگہ نسائی زبان کا نمونہ دیکھئے۔

"اگر میری بات کا طوطا جواب، صاف نہ دے گا تو اس نگوڑے کی گردن مروڑ اپنے تلوؤں سے اس کی آنکھیں ملوں گی۔ تب دانہ پانی کھاؤں، پیوں گی "رام بابو سکسینہ سرورؔ اور سرشارؔ کے تقابل کی بابت لکھتے ہیں:"مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کے یہاں تکلف اور آورد بہت ہے اور سرشارؔ کی بات کی واضح، بے تکلف اور نیچرل ہوتی ہے۔ سرورؔ چیزوں کا بیان کرتے ہیں اور سرشارؔ آدمیوں کا"(۳۰)

ان کی تائید میں ڈاکٹر انور سدید "اردو ادب کی مختصر تاریخ" میں لکھتے ہیں کہ فسانہء عجائب میں ہمیں اس سے قبل لکھی گئی تمام داستانوں مثلاً "سحر البیاں" "گل بکاؤلی"، "طوطا کہانی" اور "داستانِ امیر حمزہ" کا عکس جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے تہذیب کی مکمل تصویر ابھرتی ہے۔"اس میں نہ صرف لکھنؤ کی خواتین کی خوش فعلیاں جلوہ گر ہیں بلکہ رواجات رسوم اور عقائد و توہمات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔"(۳۱)

فسانہ عجائب میں تہذیبی رچاؤ کی بابت اگر ہم بغور جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ صرف زبان اور محاورات تک محدود نہیں نہ ہی کردار نگاری پر مشتمل ہے اس میں لباس سے لے کر کھانوں تک، عقائد سے لے کر رسومات تک، گھر سے لے کر بازار تک، شادی بیاہ، موت فوت، دین و دنیا کے معاملات تک سب جگہ تہذیبی رنگ نمایاں ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اُردو کی جلد سوم میں لکھتے ہیں کہ یہاں زبان اور تہذیب لکھنو کا وہ رچاؤ ہے کہ قاری محو ہو جاتا ہے اور سب تصویریں زندہ، متحرک ہو کر یادداشتوں میں محفوظ ہو جاتی ہیں وہ فسانہ عجائب کے اس ٹکڑے کا حوالہ رقم کرتے ہیں جہاں ایک بازار کا احوال رقم ہے:

> " ہر کنجڑن کی وہ تیکھی چتون، آدمی صورت دیکھتا رہے رعب حسن سے بات نہ کر سکے۔ پری زاد، سرو قامت رشکِ شمشاد، دکانوں میں انواع و اقسام کے میوے قرینے سے چنے، روزمرے محاورے اوران کے دیکھے نہ سنے کوئی پکار اٹھی، بیٹھے بٹھائے قہقہہ مار اُٹھی کہ ٹکے کو ڈھیر لگا دیا ہے۔ کھانے والو زور مزہ ہے کوئی موزوں طبیعت یہ فقرہ برجستہ سناتی، جوبن کی جھمک دکھاتی، مزہ انگور کا ہے انگتروں میں، کسی طرف سے یہ صدا آتی گنڈیریاں ہیں ہونڈے کی۔ ایک طرف تنبولی سرخ روئی سے یہ رمز و کنایہ کرتے ہوئے بولی ٹھولی میں چبا چبا کر ہر دم یہ دم بھرتے، کیا خوب ڈھولی ہے۔ ابھی کھولی ہے۔ عبیر ہے نہ گلال ہے۔ ادھی میں مکھڑا لال ہے۔ گلیوں میں گجر دم یہ آواز آتی شیر مال ہے گھی اور دودھ کی، مفلس کا دل اچاٹ ہے، ٹکوں کی چاٹ ہے۔ کدھر لینے والے ہیں کھیر کے پیالے ہیں، کیا خوب بھنے بھرُ بُھرے ہیں ،چنے اور مُر مُرے ہیں۔ جیٹھ بیساکھ کی وہ گرمی جس میں چیل انڈہ چھوڑتی، دو پیسے کی قلفی جمی، دو کھائے بدن تھر تھرائے، زیادہ ہو کا کرے، لقوے فالج میں مرے۔"(۳۲)

برصغیر میں توہم پرستی کی روایت صدیوں پرانی ہے۔ اور خصوصاً خواتین اس حوالے سے کافی زیادہ بد اعتقادی کا شکار رہی ہیں۔ خواتین کے ہاں مختلف طرح کے شگون کی نشاندہی تمام تر شعری و نثری اصناف میں ملتی ہے۔ علی عباس حسینی "ناول اور ناول نگار" میں لکھتے ہیں۔

بڑی بیگم جیسی بڑی بوڑھیوں کا معمول تھا فال دیکھنا۔ صبح کو اُٹھ کر پہلا کام رات کے خواب کی تعبیر معلوم کرنا ہوا کرتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر، آنکھ پھڑکنے پر وہ کسی انہونی بات کی خبر دینے لگتی تھیں یا اُنھیں کسی نئے واقعے یا حادثے کی پیشین گوئی سمجھ لیتیں۔ ہتھیلی کھجانے پر پیسے خرچ ہونے کو تعبیر کرتیں اور آنکھ پھڑکنے کو بدشگونی، کسی کام کی ابتدا میں کسی نے چھینک لیا تو کام روک دیا جاتا۔ سرورؔ کے ہاں الفاظ کا بہت وسیع ذخیرہ ہے اور کہیں کہیں اسراف بھی برتنے لگتے ہیں اور ایسے برتیں گے کہ مبالغے کا گماں ہونے لگے، ضرورت سے زیادہ الفاظ کا استعمال کہیں کہیں بہت کھَلتا بھی ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود رضوی میں ان کی زبان دانی اور اسلوب کی بابت لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنی لکھنوی معاشرت کو فسانہ عجائب میں اس طرز کے زبان و بیان کے ساتھ برتا ہے کہ وہ انھی کی پہچان اور خاصہ بن کر رہ گیا اور ساتھ ساتھ ہمیشہ کے لیے ایک تہذیبی دستاویز کے طور پر بھی محفوظ ہو گیا انھوں نے مقفیٰ زبان کے ساتھ سادہ بامحاورہ زبان کو بھی مہارت سے برتا ہے ان کے الفاظ ہیں: وہ پیچیدہ اور گراں بار زبان بھی ہے جسے سمجھنے کے لیے خواہ قاری کو فرنگی محل کی گلیوں کی کی خاک چھاننی پڑے۔ لیکن دماغ پر اچھا خاصا زور ڈالنا پڑتا ہے۔"(۳۳)

سرورؔ ہر ایڈیشن میں ترمیم و اضافے اور نظر ثانی کرتے رہے کم از کم اٹھارہ مرتبہ فسانہ عجائب کو درست کیا۔ ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبہ اردو گورکھ پور یونیورسٹی نے بھی لکھا ہے کہ "فسانہء عجائب" کی زبان شروع میں سادہ اور عام فہم تھی۔ تقریباً انیس سال اس قلمی نسخے کے بعد طباعت عمل میں آئی اور تب مصنف نے اس میں حیرت انگیز تبدیلیاں کیں۔"(۳۴)

شہزادی کی رضا مندی کے بعد بادشاہ جب شادی کا دن مقرر کرتا ہے تو اُس کے لیے بھی رمال، نجومی، پنڈت، علم ہئیت، علم ہندسہ اور علم نجوم کے ماہروں کو بلواتا ہے۔ یہاں ہمیں صدیوں پرانی برِ صغیر پاک و ہندی ثقافت اور عقائد کی جھلک ملتی ہے جہاں رشتہ دیکھتے وقت جنم کنڈلیاں ملائی جاتی ہیں اور ستاروں کی چالیں دیکھ کر شادی کا دن مقرر کیا جاتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ کی کسی عورت، کسی بیٹی کے لیے اس کی زندگی کا فیصلہ خود کرنے کا اختیار کم کم ہی دیا جاتا ہے۔ ایسے فیصلے والدین یا برادری کے بزرگ مل کر کرتے

ہیں۔ اور ان کے فیصلے کو ماننا اولاد کا فرض ہو تا ہے۔ اولاد میں خصوصا بیٹی کو انکار کی اجازت نہیں ہوتی عموما اس سے پوچھا نہیں جاتا بلکہ فیصلہ سنا دیا جاتا ہے۔ رشتہ پوچھنے کو "رقعہ ڈالنا"، بات چلانا"، بات نکالنا"، بر مانگنا" جیسے نسائی محاورات کی صورت میں بھی بولا جاتا ہے۔ڈاکٹر اے۔ایس۔ التیکار نے اپنی معروف کتاب "Position of woman in Hindu civilization" میں برِ صغیر پاک وہندی تہذیب میں عورت کی زندگی اور حیثیت و مقام پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور زندگی کے مختلف شعبہ جات جن میں خاص طور پر ازدواجی معاملات، خانگی جھگڑے، طلاق، بیوگی جیسے مسائل پر برِ صغیر پاک وہندی عورت کی بابت تفصیل سے لکھا ہے۔ اور ان کے مطابق چار سو سال قبل مسیح سے برِ صغیر پاک وہند کے لوگ ستاروں کے حساب کتاب سے کنڈلیاں ملاتے اور رشتے طے کرتے چلے آرہے ہیں۔

> “Marriage and Divorce Grihya Sutras and Dharma Sutras nowhere suggest or recommend that horoscopes of the parties to be married should be consulted before deciding upon their marriage.The reason is quite simple .In their days the science of astrology was quite in its infancy and had yet to evolve or borrow the zodiacal signs.Complicated horoscopes of the modern type did not exist and had not to be consulted down to about 400 A.D.From the dramas of Bhasa it appears that astrologers of the 3rd century A.D.were only concerned about the auspiciousness of the marriage day.”(۳۵)

اسی کتاب کے پہلے باب میں مصنف نے لکھا ہے کہ باپ موجود نہ ہو تو دادا، چچا بھائی یا خاندان کا کوئی بزرگ لڑکی کا رشتہ طے کرے گا مگر بیوہ ماں اگر ہے بھی تو اس کا نمبر اس رائے اور اختیار میں سب سے آخری ہو گا۔ فسانہء عجائب میں بھی شہزادی کا باپ فیصلہ کرتا ہے اور ملکہ سے کہتا ہے کہ شہزادی کو اس فیصلے سے آگاہ کر دے۔ اور شادی یا کسی بھی مبارک تقریب کے انعقاد سے قبل ستاروں کی چال اور ان کے سعد یا نحس ہونے کو اہمیت دینے کی روایت کا پتہ ملتا ہے۔ جو اس چیز کا عکاس ہے کہ کسی بھی مبارک موقع کا انتخاب بہت ہی کوشش بسیار کے بعد کیا جاتا تھا۔ اور اسے توہم پرستی کہا جائے کہ دور اندیشی حسبِ ضرورت و استطاعت رومالوں، پنڈتوں علمِ جفر اور علمِ نجوم کے جاننے والوں سے مشاورت کی جاتی ہے۔

منتیں ماننے کی قدیم روایت کے نسائی حوالے بھی اس داستان میں موجود ہیں۔ برِ صغیر پاک و ہندی تہذیب میں ہمیشہ جادو ٹونے، توہمات، تعویز گنڈوں کا رجحان کافی قدیم ہے۔ جہالت کے باعث اس کی جڑیں کافی گہری ہیں۔ اب یہ منتیں بھی دیکھئے جو ہندی بلکہ لکھنوی مسلمانوں کے یہاں مانی جاتی ہیں۔ جان عالم اپنے لشکر سمیت جادو گرنی کے جادو سے نصف پتھر بن گیا ہے تو عورتیں منتیں مانتی ہیں۔ کوئی کہتی ہے کہ مشکل حل ہوئی تو روزے رکھوں گی، نیاز دلاؤں گی، "کسی نے کہا اگر جیتی چھٹی جناب عباس کی درگاہ جاؤں گی۔ سکینہ کا علم چڑھاؤں گی۔ چہل منبری کرکے نذر حسینؑ سبیل پلاؤں گی۔"(۳۶)

عورتوں کی منتوں میں جن متبرک ہستیوں کا ذکر کیا گیا ہے یہ حقیقت ثابت کرتی ہیں کہ رعیت یا عوام عموماً وہی مسلک اختیار کرتے ہیں جو اُمراء و بادشاہوں کا ہوتا ہے۔ وہاں کے اُمراء چونکہ شیعہ مسلک رکھتے تھے۔ اسی لئے مرثیہ خوانی اور منتوں میں حضرت علیؓ اور آل علی کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ اور عظیم ہستیوں کی منتیں بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ اسی طرح ہر معاشرے میں عورتوں کی ہی بد شگونیاں بھی عروج پر پائی جاتی ہیں۔ نیر مسعود رضوی نے اپنی کتاب "رجب علی بیگ سرورؔ، حیات اور کارنامے" میں ان کے نسائی لب و لہجے کو فسانہ عجائب کے تناظر میں بڑی خصوصیت کے ساتھ موضوع بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے: "سرورؔ کو عورتوں کی بول چال لکھنے پر قدررت حاصل ہے۔ فسانہء عجائب کے مکالموں میں بیگمات کی ٹکسالی زبان کے علاوہ لونڈیوں اور کنیزوں کے مخصوص اندازِ بیاں کی مثالیں بھی موجود ہیں"(۳۷)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نسائی زبان کے چند پہلو مندرجہ بالا دونوں داستانوں یعنی "باغ و بہار" اور "فسانہء عجائب" میں اولین نثری نمونے کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ داستانوں کے کچھ فطری اور کچھ غیر فطری عناصر، کچھ انسانی اور کچھ مافوق الفطری کردار جب مکالمہ کرتے ہیں تو ان کی زبان اس عہد میں بولی جانے والی اردو اور لکھی جانے والی ادبی زبان کے امتزاج کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ نسائی زبان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے تو عشق و محبت کے لطیف جذبات کے اظہار سے لے کر عام گھریلو معاملات پر گفتگو تک، ملکہ اور شہزادیوں کے علاوہ کنیزوں اور ماماؤں کے مکالموں تک، زیورات و ملبوسات کے ناموں سے لے کر دیگر آرائشی سامان تک، فال نکلوانے سے لے کر شگون لینے تک، تعویذ گنڈوں سے لے کر منت ماننے اور نذر نیاز دلوانے تک، چراغ جلانے سے لے کر حضرت عباس کے عَلَم تک، لڑائی جھگڑے کی صورت میں طعنوں تشنوں اور بد دعاوں، کوسنوں تک ہر ہر رنگ اس میں موجود ہے۔

ب) اردو ادبی نثر میں نسائی زبان و محاورات (۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء)

جہاں ۱۸۵۷ء کا ایک پُر آشوب ہنگامہ شروع ہوا۔ وہیں پر اردو ادب میں ایک نیا عہد شروع ہوا۔ اس جنگ کا اثر زندگی کے ہر شعبہ پر ہوا۔ ادب اور سماج کا ہمیشہ سے آپس میں گہرا تعلق رہا ہے۔ اور ادیب ہمیشہ سے معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ حساس ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے دکھ کو محسوس کرنے اور اس کا اظہار کرنے کا ہنر بھی بدرجہ اتُم موجود ہوتا ہے اور نہایت باریک بینی سے اس کا مشاہدہ کر کے اس طرح صفحہ قرطاس پر پھیلاتا ہے کہ ہر کسی کو وہ اپنا ذاتی دکھ محسوس ہوتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی نے پورے برِ صغیر پاک وہند کی سماجی زندگی کا رُخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ جس سے معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی سطح پر اثرات مرتب ہونا یقینی تھا۔ انھیں حالات نے زبان و بیان کے فروغ میں بھی وسعت پیدا کی اور انگریزی زبان وادب نے برِ صغیر پاک وہندی زبان وادب پر اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے۔ اس جنگ آزادی کے بعد ادباء وشعراء نے اپنی تخلیقی کاوشوں کے ذریعے سماج میں ایک نئ روح پھونکی۔ اور اپنے ادب کے ذریعے قومیت، آزادی کے پیغام کو عوام تک پہنچایا۔ اس پیغام سے لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ اُبھرنے لگا۔

ان مشکل حالات میں سر سید احمد خان وہ واحد ہستی تھی جنھوں نے ایک ہی وقت میں بہت سے محاذوں پر لڑنے کا فیصلہ کیا۔ جنھوں نے ایک طرف انگریزوں کے ذہن سے یہ بات نکالنے کی کوشش کی کہ مسلمان ان کے دشمن ہیں ۔ ان مشکل حالات میں سر سید کا ساتھ حالیؔ اور ڈپٹی نذیر احمد نے دیا۔ اُنھوں نے ادب کو تفریحی حیثیت سے بدل کر اجتماعی مقاصد سے روشناس کرایا۔ اور ادب جو کہ اس وقت مافوق الفطرت عناصر کے ساتھ طویل طویل مثنویوں پر مشتمل تھا اور جسکی روح تخیل پر رکھی گئ تھی اس میں تبدیلی آگئی۔ ادب سے مختلف ادباء نے مذہبی، سماجی، تہذیبی، فکری اور معاشرتی اصلاح کا کام کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ عوام کو حقیقت پسندی نے غیر حقیقی داستانوں سے نجات دلائی۔ ایسے میں نذیر احمد دہلوی، مرزا محمد ہادی رُسواؔ، عبد لحلیم شررنے مختلف سماجی و معاشرتی ناول لکھ کر اور بدلتی ہوئی صورت حال پر گہری نظر رکھ کر مثبت کردار ادا کیا۔ ناول ایسی ہی تاریخی اور انقلابی تبدیلیوں کی وجہ سے معرض وجود میں آیا۔ جسکی ابتدا ڈپٹی نذیر احمد کے اصلاحی قصوں سے ہوئی۔ نذیر احمد نے اپنے ایک لیکچر میں اپنی کتابوں کے بارے میں بڑی تفصیل سے بیان کیا:۔

"میں اپنے بچوں کے لئے ایسی کتابیں چاہتا تھا کہ وہ ان کو چاؤ سے پڑھیں ڈھونڈا، تلاش کیا لیکن کہیں پتہ نہ لگا۔ ناچار میں نے ہر ایک کے لئے مناسب حال کتابیں بنانا شروع کیں۔ بڑی لڑکی کے لئے مراۃ العروس، چھوٹی کے لئے منتخب الحکایات اور بشیر کے لئے چند پند۔ یہ نہیں کہ کتابیں سالم لکھ لیں پھر پڑھائی شروع کریں، نہیں بلکہ ہر ایک کتاب کے چار پانچ صفحے لکھ کر ہر ایک کے حوالے کر دیے۔ مگر وہ بچوں کو ایسی بھائیں جس کو پاؤ صفحہ پڑھنے کی طاقت تھی وہ آدھے صفحے کے لئے اور جسکو ایک صفحے کی استعداد تھی وہ ورق کے لئے متعجل ہوا تھا۔ جب دیکھو ایک نا ایک متقاضی کہ میرا سبق کم رہ گیا ہے میں اسی وقت قلم برداشتہ لکھ دیا کرتا۔ یوں کتابوں کا پہلا گھان تیار ہوا۔"(۳۸)

i : مراۃ العروس:ڈپٹی نذیر احمد

یہ کتاب ظاہراً عورتوں کے فائدے کے واسطے تالیف کی گئی ہے اور اس میں اہل اسلام کے ایک شریف خاندان کا ایک فرضی قصہ بیان کیا گیا ہے یہ کل قصہ شرفا کی زبان روزمرہ میں بیان کیا گیا ہے کہ وہی اس ملک کی اصل اردو ہے نہ وہ جس میں نمائش کے لیے بڑے بڑے الفاظ اور مضامین بھر دیے جاتے ہیں۔ ایسے ایسے واقعات و حالات لکھے ہیں جو ہر ایک عورت کو سسرال میں پیش آتے ہیں اور زنان خانہ کے وہ طور طریق بیان کیے ہیں کہ جو اہل یورپ اس کو پڑھے گا اس ملک کی عورتوں کے روزمرہ حالات کی کسی قدر واقفیت اول اس کتاب سے حاصل کرے گا۔ عورتوں کی زبان، ان کی رغبت اور نفرت اور بچوں کا لاڈ پیار ، امور خانہ داری میں عورتوں کا اختیار اور ان کی جہالت اور مکر وفریب یہ سب اس کتاب سے خوب عیاں ہوتے ہیں اور بیان سے کوئی علامت مبالغے کی نہیں پائی جاتی ظاہر ہے کے مصنف نے اصل حقیقت بیان کی ہے اور قصہ کی نصیحت نفس قصہ سے نکلتی ہے۔

نذیر احمد "مراۃ العروس" کی تصنیف کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تب مجھ کو ایسی کتاب کی ضرورت محسوس ہوئی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہوئی ہو اور ان معاملات میں جو عورتوں کی زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورت اپنے توہمات اور جہالت اور کجروی کی وجہ سے ہمیشہ مبتلائے رنج و مصیبت رہا کرتی ہیں ان کے

خیالات کی اصلاح اوران کے عادات کی تہذیب کرے اور کسی دلچسپ پیرایہ میں ہو
جس سے ان کا دل نہ اکتائے طبیعت نہ گھبرائی "(۳۹)

نذیر احمد نے کسی منصوبے کے تحت ناول نگاری شروع نہیں کی تھی بلکہ جیسا کہ وہ خود کہہ رہے ہیں کہ اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کے لئے لکھنا شروع کیا۔ اس طرح اُن کے ناولوں میں تعلیم نسواں پر زیادہ زور دیا گیا۔ "مراۃ العروس" کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ خواتین میں تعلیم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے خواہاں تھے۔اور انکی سیرت کو ہر رشتے میں مثالی بنانا چاہتے تھے۔اور وہ گھر کو چلانے، رشتوں کو نبھانے کے لئے خواتین کی عقل اور دوراندیشی اور سوجھ بوجھ کے قائل تھے۔وہ اگرچہ سر سید کے ساتھیوں میں سے تھے اس لئے وہ خود "مراۃالعروس" کے باب اول میں عورتوں کی تعلیم کے فوائد زندگی کے ہر شعبے میں دلائل کے ساتھ ثابت کرتے ہیں۔" عورتیں اس کو بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔اس کی زبان نہایت ہی سلیس اور بامحاورہ ہے۔ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ مصنف عورتوں کی خاص زبان اس صحیح اور بامحاورہ لکھنے پر کیونکر قادر ہوئے۔"(۴۰)

عورت کی زندگی کے معمولات کی بابت ڈپٹی نزیر احمد نے "مراۃ العروس" کے دیباچہ دوم میں لکھتے ہیں کہ عام دستور کے مطابق عورتوں کی کوئی خاص عزت اور توقیر نہیں کی جاتی۔اور اسے ناقص العقل اور بے وفا جاننے کے متعلق بھی لکھاہے اور تعلیم سلیقہ اور ہنر مندی کی ترغیب دلانے کو یہ بھی لکھاہے پڑھی لکھی عورتوں سے بھی گھروں میں سوائے خانہ داری کے کچھ خاص مشاورت یااصلاح نہیں لی جاتی۔اور زندگی کے اہم فیصلوں میں عورت کی صلاح نہیں لی جاتی بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ پوچھا جاتا ہے:

> "جب عورتوں سے پوچھا جاتا ہے تو یہی کہ کیوں جی! آج کیاترکاری پکے گی!
> لڑکی کے واسطے ٹاٹ بافی جوتی منگواؤ گی یاڈیڑھ حاشیے کی! چھالیہ مانک چندی
> لو گی یا جہادی، زردہ پوربی لینامنظور ہے یاامانت خانی رضائی کو اودی گوٹ لگے
> گی یا سرمئی؟"(۴۱)

اب ہم نسائی زبان کا جائزہ لیں تو سب سے پہلے اہم ترین اور متحرک کردار اکبری ہے جس کی زبان نہ صرف یہ کہ قینچی کی طرح بے لحاظ چلتی ہے بلکہ بناگی لپٹی کے بیباکانہ انداز بھی اس پر ختم ہے۔وہ ایک احمق، جھگڑالو اور کھلنڈری لڑکی ہے اور اسکی زبان اور اس کے انداز میں بھی وہی بد تمیزی اور اکھڑپن ہے۔ جس میں نہ بزرگوں سے بات کرنے کے تمیز اور نہ ہی شوہر کو مخاطب کرنے کے انداز میں شائستگی ہے۔شوہر کے

سمجھانے بجھانے کا بھی کوئی اثر نہیں لیتی اور وہی احمقانہ اور ضدی وہٹ دھرم عورتوں کی زبان میں واویلا کرتی ہے۔ اکبری کے طعنے مہنے اور انداز ولب ولہجہ ہی اُسے جھوٹا، فریبی اور پھوہڑ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں ذرا دیکھیے جب اکبری بیگم برہم ہوتی ہے تو کیسے بولتی ہیں:

"دیکھو خدا کی قسم، میں نے کہہ دیا مجھ سے زبان سنبھال کر بولا کرو، نہیں تو پیٹ پیٹ کر اپنا خون کر ڈالوں گی۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور اپنے ماں باپ کو کوسنا شروع کر دیا۔ الٰہی اس اماں باوا کا برا ہو کس کمبختی میں مجھ کو دھکیل دیا ہے مجھ کو اکیلا پا کر سب نے ستانا شروع کر دیا ہے۔ الٰہی میں مر جاؤں میرا جنازہ نکلے۔"(۴۲)

ناول "مراۃ العروس" میں مردانہ کردار کم بھی ہیں اور کمزور بھی ہیں۔ عورتیں چاہے اکبری ہو یا اصغری سب اپنے اپنے عقل اور ناقص العقلی میں حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس کے بہ نسبت مردوں کے کردار کافی کمزور دکھائے گئے ہیں اور اصغری کے والد سدا بہار کے ملازم دکھائے گئے ہیں البتہ خط کے ذریعے ان کی عقل و دانش اور بیٹی کو سدا گھر بسانے کی نصیحت سے پھر بھی وہ اپنے ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ سلائی کڑھائی میں مہارت ہر برِ صغیر پاک وہندی لڑکی کے سگھڑاپے کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ اکبری کو جب یہ کام کرنا پڑتا ہے تو اس میں بھی پھوہڑ پن نظر آتا ہے جیسے:"کلیاں لگانی شروع کیں جب لگا چکی تو خالہ نے پھر دیکھا تو سب میں جھول۔ اب تو خالہ سے نہ رہا گیا اور اکبری کی ساس سے آنکھ بچا کر ایک سوئی اکبری کے ہاتھ میں چبھو دی اور کلیاں پھر ادھیڑ ادھیڑ کر رکھ کر آپ لگائیں۔"(۴۳)

شبیر بن عادل اردو ناول کے بانی نذیر احمد کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مراۃالعروس میں خواتین کی زبان کو امتیازی حیثیت حاصل ہے خواتین کی گھریلو بول چال کی الفاظ کی بعض اپنی ہی اصطلاحیں ہوتی ہیں ان کی بول چال میں مثالوں محاوروں اور اشاروں کنایوں کو زیادہ استعمال کیا جاتا ہے اور خواتین کے لب ولہجے میں طنز نمایاں ہوتا ہے خواتین کے مکالمے تحریر کرنے کے لیے زبان کے مخصوص اسلوب سے شناسائی کے ساتھ خواتین کی ذہنی کیفیات کی ترجمانی ایسے فطری انداز میں کی ہے کہ مطالعے کے دوران محسوس ہوتا ہے گویا ہم کرداروں کی آوازیں سن رہے ہو اور ان کے لب ولہجے کے اتار چڑھاؤ کو محسوس کر رہے ہو مثال کے طور پر

محمد عاقل کی ماں اپنے بیٹے سے یہ کہنا کہ یہ بھی کیسی ہونی ہے اشرافوں میں کہیں بیبیاں چھوٹتی ہیں؟ تم کو اپنی عمر انہیں کے ساتھ کاٹنی ہمارا کیا ہے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں آج مرے کل دوسرا دن"(۴۴)

اکبری کی ساس، بیٹے کی پریشانی، غصہ دیکھ کر بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اسے عید پر دستور کے مطابق سسرال بھی بھیجتی ہیں اور ساتھ نصیحت بھی کرتی ہیں۔ تاکہ عید کا میٹھا بھی دے آئے اور عید بھی مل آئے۔ تو وہ جہاں دیدہ خاتون بیٹے کو کہتی ہے:

"لڑکے خیر منا، سسرال تو تیری اور میں وہاں کسی اور کو بھیجوں، یہ لو ایک روپیہ اپنی سالی اصغری کے ہاتھ میں عیدی دینا اور یہ ایک اٹھنی اپنی خلیا ساس کے بیٹے کو اور آدھے کھلونے بھی لیتے جاؤ۔ ایک خوان میں سویاں اور دودھ، مٹھائی کی ٹوکری بھی ماما عظمت کے ہاتھ اپنے ساتھ لے جاؤ۔ دیکھو خبردار کچھ بولنا چالنا مت "(۴۵)

نذیر احمد نے انیسویں صدی کے معاشرے کو خدوخال سمیت پیش کیا ہے انھوں نے نچلے طبقے کے مسلمان گھرانوں کی عکاسی کی ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے طرزِ تحریر کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ زنانہ ناولوں میں شریف مستورات کی زبان استعمال کرنا بخوبی جانتے تھے۔ اپنے اسلوب کے باعث ان کی تحریر بغیر ان کا نام پڑھے پہچانی جا سکتی تھی۔ اگرچہ مقفیٰ و مسجع عبارت نہیں لکھتے تھے مگر تشبیہات و استعارات کے استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ زنانہ زبان کی باریکیوں کو بخوبی سمجھتے تھے۔ کہیں کہیں اپنی عربی و فارسی دانی کی صلاحیت کو بھی مہارت سے برت لیتے تھے مگر وہ ان کی تحریر کو بوجھل بھی بنا دیتا تھا۔

حامد حسن قادری "داستان تاریخ اردو" امیں ڈپٹی نذیر احمد کے اسلوب کو زیرِ بحث لاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ اپنی تحریر کی انفرادیت کی وجہ سے پہچانے جاتے تھے۔ ان کا طرزِ بیان سادہ ہونے کے ساتھ صاف رواں اور زوردار ہوا کرتا تھا ان کو دہلی کی زبان سے رغبت اور محبت تھی بچپن سے زمانہ طالب علمی سے یہاں آ آکر آباد ہوئے تھے البتہ تحریر میں کہیں کہیں اجتماع اجداد بہت عجیب لگتا تھا وہ اپنی عربی فارسی کی مہارت کو جب اچانک افسانوی تحریر میں بے تحاشا شامل کرنے لگتے تو تحریر کا حسن مجروع ہو جاتا تھا۔ حامد حسن قادری کا کہنا ہے: "سب سے پہلے اپنی لڑکیوں کے لیے زنانہ فسانے لکھے اور ان میں ہو بہو زنانہ زبان لکھی۔ یہ زنانہ لٹریچر عرصہ تک تیار کرتے رہے، ہندی کی چندی اور بال کی کھال نکالنے کا طبعاً شوق تھا۔"(۴۶)

ڈپٹی نذیر احمد نہ صرف خواتین کی زندگی کے معمولات پر گہری نگاہ رکھتے ہیں بلکہ ہر پیشے سے وابستہ مردوں کی سخت محنت اور مشکلات کا موازنہ بھی کرتے ہوئے خواتین کو احساس دلاتے ہیں کہ تماری گھریلو زندگی مردوں کے مقابلے میں کس قدر سہل ہے۔ سوائے خانہ داری کے اُمور کے دوسرا کوئی کام یا ذمہ داری نہیں ہے۔ دیباچہ دوم میں انھوں نے مختلف پیشوں کی طویل فہرست گنوائی ہے اور پھر ناول میں ان میں سے کئی پیشوں سے وابستہ افراد کی مکمل کردار نگاری اور اُن کے ذخیرہ الفاظ کی مثالیں بھی خوب صورت مکالموں میں بیانیے میں رقم ہیں۔ لکھتے ہیں:

"دیکھ مرد کیسی کیسی سخت محنت کرتے ہیں، کوئی بھاری بوجھ سر پر اٹھاتا ہے کوئی لکڑی ڈھوتا ہے۔ سنار، لوہار، کیسرا، کندلہ گر، زرکوب، دبکیا، تارکش، ملمع سازی، جڑیا، سلمہ ستارے والا، بٹیا، بدر ساز، قلعی گر، سادہ کار، صیقل گر، آئینہ ساز، زردوز، معمار، نعل بند، نگینہ ساز، کامدانی والا، سان گر، نیاریا، ڈھلیا، بڑھی، خرادی، ناریل والا، کنگھی ساز، ہنس پھور، درزی، علاقہ بند، نیچہ بند، موچی، مہر کن، سنگ تراش، حکاک، معمار، دب گر، کمہار، حلوائی، تیلی، تنبولی، رنگ ساز، گندھی وغیرہ جتنے پیشے والے ہیں سب کے کاموں کے برابر درجے کی تکلیف ہے اور یہ تمام تکلیف روپیہ کمانے کے واسطے مرد سہتے اور اُٹھاتے ہیں۔"(۴۷)

یہ ناتو کوئی مافوق الفطرت کرداروں پر مشتمل کوئی قصہ ہے اور نا عشق و محبت کی داستان۔ بلکہ ایک گھر کی عام سے کہانی ہے اسی لئے اس کی زبان بھی بہت عام اور روز مرہ کی ہے۔ جس میں ہر کردار اپنی قابلیت، اخلاقی حدود اور تمیز کے مطابق بولتا ہے۔ اکبری چونکہ ان پڑھ، پھوہڑ اور بے عقل ہے اس لئے جہاں رشتوں کو نبھانے کا ہنر نہیں رکھتی وہیں طرز تخاطب بھی انتہائی عامیانہ ہے۔ اس قصے کے کرداروں نے جابجا محاوروں سے بھی خوب کام لیا ہے اس میں صرف خواتین ہی نہیں بلکہ مرد بھی ہیں جیسے:

"آتے ہی ساس نے بہو کو گلے لگایا اور اپنے بیٹے کو ناحق بہت کچھ برا بھلا کہا۔ الٹی دلجوئی کا سہارا ("اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ")(۴۸)

"مزاج دار نے ناک منہ چڑھا کر کہا میں تو ایسے سویرے نہیں نہاتی سردی کا وقت ہے۔ تم اپنی عید گاہ جاؤ۔ میں نے کیا پلہ پکڑ رکھا ہے"(۴۹)

"کپڑے بدلنے سے جو خوشی محمد عاقل کو ہوئی سب خاک میں مل گئی۔"(۵۰)

"ان بی بی نے دل میں میری بات کو تسلیم تو کیا مگر کہنے لگیں شرم آتی ہے، تب میں نے ان کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔"(۵۱)

"مزاجدار نے ناک بھوں چڑھا کر کہا میں تو ایسے سویرے نہیں نہاتی،"(۵۲)

"ادھر محمد عاقل کی ماں اکبری کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اس قدر ڈر گئی کہ مثل کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔"(۵۳)

"یہ سنتے ہی محمد عاقل الٹے پاؤں پھرا۔"(۵۴)

"محمد عاقل نے کہا اماں میں سچ کہتا ہوں اصغری ہزار لڑکیوں میں ایک ہے چراغ لے کر بھی ڈھونڈو گی تو اصغری جیسی لڑکی نہ پاؤ گی۔"(۵۵)

"اس کو خط گیا۔ خط پہنچتے ہی خاں صاحب کی باچھیں ہی کھل گئیں۔"(۵۶)

"تم بھی بوا کوئی تماشے کی عورت ہو، وہی کہاوت ہے گدھے کو نون دیا اس نے کہا میری آنکھیں دکھتی ہیں۔"(۵۷)

"اپنے دل میں کہنے لگی ضرور دال میں کالا ہے۔"(۵۸)

"گھر نیلام کرا کے نکلوں گی، اینٹ سے اینٹ بجادوں گی۔"(۵۹)

"دونوں طرف سے پاس اور لحاظ کیا جاتا ہے اور تمام عمر جوتیوں میں دال بٹتی رہتی ہے۔"(۶۰)

"ہاتھ کو ہاتھ پہچانتا ہے۔(۶۱)

"الگ کرنا کیسا یہ تو بڑے گل کھلائیں گی۔(۶۲)

"عظمت بولی۔ بی بی ! انھوں نے تو کہا تھا کہ مجھ کم بخت ستری بہتری کو بات یاد نہیں رہتی۔"(۶۳)

"لاہور سے خط آنا موقوف ہے خرچ کا سن کر تو میرا لہو خشک کئے ڈالتا ہے۔"(۶۴)

"کیوں رے نمک حرام عظمت، ایسا ہی دنیا بھر کا قرض تو نے اس گھر پر کر رکھا ہے اور یوں تو نے گھر کو خاک میں ملایا ہے۔"(۶۵)

"میں نہ کہتی تھی کہ اماں ایسی لوٹ نہ مچاؤ سو دن چور کے تو ایک دن کوتوال کا۔"(۶۶)

"مجھ کو کیا شبہ ہوا کہ اس کی شامت تھی کہ اس نے نالش کا ذکر چھیڑ کر سوتی ہوئی بھڑوں کو جگایا۔"(۶۷)

"استانی جی، یہ لڑکی بڑی نکمی ہے جس کام کو کہتی ہوں ٹکا سا جواب دیتی ہے۔"(۶۸)

"جب فضیلت یہاں آئی تو کالی لکیر تک اس کو کھینچنی نہیں آتی تھی۔"(۶۹)

"استانی جی بھی لڑکیوں میں بیٹھی ہوئی کہانیاں سن رہی ہیں تب ہی جی جل کر خاک ہو گیا۔"(۷۰)

"ایسی شرمندہ ہوئی کہ گھڑوں پانی پڑ گیا۔"(۷۱)

"جب ان کا نیا نیا بیاہ ہوا تھا، بلا مبالغہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چودھویں رات کا چاند۔"(۷۲)

"ان کو سمندر سے ڈر نہیں لگتا، میرے تو سمندر کا نام سنتے ہیں رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"(۷۳)

"نہیں معلوم کس قسم کی مائیں ہیں کیونکر ان کے دل کو صبر آتا ہے پھر باہر کی پھرنے والیاں اور پتھر کے کلیجے۔"(۷۴)

"اور پھر ذرا دل میں سوچو، ایسے وقت میں اپنے مربی اپنے محسن سے آنکھیں چرانا بڑی بے مروتی کی بات ہے۔"(۷۵)

"کھال کی جوتیاں تم کو بنوا دیتی تب بھی تمھارا حق شائد ادا نہ ہوتا۔"(۷۶)

"حسن آرا۔ استانی جی بھلا چاند پر بھی کوئی خاک ڈال سکتا ہے۔"(۷۷)

"جمال آرا۔ اے استانی جی محمودہ بیگم کو آدمی کا بچہ کہتی ہو۔ خدا کی قسم حور کا بچہ! بڑے گھروں میں اونچی دکان پھیکا پکوان۔"(۷۸)

"خدا کی قسم بعض لونڈیاں ہم سے اچھی ہیں اور محمودہ تو چندے آفتاب اور چندے مہتاب۔"(۷۹)

"اصغری بولی پھر بوا سوائے غریبی کے ہم میں کیا برائی ہے۔ اگرچہ چھوٹا منہ بڑی بات۔"(۸۰)

"اس وجہ سے ان کی دال کہیں نہیں گلنے پاتی۔"(۸۱)

"ہمارا کیا ہے قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں آج مرے کل دوسرا دن"(۸۲)

"روٹی پکاتی ہے تو الگ ہی صورت کی نہ گول نہ چوکھونٹی۔ ایک کان ادھر نکلا ہوا ہے اور چار کان ادھر۔ کنارے موٹے بیچ میں ٹکیا، کہیں جلی، کہیں کچی، دھوئیں میں کالی، اور دال جو پکائی تو پانی الگ اور دال الگ۔ غرض مزاج دار ایسا لذیذ اور لطیف کھانا پکاتی تھی کہ کس کو دیکھ کر بھوک بھاگ جائے۔ سالن پکاتی تو بدرنگ، بدمزا نمک ڈالا تو زہر اور کبھی پھیکا۔"(۸۳)

درج بالا نمونوں سے ہم بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نذیر احمد نسائی زبان کے کس قدر نبض شناس تھے ایک ایک لفظ ایک ایک جملہ عین نسوانی نفسیات اور سماجی تقاضوں سے میل کھاتا ہے، مکالمے کے بادشاہ تھے نذیر احمد، ان کے ہاں نسائی زبان کسی قسم کے تصنع و بناوٹ سے پاک تھی سوائے چند ان جگہ کے جہاں وہ بے جا پند و نصیحت پر اتر آتے ہیں۔ اور طویل پیرا گراف میں مقصدیت بھری تقریر لکھنے سے خود کو باز نہیں رکھ پاتے مگر ایسی صورت حال ان کے دوسرے ناولوں میں زیادہ نظر آتی ہے "مراۃ العروس" میں نہیں ہے۔ علی عباس حسینی لکھتے ہیں کہ مولانا بے شک عورت کے مکالمے کے استاد ہیں، محاورے کے بادشاہ ہیں "مگر جس جگہ پہ خود اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں یا مردوں کی گفتگو لکھی ہے وہاں روانی کا دریا عربی کے ثقیل الفاظ کی چٹانوں سے بار بار ٹکرایا ہے۔ زور وہاں بھی بلا کا ہے بہاؤ میں کمی نہیں"(۸۴)

کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سیدھی اور سادہ بات میں لہجہ صاف اور کھرا اور بات مختصر ہوتی ہے، جبکہ جھوٹے اور فریبی اور دغاباز لوگ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے ہی اپنے دھوکے کا جال بچھاتے ہیں۔ حجن بی جیسی کٹنی کی زبان سے چکنے چپڑے خوشامدی الفاظ ناول میں ایک الگ رنگ بھرتے ہیں جیسے:

مزاج دار نے کہا "پچاس روپے تو میرے پاس نہیں ہیں حجن نے کہا ہو بیٹی پہنچیاں بیچ کر لے لو نہیں جانو تم آج یہ موتی بک جائیں گے۔ حجن نے ایسے ڈھب سے کہا کہ مزاج دار فوراً زیور کا صندوقچہ اٹھا لائی۔ حجن کو پہنچیاں نکال حوالے کر دیں۔ حجن نے مزاج دار کا زیور دیکھ کر کہا اے ہے کس بے احتیاطی سے زیور مولی گاجر کی طرح ڈال رکھا ہے، بیٹی دھگدگی میں ڈور ڈلواؤ۔ بالی، پتے، گلوبند، بازوبند میلے چیکٹ ہوئے ہیں۔ میل سونے کو کھا جاتا ہے ان کو اجلواؤ۔(۸۵)

اصغری کی گھر کی ملازمہ ماما بھی ایک خاص نسائی کردار ہے جس کی چالاکیاں اور عیاریاں گھر والوں سے چھپی ہیں اور ساتھ ہی دکانداروں کو بھی جل دے جاتیں ہیں۔اس کی زبان سے حیلے بہانے اور لالچ و مکاری بھرے الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ اس کی زبان سے بھی کہاوتیں اور محاورے رواں ہیں جب اسے اصغری نے کہا"،ماما جلدی جاؤ اور ٹکے کا اچھا تازہ میٹھا دہی لادو تو وہ بولی، اوئی بیوی سیر بھر کا گوشت کیا یوں ٹکے کا دہی، اونٹ کے منہ میں زیرہ کیا ہو گا۔ اس ناول کے مطالعہ سے ہمیں یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ "مراۃ العروس" کی سب سے اہم صفت اس میں وہ خاص نسائی زبان و لہجہ ہے۔ جب نسائی کردار اپنی اپنی عمر، خاص مزاج و فطرت کے مطابق گفتگو کرتے ہیں تو زبان کا چٹخارہ دوبالا ہو جاتا ہے۔

ii . ایامیٰ۔ڈپٹی نذیر احمد

"ایامیٰ" عربی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے بے مرد کی عورت، رانڈ، بیوہ وغیرہ۔ ہمارے اسلامی معاشرے میں بیوہ سے نکاح ایک نیک فعل سمجھا جاتا ہے اور سنت رسولؐ سے بھی ثابت ہے۔ عرب معاشرے میں بیوہ عورت کو جلد از جلد کسی دوسرے مرد کے نکاح میں دینے کا رواج عام تھا اور اسے قطعا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا مگر برِ صغیر پاک و ہند کی تاریخ میں ہندو مسلم قوموں نے جس طرح آپس میں ثقافتی اختلاط کر لیا تھا اس کے بہت دور رس اثرات مرتب ہو چکے تھے۔ دونوں قوموں کے متصادم و متقابل نظریات کے باوجود دونوں پر ہی ایک دوسرے کی تہذیب بلکہ اکثر سماجی و مذہبی رسوم کے اثرات جزو لاینفک ہو گئے تھے اور یہ اثرات صرف مثبت ہی نہیں تھے منفی بھی تھے۔

برصغیر میں ہندوانہ رسوم و رواج نے مسلمانوں کو اسلام کی اصل روح کو اپنانے نہ دیا اور جس ہندوانہ کلچر میں ستی ہو جانا قابل توقیر سمجھا جاتا وہاں بیوہ عورت کے ساتھ دوبارہ بیاہ رچانا کہاں باعث عزت ہوتا۔ مقامی حالات اور سماجی رویوں نے خود بخود ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ کسی مسلمان بیوہ عورت پر زندگی کے تمام دروازے اور خوشیوں کے تمام رنگ حرام کر دیئے گئے۔۔ڈپٹی نذیر احمد نے ناول کی ابتدا میں یہ شعر درج کیا ہے کہ

بُرا دستور، بے جا بات ناہنجار شیوہ ہے
بڑی خوف و خطر کی جائے ہے جس گھر میں بیوہ ہے

ہندو معاشرے میں عورت کو کم تر درجے کی مخلوق ثابت کرنے کے لیے ان کی مقدس کتابوں کے حوالے ہی کافی ہیں جن میں کہیں عورت کو مہلک ترین زہر کہا گیا تو کہیں ناقص العقل۔ ان کے مقدس "پُران" میں کہا گیا ہے کی زہر کی سات اقسام ہیں اور ان میں سے مہلک ترین عورت ہے اور شراب کی تین قسمیں ہیں مگر سب سے زیادہ نشہ آور عورت ہے۔ ہندوؤں کے "برہم پُران" میں یہ بھی رقم ہے کہ چار سال کی بچی سے بھی شادی کی جا سکتی ہے۔ "بالک وِواہ" برِ صغیر پاک و ہندی تہذیب کا قدیم حصہ رہا ہے۔ اسی تہذیب میں عورت کو بیوہ کے روپ میں ایک بھیانک سزا اور نحس قرار دیا گیا۔ جس کی قباحت کی نذر مسلمان معاشرہ بھی ہوتا چلا گیا۔ ڈاکٹر توحید خاں لکھتے ہیں:

> اس عہد کی بڑی لعنت بیوہ عورت کی شادی کی ممانعت اور "ستی" کی رسم کا احیا تھی اور ابتدا میں یہ رسم صرف جنگجو قبیلے تک محدود تھی جیسا کہ "مہا بھارت" میں اور "رامائن" میں خواتین کے ستی ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ رسم ایک عظیم قربانی سمجھی جانے لگی اور س کا رواج عام ہو گیا"(۸۶)

منو سمرتی کے قوانین نے برِ صغیر پاک و ہندی معاشرت پر گہرے اثرات مرتب کیے خصوصاً اس میں عورت کو تعلیم سے دور رکھنے کے پیچھے اس کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے اس قانون کے مطابق اگر کوئی عورت قلم کتاب کو ہاتھ لگا لے تو اس کے خاندان کے لیے کسی مصیبت یا نحوست کی نشانی ہے۔

> "اس دور کا ایک سکالر چانکیہ برہمن تھا جس نے منو سمرتی کو حشو و زوائد سے پاک کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن عورت کے متعلق اس کے خیالات بھی نا پسندیدہ ہی رہے مثلاً "چانکیہ نیتی" میں وہ لکھتا ہے: جھوٹ بولنا، بنا سوچے سمجھے کام کرنا، فریب حماقت، طمع، ناپاکی، بے رحمی، یہ عورت کے جبلی عیب ہیں۔ دوسری جگہ لکھتا ہے کہ آگ پانی، جاہل مطلق، سانپ، خاندانِ شاہی اور عورت یہ سب موجبِ ہلاکت ہوتے ہیں ان سے ہمیشہ دور رہنا چاہیے۔"(۸۷)

ڈپٹی نذیر احمد نے یہ ناول "ایامیٰ" اسی موضوع پر لکھا اور بد قسمتی سے اس ناول کی طرف عوام کی توجہ بہت کم رہی اور اس کا ایک ہی ایڈیشن چھپنے کے بعد یہ ناول ناپید ہو گیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی

کو دوران تحقیق یہ ناول ملا تو انھوں نے نہ صرف اس پر کام کیا بلکہ اس کی اترپردیش اردو اکادمی سے چھپوانے کا اہتمام بھی کیا۔ ڈاکٹر وضاحت حسین اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔ "ہر چند کہ اس کی طوالت قاری پر گراں گزرتی ہے۔ دہلی کی ٹکسالی زبان پورے ناول پر غالب ہے زبان کی رو سے محاورے، کہاوت اور بیگماتی زبان کے ساتھ یہ ناول اپنے عصر کا ترجمان ہے۔[۸۸]

ڈپٹی نذیر احمد نے اس موضوع پر قلم اٹھا کر ایک طرح سے جہادی کام کیا اور خواتین کے جائز حقوق کے استحصال کی طرف معاشرے کی توجہ دلائی۔ اویس احمد ادیب اپنے مضمون "اردو کا پہلا ناول نگار میں لکھتے ہیں: پہلے پہل معاشرہ بیوہ عورتوں کی شادی کرنا اچھا خیال نہیں کرتا تھا بلکہ اسے معیوب تصور کیا جاتا تھا مولانا نذیر احمد نے بیوہ عورت کی دوسری شادی کرنے کی طرف داری کی اور اس پر ایک ناول لکھ ڈالا۔[۸۹]

زبان و بیاں کا ملکہ انھیں حاصل تھا۔ طبیعت میں مقصدیت کا رجحان تھا اور دلی کی ٹکسالی زبان و محاورات پر دسترس تھی۔ لہذا اس ناول میں بھی انھوں نے ہر کردار کو اس کی حیثیت و مقام کے مطابق الفاظ عطا کئے۔ مکالماتی اسلوب ان سے پیشتر موجود نہ تھا انھوں نے اس کو خوبصورتی سے نبھایا۔ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی لکھتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد نے ناول کے کرداروں کو ان کی اپنی زبان دینے کی پوری کوشش کی ہے اسی وجہ سے ان کے کردار جب کسی مولوی سے بات چیت کرتے ہیں تو جابجا قرآنی آیات اور عربی و فارسی اشعار استعمال کرتے ہیں۔ اردو زبان میں وہ نسائی حصہ جسے بعض ادباء اور نقادوں نے "زنانہ زبان" بھی کہا ہے، اس میں عربی سے بھی زیادہ فارسی کا دخل ایک تاریخی حقیقت ہے۔ جب نہ صرف ہندی پر بلکہ اس سے وابستہ دیگر لہجوں اور بولیوں جیسے کھڑی بولی، دکنی زبان، ہریانوی، پوربی پر بھی فارسی اثر انداز ہوئی۔ اس کے ابتدائی اثرات کے بعد اگلے دور میں جب فارسی کاروباری، قانونی، سماجی، دفتری اور صنعت و تجارت کی زبان بن چکی تو اس دور میں بھی زنانی زبان اور خصوصا دیہی علاقوں اور مقامی بولیوں کو زیادہ متاثر نہ کر پائی اور ایک الگ پہچان ان کی برقرار رہی۔

اسی زنانہ زبان میں شہری زبان کا لہجہ الگ تھا اور دیہی کا الگ۔ چونکہ دہلی دارلحکومت رہا اس لیے اس کی زنانہ زبان میں بھی فارسیت اور عربی زبان کے استعارے اور اصطلاحات شامل ہو کر روزمرہ اور محاورے کا حصہ بن گئیں۔ "اردو کی تہذیبی معنویت" میں سید علی محمد خسرو لکھتے ہیں کہ ہم اس زبان کو اردو کا نام دیں یا ہندی کہہ کر بلائیں کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا کیونکہ اصل مقصد باہم قابلِ فہم گفتگو کا تسلسل ہے جس کے لیے زبان کے نام کی سند کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اس دوسرے دور میں جب فارسی اپنا اثر دکھا چکی

تھی اور دفتروں، کاروبار، قانون، تجارت اور بازار، دربار، عدالت پر فارسی کے بعد اردو یا ہندی کی شکل ابھرنا شروع ہو چکی تھی تب دیہی و شہری زبان پر اس کے اثرات کا موازنہ کیا جائے تو واضح دیکھ سکتے ہیں کہ بقول علی محمد خسرو:

"ایک وہ ہندی جو دیہات میں رہی اور جس میں کہانیوں، پہیلیوں، محاوروں، کہاوتوں اور لوک گیتوں وغیرہ کی ایجاد ہوتی رہی، دوسری وہ ہندی جو شہروں میں آگئی اور فارسی کو دھیرے دھیرے بے دخل کر کے عوام کی زبانوں پر چڑھنے لگی، مگر فارسی زبان سے اور کہیں کہیں عربی زبان سے لفظوں اور محاوروں کو لے کر اور اصطلاحات وضع کر کے ہندی میں ضم کرنے لگی۔"[۹۰]

اویس احمد ادیب محاورات اور اسلوب کے حوالے سے ڈپٹی نذیر احمد کی ناول نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اصحاب کا مولانا نذیر احمد پر یہ اعتراض ہے کہ وہ دلی کے اکثر و بیشتر محاوروں کا استعمال کرتے ہیں لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ انھی محاوروں کے انمول خزانوں سے اردو زبان کا سرمایہ تیار ہوا ہے۔ جو عمدہ محاورات ایجاد کرے اور ان کا صحیح اور بر محل استعمال کرے تو یہ زبان کی خدمت ہے وہ لکھتے ہیں کہ "کیا محاورات محمد حسین آزاد کی عبارات موجود نہیں ہیں کیا سرشارؔ لکھنؤ کے محاورات کا استعمال نہیں کرتے؟ اردو ادب میں محاورات اور ضرب الامثال ایسی چیزیں ہیں جو اس کے سرمایہ کو بڑھاتی ہیں"[۹۱] ناقدینِ ادب ان کی تحاریر میں محاورات اور عربی و فارسی کی بوجھل تراکیب کے باعث سمجھتے ہیں کہ "محاوروں اور کہاوتوں کی بھرمار نے عبارت کو بوجھل بنا دیا ہے لیکن پھر بھی مکالمہ نگاری کے فن میں ڈپٹی صاحب کامیاب نظر آتے ہیں۔؟[۹۲] ڈپٹی نذیر احمد کا کمال یہ ہے کہ ان کو وہ لفظیات و اصطلاحات استعمال کرنے کا گُر آتا تھا جو دہلی کی بڑی بوڑھیوں کے پاس تھا۔ کئی ایسے الفاظ جو عام بول چال میں تو استعمال ہوتے تھے مگر کتابی زبان میں ان کا دخل نہ تھا ڈپٹی نذیر احمد نے ان کو بھی بڑی سہولت سے اور بر محل استعمال کیا جیسے 'ایامی' کی دوسری فصل میں وہ آزادی بیگم کی پیدائش کے حوالے سے جب لکھتے ہیں:

"آزادی جب پیدا ہوئی تو توانا تندرست ٹپڑے کا ٹپڑا، اچھے خاصے چار چار پانچ پانچ انگل گھنے گھنگھریالے سیاہ بال، چھٹی کے اندر کی کیا بساط، ماں کی گود میں سوئی کو دیکھا تو نظر لگانے والوں کی آنکھوں میں خاک جیسے برس سوا

برس کا پلا ہوا مر د بچہ پہلی بد گمانیاں اور اس کی یہ حالت کوئی نہیں کہتا تھا کہ یہ
جیے گی لیکن وہ تو کاٹھی اسی لئے لے کر آئی تھی جس نے کسی طرح کے روگ
کو اس پاس نہ پھٹکنے دیا۔ (۹۳)

وہ آزادی بیگم کی پیدائش کے وقت کی صحت اور جسامت کو جب "ٹپڑے کاٹپڑا" کہتے ہیں تو لگتا ہے کہ بڑی بوڑھیاں گفتگو کر رہی ہیں۔ کہیں "لوٹھے کالوٹھا" کہہ کر بھی اس کی عمر سے زیادہ بڑے قد کاٹھ کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہیں "ایامیٰ" کے ذریعے ڈپٹی نذیر احمد نے پہلی بار اردو ناول کی تاریخ میں عورت کے نفسیاتی مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس کے جذبات و احساسات اور جنسی ضروریات کے باعث پیدا ہونے والی ذہنی کیفیات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آزادی بیگم کے کردار کی زبانی ان تمام تر نفسیاتی دباؤ، سماجی دباؤ، جسمانی و جنسی ضروریات کو منظر عام پر لائے ہیں جس کا بر صغیر کے گھٹن زدہ معاشرے میں کسی عورت کی زبان پر آنا ہی اچھنبے کی بات تھی۔

آزادی بیگم وہ نسائی کردار ہے جس نے نسائی زبان کی مروجہ اصطلاحات کے اندر رہتے ہوئے مناسب الفاظ و محاورات کے شائستہ و شستہ استعمال کے ساتھ حقیقت نگاری کی ہے۔ آزادی بیگم کا وصیت نامہ ایک عورت کا نوحہ ہے۔

"جسم پر میرا بس چلتا تھا اور میں نے اس کی حفاظت کی، آنکھ غیر محرم پر پڑنے نہ پائی زبان کو گناہ کی بات نہیں بولنے دی۔ پاؤں بدراہ اختیار نہیں چلا، ہاتھ بے جا نہیں ہلا، لیکن دل پر میرا اختیار نہیں تھا وسوسوں کو کیونکر روکتی۔، خیالات کو کس طرح ٹالتی بس میرا بدن بالکل بے گناہ ہے لیکن دل نہ اس کو بے گناہ سمجھتی ہوں نہ بے گناہ کہتی ہوں۔۔۔ مجھ پر ایک وقت ایسا بھی گذرا ہے دن نہیں ہفتے نہیں، مہینوں کسی مرد کی آواز نہین سنی، بلکہ پرائے مرد کی آواز بھی بھلی لگتی اور ڈیوڑھی میں سننے کو جاتی تو کشش محسوس ہوتی تھی۔" (۹۴)

آگے جا کر وہ اپنے دوسرے نکاح کی فطری خواہش کا ذکر کرتی ہے اور پھر سماجی دباؤ، لوگوں کی باتوں اور اپنے آپ کو بے آبرو ہونے کے خیال سے اور موضوع گفتگو بننے کے خیال سے روکتی ہے۔ ایامیٰ میں خصوصاً آزادی بیگم کی وصیت کا حصہ نسائی آواز کا ایک عمدہ نمونہ ہے اور نسائی جذبات کی مکمل عکاسی کرتا ہے

آزادی بیگم کی وصیت کے الفاظ ہیں کہ جب کبھی نکاح کا خیال آیا تب ارادہ ہوا تو میں کہتی تھی ہے ہے یہ لوگ مجھے دو خصمی کہیں گے۔ برابر کی بیبیاں مجھے نظرِ حقارت سے دیکھا کریں گی، طنز کریں گی، مسکرائیں گی بی بی کی صحنک کھائیں گی اور پھر میں بیٹھی منہ تکتی رہوں گی۔ میری وجہ سے میری ساری نسل انگشت نما ہو گی ہر گز نہیں میں اس بے عزتی کی یوں متحمل نہیں ہو سکتی ایسے سہاگ کو آگ لگے جس کی وجہ سے عزت پر حرف آئے پھر لوگوں کے طعنے سنوائے اور گالیاں کھلوائے۔

وہ بتاتی ہے کہ نفس کشی کے لئے اس نے ایک سال تک "صوم داؤد" بھی رکھے کئی کئی ہفتے بالوں میں کنگھی نہ کرنا، کئی کئی دن کپڑے نہ بدلنا، مہینوں غسل نہ کرنا اور خود کو گندا سندا رول کر رکھنا۔ کہتی: "اس گھر میں میرا وہی وقار ہو گا جو ایک ماما یا کسی لونڈی کا ہوتا ہے۔ بلا سے افیم کھا رہوں گی اور بھائی بھاوجوں کے طعنے نہ سنے ہیں نہ آئندہ سنوں گی۔"(۹۵)

اور جب کہار اس کی ڈولی میکے کی بجائے کہیں اور لے جاتے ہیں تو اس وقت اس کی پریشانی اور تذبذب خالصتاً دہلوی مزاج اور ایک عورت ہونے کے باعث اپنے پردے اپنی آواز تک کے پردے کے خیال سے شور نہ مچانا نہ کہاروں سے دریافت کرنا کہ میاں کہاں جا رہے ہو یہ سب نسائی شعور کی بہترین عکس بندی کرتا ہوا حادثہ تھا۔ آزادی بیگم نے اس مایوسی کے عالم میں خودکشی کرنے کا بھی سوچا تھا وہ اپنے معاشرے میں عورت کی بے بسی پر خود کلامی کرتے ہوئے کہتی بھی ہے کہ وہ اگر شور مچائے گی تو آواز کا پردہ ٹوٹے گا یعنی بے پردگی ہو گی۔ اس لیے وہ صورتِ حال بھانپ جانے کے باوجود شور نہیں مچاتی۔

> " سمجھی کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے، رستے میں ڈولی سے کود پڑوں تو بے پردگی ہوتی ہے کہاروں سے پوچھوں تو ٹھٹ کے ٹھٹ آدمی بازار میں چلے جا رہے ہیں سب میری آواز سنیں گے اور ان میں کوئی جان پہچان کا ہوا تو بڑی بدنامی کی بات ہے مگر دن دیہاڑے کوئی کیا کر سکتا ہے آخر کہیں تو کہار ٹھہریں گے۔"(۹۶)

دال میں کالا ہونا، ٹھٹ کے ٹھٹ، دن دیہاڑے جیسے محاورات و اصطلاحات اردو زبان کے خاص تاثرات کے حامل ہیں اور ایک عورت کے فطری خوف و اضطراب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ آزادی کو اپنے تنہا اور کمزور ذات ہونے کا بخوبی احساس بھی ہے مگر شور مچا کر اپنے آپ کو بدنامی سے دوچار بھی نہیں کرنا چاہتی۔ وہ جوان ہے خوب صورت ہے شادی کے تیسرے سال ہی بیوہ ہو جاتی ہے اور بال بچہ بھی نہیں

ہے۔ جب کٹنی چھلاوہ اس کے گرد اپنا خوشامدی جال پھیلاتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ بیوگی کے باوجود اس کی چمکتی ہوئی رنگت کو کوئی زوال نہیں آیا تو اس پر آزادی بیگم خوب جواب دیتی ہے:

"اے ہے آگ لگے اس حسن کو، بلا سے کالی بھٹ ہوتی، لمبی بے ڈول ہوتی، سوکھی لقات ہوتی یا موٹی بھینس، بونی، باشتن، کچھ بھی ہوتی مگر ہوتی سہاگن، اب اس کم بخت صورت کو لے کر چاٹوں۔"(۹۷)

درج بالا پیراگراف کے الفاظ اور لہجہ دیکھیے یہ انداز کسی دل کے پھپھولے پھوڑنے والی عورت کا ہی ہو سکتا ہے۔ جو اپنے منہ سے آپ خود اپنے آپ کو کوستی ہے کہ یہ حسن یہ جوانی کس کام کی ہے جب بیوگی کے گھپ اندھیروں میں تنہا زندگی گزارنی پڑے تو حسن کسی سنپولیے کی طرح ڈستا ہے۔ جوانی انگاروں کے بستر پر کاٹنی پڑتی ہے سہاگن ہونا ہی اس معاشرے میں باعزت اور آسودہ زندگی گزارنے کا ذریعہ ہے ورنہ معاشرہ تنہا عورت کو جینے کا حق نہیں دیتا۔ اس سے ساری خوشیاں ساری عزت ساری آسودگی چھین لیتا ہے۔ برِصغیر پاک وہند کی عورت شگون، تعویذ اور فال نکلوانے پر بہت عقیدہ رکھتی ہے۔ آزادی بیگم بھی جب خودکشی کا سوچتی ہے تو اپنی بابت استخارہ کرتی ہے مصنف اس کی کیفیت لکھتا ہے:

"میں نے وضو کر دو رکعت نماز استخارہ پڑھی، دعا مانگی، جو فال دیکھنے کو قرآن کھولا تو اس کی پہلی سطر کے شروع میں تھا۔ ولا تقتلوا انفسکم (اپنی جان کو ہلاک نہ کرو) اور حاشیے پر کسی حدیث کے حوالے سے لکھا تھا کہ جو شخص جس طور سے خودکشی کرتا ہے ابد الاباد تک اس عذاب میں مبتلا رہے گا۔"(۹۸)

کوئی مرد ایسی زبان نہیں بول سکتا۔ نہ ایسی بے بسی کا شکار ہوتا ہے۔ یہ ایک رسم ورواج کے پاٹوں میں پسنے والی عورت کا بیانیہ ہے جسے ڈپٹی نذیر احمد نے نسائی زبان کا لبادہ پہنایا۔ سید محمد عبدالرشید ڈپٹی نذیر کی انشا پردازی کی بابت اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "زنانہ لٹریچر جس خوبی سے انھوں نے تیار کیا انھی کا کام تھا۔ اس میں انہوں نے اس طرح سے کام لیا کہ زمانہ اس کی ضرورت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی نکتہ رسی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"(۹۹)

حامد حسین قادری نے "داستانِ تاریخ اردو" میں ڈپٹی نذیر احمد کی تحریر کی اسی خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ واحد ڈپٹی نذیر احمد ہی تھے جن کے ہاں ہمیں زنانہ زبان جس حقیقی سماجی رنگ میں ڈھلی ملتی ہے ویسی اور کسی ادیب کے ہاں نہیں ملتی۔ وہ کہتے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد ایک ایسے صاحبِ طرز ادیب تھے جن کی دوسری مثال کوئی اور نہ ہو سکا۔ گھریلو خواتین کی خالص زبان کا چٹخارہ ان کے ناولوں میں موجود

ہے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ: "چند سطروں سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ ڈپٹی نذیر احمد کی تحریر ہے۔ خالص دہلی کی زبان اور محاورے استعمال کرتے ہیں۔ زنانہ ناولوں میں شریف مستورات کی بہترین زبان اور انداز اختیار کیا ہے۔"(۱۰۰) اور چونکہ لڑکپن اور آغاز شباب میں ہی نذیر احمد کو پہلے طالب علمی اور پھر شادی وہیں ہو جانے کی وجہ سے دہلی کے شریف گھرانوں میں آمد و رفت کا موقع ملتا رہا۔ انھوں نے دہلوی زبان کے تمام لوازم و محاسن بہت حاصل کر لئے پھر تصانیف کا سلسلہ آغاز ہوا تو تب بھی انھوں نے پہلے پہل لڑکیوں کے لئے زنانہ افسانے ہی لکھے۔ اور ان میں ہو بہو وہی زنانہ زبان لکھی۔

یہ زنانہ لٹریچر وہ ایک طویل عرصے تک تیار کرتے رہے۔ ہندی کی چندی اور بال کی کھال نکالنے کا ان کو ویسے بھی شوق تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ ہر کتاب کو نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان کریں۔ اسی وجہ سے ڈپٹی صاحب کی طبیعت وہ تحریر دونوں میں صاف بیانی، روزمرہ اور محاورات اور گھریلو زنانہ انداز بیان آتا چلا گیا۔ عظیم الشان صدیقی نذیر احمد کی ناول نگاری کے موضوع پر اسی کتاب میں لکھتے ہیں کہ جس طرح ایامیٰ میں نسائی جذبات کی عین سچی اور مبنی بر حقیقت عکاسی ڈپٹی نذیر احمد نے کی ہے اس سے قبل اردو ادب میں اس کی مثال نہیں ملتی کیونکہ برِ صغیر پاک و ہندی مسلم تہذیب بھی ہندو عقائد و رسومات کے زیرِ اثر تھی اور ہندوؤں کے ہاں بیوہ سے زندگی کے سارے رنگ چھین لینے کا رواج تھا۔ ستی کی رسم بھی اسی دھرتی کی عورت کے پتی ورشا کا ایمان تھی اور بیوہ کی دوسری شادی معاشرے میں ناپسندیدہ فعل کے طور پر گردانی جاتی تھی۔ ایامیٰ کی آزادی بیگم بھی اسی سماجی دباؤ کا شکار وہ جواں سال عورت ہے جو شادی کے دو تین سال بعد ہی بیوہ ہو جاتی ہے اور زندگی کے دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں وہ اپنے جسمانی اور نفسیاتی تقاضوں کی زبان سمجھ رہی ہے اور زمانے کی باتوں اور تنقید سے بھی ڈرتی ہے۔ عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں: اس کا پہلو مرد کی آغوش کے لئے سلگتا ہے اس کے جذبات بے قابو ہو کر خوانچہ والے مہتر سے لپٹ جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مرد کی آواز پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں "۔(۱۰۱)

ایامیٰ نہ صرف نسائی زبان بلکہ نسائی جذبات کی کہانی بھی ہے۔ اس ناول میں برِ صغیر پاک و ہندی معاشرت میں سماجی دباؤ، ظاہری رکھ رکھاؤ، جھوٹی عزت اور بے بسی کے پاٹوں میں پستی ہوئی آزادی بیگم کی

زندگی کے مسائل کے گرد بُنی ہوئی اردو کے مایہ ناز ناول نگار کے قلم کی زبان سے رقم نسائی بیانیہ ہے۔ جہاں ہمیں وہ روزمرہ اور محاورات ملتے ہیں جو دہلوی نسائی زبان کی نشانی ہیں۔

iii. فسانہء آزاد: رتن ناتھ سرشارؔ

چُست جملے، دلچسپ محاورے، فصیح اندازِ بیان، تہذیبی زبان اور زندگی سے قریب تر کردار جب مافوق الفطرت واقعات کے ساتھ ہماری یاداشتوں میں اُبھرتے ہیں تو فسانہء آزاد کا نام فوراً ذہن میں آتا ہے۔ اردو زبان کو نیا اسلوب نیا آہنگ عطا کرکے نثری ادب پر گہرے اثرات مرتب کرنے والے پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ کا شمار انیسویں صدی کے نمایاں نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔

رتن ناتھ سرشارؔ نے صحافتی انداز میں "اودھ پنچ" کے لیے اس ناول کو قسط وار لکھنا شروع کیا اور بعد ازاں اس کی مقبولیت اور اصرار نے اس سلسلے کو ختم نہ ہونے دیا اور یوں یہ ناول ساڑھے تین ہزار الفاظ کے ساتھ تین ضخیم جلدوں میں چھپ کر سامنے آیا اور آج تک اردو نثر کی کہانی میں وہ حیثیت و اہمیت رکھتا ہے کہ اس پہاڑ کو عبور کیے بغیر ہم آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔ فسانہء آزاد دسمبر ۱۸۷۸ء سے دسمبر ۱۸۷۹ء تک ضمیمہ کی شکل میں شائع ہوتا رہا اور مطبع نول کشور سے ۱۸۸۰ء میں چار ضخیم جلدوں میں شائع ہوا۔ اس میں لکھنو کے گلی کوچے، بازار، گاؤں، شہر، سرائیں، باغ باغیچے، مساجد، میلے ٹھیلے، تہوار، لباس، کھانے، تقریبات، سنگھار، شگون، عقائد، توہمات سب کا ذکر آجاتا ہے، سرشارؔ نے اگرچہ بہت کچھ اس کے علاوہ بھی لکھا اور تراجم بھی کیے انھوں نے "سیر کہسار"، "کامنی"، "جامِ سرشارؔ" "ہشو"، "کڑم دھڑم"، "چنچل نار"، "طوفانِ بد تمیزی"، "رنگِ سیار"، "شمس الضحیٰ"، "خدائی فوجدار"، "الف لیلیٰ کا ترجمہ"، اور "اعمال نامہ روس" کا ترجمہ بھی لکھے مگر جو جاودانی شہرت فسانہء آزاد کے حصے میں آئی وہ کسی اور کے نام نہ ہو سکی۔ اپنی خامیوں سمیت یہ زندہ و جاوید ہے۔ رام بابو سکسینہ کا "تاریخ اردو ادب" میں کہنا ہے:

> "اُردو کے پرانے نمونے دو طرح کے تھے ایک تو میر امن دہلوی کی سادی عبارت اور دوسری مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کی فارسی مذاق کی رنگین اور مسجع و مقفیٰ عبارت۔ اس کے بعد جو اردو کے نئے مجدد پیدا ہوئے وہ سب حسب، ذیل ہیں۔ سر سید احمد خان، مولوی محمد حسین آزادؔ، مولانا نذیر احمد صاحب، پنڈت رتن ناتھ سرشارؔ اور مولانا عبدالحلیم شررؔ"(۱۰۲)

اسے داستانی ناول بھی کہا جاتا ہے اور داستان اور ناول کی درمیانی کڑی بھی مانا جاتا ہے۔ رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں کہ اس کی اشاعت نے دنیائے اُردو میں ایک عجیب ہلچل پیدا کر دی تھی جب یہ اخبار میں نکلتا تھا تو لوگوں کو اس کا اس قدر اشتیاق ہوتا تھا کہ اگلے پرچے کے لیے بیتاب رہتے تھے۔ وہ مثالی کردار نگاری کے قائل نہ تھے جو برائیوں کو چھپاتے اور اچھائیوں کو چمکاتے ہیں بلکہ اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ہو بہو تصویریں کھینچتے ہیں اور علی الخصوص اشخاص لکھنو میں سے اعلی و ادنیٰ امیر و غریب ہر کردار کے بے مثل مرقعے اس کتاب میں کھینچ کے رکھ دیتے ہیں۔ سید لطیف حسین ادیب "رتن ناتھ سرشارؔ کی ناول نگاری" میں نسائی کرداروں اور ان کی زبان کی بابت لکھتے ہیں:

> "عورتوں کے بیان میں سرشارؔ کا قلم بہت تیز چلتا ہے۔ ان کی تصانیف میں زنانہ سیرتوں کی بھرمار ہے۔ حسن آرا اور نواب نادر جہاں بیگم کے کردار چھوڑ کر باقی تمام سیرتیں جنسی بھوک کی مریض ہیں۔ قمرن اور نازو چوڑی والیاں ہیں۔۔۔ قمرن کی سیرت میں بچپنا اس قدر غالب ہے کہ وہ کسبی ہو کر بھی کسبی نہیں معلوم ہوتی۔"(۱۰۳)

سید اعجاز حسین اعجاز "مختصر تاریخ ادب اردو" میں سرشارؔ کے فسانہء آزاد کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ان کی زبان میں ایک خاص طرح کی شگفتگی اور پاکیزگی کے ساتھ روزمرہ و محاورات کی ایسی سلاست و روانی موجود تھی جس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ انھوں نے انتہائی دلچسپ پیرائے میں لکھنو کی پوری تہذیب ،طرزِ معاشرت، زبان و بیان، اور زوال آمادہ سوسائٹی کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ انھوں نے اس زوال آمادہ تہذیب کا نوحہ اس ظریفانہ انداز سے بیان کیا کہ نہ صرف سچی منظر کشی کرنے میں کامیاب ہوئے بلکہ اردو زبان و بیاں کو داستانوی دبازت سے نکاتے ہوئے ناول کی حقیقی زندگی کے قریب لا کر کھڑا کر دیا۔

یہ زبان ہی ہے جس سے تمام کردار اپنی اپنی جگہ عین حقیقی لگتے ہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ فسانہ آزاد کے ایلچی سے لے کر چانڈو باز تک، کنجڑے سے لے کر برف والے تک، بیگمات سے لے کر نوابوں تک، کہاریوں سے لے کر مغلانیوں تک، مہریوں سے لے کر چوڑی والیوں تک سے لے کر بھٹیارنوں تک ہر کردار اپنی بولی بولتا نظر آئے گا۔ اور یہ سب کردار ہماری آنکھوں کے سامنے سایہ کی طرح نہیں گزرتے بلکہ وہ ہمارے سامنے زندہ اور چلتے پھرتے جیتے جاگتے معلوم ہوتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"فسانہ آزاد کو پلاٹ کے تناسب کریکٹر نگاری، اسلوب اور قصہ کی تدریجی ترقی اور دلچسپی کے لحاظ سے نہ پڑھنا چاہیے۔ اصل قصہ کو کھونٹی سمجھنا چاہیئے۔ جس پر ہزاروں واقعات ٹنگے ہوئے ہیں اور انھیں علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھنے میں سارا لطف آتا ہے وہ ان کا مذاق و ظرافت، وہ دلچسپ کریکٹر اور حاضر جوابیاں یہی سب باتیں کتاب کی جان ہیں"(۱۰۴)

لکھنوی تہذیب نے سرشارؔ کی شخصیت پر اتنے گہرے اثرات مرتب کیے کہ ایک زندہ و جاوید تصنیف "فسانہء آزاد" کی صورت میں تخلیق کر گئے۔ جس کا توڑ کوئی آج تک نہ کر سکا۔ اور اس کے مقابل کسی اور افسانوی ادب کے شاہکار کو نہیں لایا جا سکتا۔ اگر چہ یہ ایک کمزور پلاٹ کا حامل ناول کہا جا سکتا ہے اور کچھ ناقدین اس کو ناول تسلیم کرنے سے بھی انکاری ہیں مگر اس کی دیگر خصوصیات مثلاً واقعات نگاری، کردار نگاری، دلچسپ ڈرامائی مناظر، مزاحیہ انداز، مکالمات کا تسلسل، زبان و بیان کی چاشنی جیسے عناصر اس کی اہمیت میں کمی نہیں آنے دیتے۔

ان کے ہاں نسائی زبان ہمیں ڈپٹی نذیر کے ناولوں کی شریف مسلمان گھرانے کی گھریلو خواتین کے برعکس قدرے آزاد خیال، ماڈرن سوچ کی حامل خواتین کی زبان ملتی ہے۔ نسائی لہجہ اپنی فطری نزاکتوں اور بے باکیوں سمیت زندگی کے نسائی پہلو آشکار کرتا ہے۔ خصوصاً اظہارِ عشق کرنے میں، قلبی کیفیات کو بیان کرنے میں، ہجر و وصال کے قصے سنانے میں۔ سرشارؔ کا سماجی شعور اتنا وسیع اور اتنا عمیق ہے کہ اس میں سیکڑوں کردار اپنی شخصی انفرادیت سمیت محفوظ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ وہ اپنی معاشرت کے تمام رنگ "فسانہء آزاد" میں یکے بعد دیگرے سموتے چلے جاتے ہیں۔ نسائی رسوم، نسائی احساسات اور نسائی دلچسپیاں مخصوص نسائی الفاظ و محاورات کی مدد سے بیاں ہوتے ہیں۔ چند نسائی الفاظ کا مشاہدہ اس مختصر مکالمے میں ملاحظہ فرمائیے

روح افزا: مواعباس کا پنڈا تھا موٹے موٹے ہاتھ پاؤں

سپہر آرا: جنازہ نکلے مونڈی کاٹے علَم بردار کا علَم ٹوٹ پڑے

حسن آرا: وہ تو خیر ہوئی کہ صندوق ہاتھ سے گر پڑا ورنہ سب کچھ موس لے جاتا

سپہر آرا: بہن کی چڑچڑی ساس لاکھوں ہی سناتیں کہ میری بہو کا سونا سب بیچ کھایا، کیا کیا باندھو باندھتیں

بہار: چور چور کی بھنک کان میں پڑی تو میں جاگی اور اٹھ کر بھاگی، سارا چونڈا کھل گیا اللہ ہی جانتا ہے کتنی محنت سے بنایا تھا۔ چلو خیر

روح: بس ہماری باجی کو تو ہر وقت چوٹی کنگھی، بناؤ چناؤ کی ہی فکر رہتی ہے خواب میں بھی سنورتی نکھرتی ہونگی

حسن: بھئی خاتونِ جنت کی قسم جتنا ان کو اس بات کا خیال رہتا ہے اور جتنی یہ بنی تھنی رہتی ہیں اتنا ہمارے خاندان میں کسی کو نہیں ہے جبھی تو دولہا بھائی ان پر ریجھے ہوئے ہیں۔

سرشارؔ کی زبان عام انسان کی لکھنوی زبان ہے مگر اس میں تکلف و تصنع کی دبازت وہ نہیں جس سے روانی میں کمی آئے فیروز مکرجی کی کتاب "لکھنو اور سرشارؔ کی دنیا" میں جس کا ترجمہ مسعود الحق نے انگریزی سے اردو ترجمہ کیا اس میں وہ لکھتے ہیں:

> "زبان پر قدرت اور عبور سب سے زیادہ واضح ان عبارتوں میں ہے جن میں مکالمے موجود ہیں اور کتاب کا بڑا حصہ ایسے ہی مکالموں پر مشتمل ہے۔ سرشارؔ کو معلوم تھا کہ وہ مکالمے کتنے اچھے لکھ سکتے ہیں اور انھوں نے اپنی اس مہارت کا بھرپور استعمال کیا۔ غور کیجیے تو تقریباً ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ جب کبھی کوئی اہم بات کہنا یا اپنے قارئین کے ذہنوں میں کوئی نکتہ بٹھانا چاہتے ہیں تو اسے دو یا دو سے زیادہ افراد کے مابین تبادلہ خیال کا موضوع بنا دیتے ہیں۔" (۱۰۵)

ایک اور خاص بات جس کا تذکرہ عظیم الشان صدیقی نے اپنی تصنیف "اردو ناول کا آغاز و ارتقا" میں بھی کیا ہے وہ اندازِ بیاں کے ایسے چٹکلے اور چٹخارے پیدا کرنے پر قادر تھے جیسا کوئی اور ادیب عموماً جراءت نہ کر سکتا تھا۔ انہوں نے کہیں تذکیر و تانیث کے فرق سے تو کہیں فارسی و انگریزی الفاظ کے غلط سلط استعمال سے، کہیں صوتی مغالطوں سے اور کہیں جملوں کی تکرار سے ایسے ایسے مزیدار لطائف پیدا کیے کہ قاری فراموش نہیں کر سکتا۔ کہیں تو جانی بیگم کی گفتگو ہے تو کہیں عباسی بیگم کی حاضر جوابی، کہیں نازو کے ناز و ادا تو کہیں نوابوں کے نخرے اور افیونیوں کی منمناہٹ الغرض سب کچھ اردو کے زبان و محاورہ کی زینت بنتا چلا جاتا ہے

علی عباس حسینی اسی حوالے سے کہتے ہیں کہ سرشار کی عورتیں روائتی گھرانوں کی شریف بیبیاں قسم کی نہ تھیں قدرے آزاد خیال بیگمات تھیں جو زندگی کے مختلف رنگوں کو سمجھتی تھیں اور مردوں سے بھی بیباکانہ انداز میں مخاطب ہونے کی جرات رکھتی تھیں۔ ان کا اندازِ تخاطب جداگانہ تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "سرشار کو بیگماتی زبان اور معاشرت اور رواسم پر خاصا عبور تھا۔ وہ ان کی ذہنیت مزاج اور طور طریقوں سے بخوبی واقف تھے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان کی بیگمات، مسلمانوں کے معیاری شریف گھرانوں کی بیبیاں نہیں، بلکہ امیر گھرانوں کی مخلوط النسل قدرے آزاد خواتین ہیں۔"(۱۰۶)

اس کی ایک اور بڑی خوبی اس کے تمام کرداروں کا اپنی اپنی سماجی حیثیت و مقام کے مطابق زبان و محاورہ کا استعمال بھی ہے خصوصاً نسائی زبان کے حوالے سے اگر ہم فسانہ آزاد کو دیکھتے ہیں تو ایک الگ ہی جہان آباد نظر آتا ہے۔ ایک نسائی کردار ظہورن کی گفتگو ملاحظہ فرمایئے کہ وہ نواب صاحب کی بے وفائی سے متاثر ہوتی ہے تو تنک کر کہتی ہے کہ ہم کوئی گرے پڑے نہیں ہیں ہماری اٹھتی جوانی کو تم جیسے ستر ستر لوگ سراہنے اور خوشامد کرنے کو موجود ہیں اگر تم ہمیں چھوڑو گے تو ہم تم جیسے تین سو ساٹھ کو ٹھکرا سکتے ہیں، یہ ڈر ہو گا تو گھر کی جورو کو، ہم کسی کو اپنی چھاتی پہ مونگ نہیں دلنے دیں گے۔ ظہورن کی یہ گفتگو نسائی لب ولہجے کی تمکنت اور وقار کی جھلک پیش کرتی ہے جب اس کی انانیت کو ٹھیس پہنچتی ہے تو وہ کس طرح تن کر جواب دیتی ہے اور منت ترلے کر کے تعلق کی بھیک نہیں مانگتی۔ عورت کی حساسیت اور اس کی زبان کی آمیزش سے ہمیں چھاتی پہ کودنا، گراپڑا ہونا، گھر کی جورو جیسے الفاظ وتراکیب کا نمونہ نظر آتا ہے۔ اسی بابت عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں کہ سرشار کو عورتوں کی زبان پر ملکہ حاصل ہے اور وہ بول چال، لب ولہجہ کی چاشنی رمز وکنایہ محاوروں وضرب الامثال کی تاثیر سے خوب واقف ہیں۔

فسانہ آزاد کی زبان اس کی سب سے بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ اس میں ایک نواب سے لے کر ایک بھنگن تک اور ایک طوائف سے لے کر بھٹیارن تک سب کی زبان عین اس کے کردار کے مطابق ہے۔ ان کی لفظیات، ان کا اندازِ گفتگو، ان کے روزمرہ و محاورات نے جیسے لکھنوی تہذیب کو ہمیشہ کے لیے زندہ و محفوظ کر دیا ہے۔ پریم پال اشک رتن نے رتن ناتھ سرشار کی انھی خوبیوں کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سرشار نے اپنے فن کے روپ میں اردو ادب کو نئی زبان دی، بولنے کا سلیقہ، نئے نئے الفاظ اور نئی بندشیں سکھائیں یہی نہیں بلکہ انھیں ادا کرنے کا بھی ایک نیا لاجواب اور اچھوتا انداز عطا کیا، اس میں شک و شبہ کی

گنجائش ہی نہیں کہ سرشارؔ اپنے فن میں طاق ہیں، آل احمد سرورؔ لکھتے ہیں کہ "سرشارؔ کی نثر نذیر احمد سے زیادہ قدیم ہے مگر دیکھا جائے تو ماحول کی مصوری ان کو ڈپٹی نذیر احمد سے بڑا ناولسٹ بناتی ہے۔"(۱۰۷)

ڈاکٹر عبد الرشید صدیقی نے "فسانہء آزاد کی تہذیبی فرہنگ" میں لکھا ہے کہ داستانی دور کے خاتمے پر یہ شاہکار کچھ اس طرح منظرِ عام پر آیا کہ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر ناول کی بنیاد رکھی اور اسے انگریزی ناول سے ہم آہنگ کرنے کی جاندار کوشش ثابت ہوا، مذید لکھتے ہیں کہ اس میں زندگی کے بے شمار رنگ اور بے شمار شعبے سما گئے تھے۔ یہاں ہمیں طرزِ رہن سہن، روایات، ملبوسات، زیورات، آدابِ طعام اور مشاغل میں سے پتنگ بازی، بٹیر بازی، تاش بازی، جانوروں کی لڑائیاں، مختلف سواریاں الغرض انواع و اقسام موضوعات کا ایک میلہ آباد نظر آتا ہے ان کے فسانہء آزاد کی زبان و محاورہ کی بابت کہنا ہے کہ "فسانہ آزاد " مقامی بولیوں خصوصاً لکھنو کی بیگماتی زبان اور ان کے مخصوص روزمرہ، محاورات و اصطلاحات سے بھرپور ہے۔"(۱۰۸)

رام بابو سکسینہ بھی ان کی زبان و محاورہ کو برتنے کی صلاحیت بابت ایسے ہی خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "سرشارؔ کا بحثیت ایک ماہر زبان اور ایک صاحب طرز بہت صاف، سلیس، بامحاورہ اور زور دار عبارت لکھتے ہیں۔۔۔ کبھی ضرورت سے زیادہ محاورات اصطلاحات کرتے ہیں۔"(۱۰۹)

سرشارؔ سے قبل افسانوی ادب مکالمے کے ذائقے سے نا آشنا تھا۔ سرشارؔ نے اس کو اس سے روشناس کروایا اسی لیے اس کو ہم داستان اور ناول کی درمیانی کڑی بھی کہتے ہیں کہ یہاں حقیقی انسانی زندگی رواں دواں نظر آتی ہے یہاں زبان کا استعمال صرف خارجی منظر نگاری کے لیے نہیں کیا گیا۔ کرداروں کے تاثرات اور لب و لہجے سمیت برتا گیا ہے۔ داستان کا مرکزی نسائی کردار حسن آرا اپنے دور کی دیگر خواتین کی طرح بات بات سے شگون لینے اور قیاس کرنے کی عادی ہے۔ ہر کام ہر ارادے سے پیشتر وہ فال نکلوانا ضروری خیال کرتی ہے۔ کہیں کوے کے بولنے سے خط آنے یا مہمان آنے کا شگون لیا جاتا ہے تو کہیں دنبالہ دار یعنی دم دار ستارے کو دیکھ کر ضعیف العقیدہ لوگ کانپنے لگتے ہیں اور کہیں کالی بلی کو منحوس گردانا جاتا ہے۔ سید لطیف حسین ادیب لکھتے ہیں:

"بلی خاص طور پر کالی بلی، برِ صغیر پاک وہند میں منحوس سمجھی جاتی ہے۔ یوں تو کتنے ہی لوگ اس کو بہت محبت سے پالتے بھی ہیں لیکن اس کی بہت سی حرکات کو ناپسندیدہ بھی سمجھا جاتا ہے مثلارات کے وقت بلی کا رونا، بلی کا راستہ کاٹنا، جمعرات کے دن بلی پر

نظر پڑنا وغیرہ۔ عوام کا خیال ہے کہ جمعرات کے دن جن بلی کے روپ میں گھومتے ہیں۔"(۱۱۰)

ضعیف الاعتقادی برِ صغیر پاک و ہندی ماحول میں ہزار ہا برس سے موجود ہے اس کی وجوہات بہت سی ہیں جن میں سب سے بڑی وجہ خاص طور پر عورتوں میں تعلیم کی کمی اور معاشرتی سطح پر کمزور حیثیت اور عدم اعتمادی کا شکار ہونا بھی شامل ہے۔ انھیں اپنی ذات پر اعتماد کرنا نہیں سکھایا گیا بلکہ ہمیشہ کمتر اور حقیر باور کروایا گیا جس کے باعث وہ خوف خدشوں کا شکار رہتے ہوئے کبھی تو جھوٹے مذہب کے ٹھیکے داروں کے ہاتھوں بے وقوف بنتی رہی کبھی تعویذ دھاگوں اور ٹونے ٹوٹکوں سے توانائی حاصل کرنے کے دھوکے میں پڑی رہی۔ اکثر رسومات کے پیچھے یہی عناصر کار فرما رہے۔ نتھ چوڑی کو سہاگ کی ضمانت جان کر خود کو چھدوایا گیا اور بھاری پراندوں میں سہاگن ہونے کی علامتوں کو رکھا جاتا رہا۔ مگر سرشارؔ کے ہاں "فسانۂ آزاد" کی خواتین ایسی خاص قدامت پسند نہیں ہیں۔ روشن خیال، خوش مزاج اور خوش گفتار ہیں۔ اردو ناول- آغاز و ارتقا ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء" میں عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

> " سرشارؔ کی نظر میں عورت کا تصور یہ نہیں ہے کہ وہ گھر کی چار دیواری میں مقید رہے وہ معلمہ ہو یا پھوہڑ وہ عورت کو ایک شے لطیف تصور کرتے ہیں اور عورت و مرد کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم سمجھتے ہیں ان کی نظر میں عورت و مرد کے درمیان تعلقات یا ہنس بول لینا کوئی بری بات نہیں ہے لیکن وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ سچا عشق صرف میاں بیوی کے درمیان ہی ہو سکتا ہے۔(۱۱۱)

برِ صغیر پاک و ہندی فضا وہ فضا ہے جہاں کہیں کوا بولنے پہ مہمان آتے اور کہیں منگل کو کپڑے دھونے پر شوہر کی زندگی اور اس کا سر خطرے میں پڑ جاتا ہے، کبھی سات سہاگنوں سے شادی کے جوڑے کو ہاتھ لگوا کر خوشگوار ازدواجی زندگی کی ضمانت لی جاتی ہے اور کبھی حضرت عباس کے عَلَم کو سہارا مانا جاتا ہے، مخصوص نذر نیازیں مخصوص کام شروع کرنے یا انجام بخیر ہونے کے لیے دلوائی جاتی ہیں، درگاہوں، درباروں پر منت کی چادر چڑھانا اور جمعرات کے چراغ جلانا یہ سب ایسے ہی اوہام و عقائد کا سلسلہ ہیں جن میں برِ صغیر پاک و ہندی عورت ہی زیادہ متحرک نظر آتی ہے اور سرشارؔ نے بھی گاہے گاہے اس قسم کے کئی واقعات نسائی فکر کے طور پر نمایاں کیے ہیں۔ علی عباس حسینی کہتے ہیں: "حسن آرا کو تھوڑی بہت وہم پرستی وراثتاً ملی ہے۔ وہ

فال کی بہت قائل ہے۔ خاص کر دیوان حافظ کی وہ حد سے زیادہ معتقد ہے۔ کوئی پریشانی ہوئی وہ جلدی سے خواجہ صاحب سے صلاح لینے پہنچ جاتی ہے۔ "(۱۱۲)

رتن ناتھ سرشارؔ نے فسانہء آزاد میں اپنے عہد کی زبان و ثقافت کو جس طرح محفوظ کیا اس کی مثال کم ہی ملتی ہے اس نے لباس وزیورات کے حوالے سے بھی بہت اہتمام سے نسائی پہلو کو شاملِ تحریر کیا۔ آج ان کی تحریر سے ہی ہمیں اس عہد کے ان لباس وزیورات کا پتا چلتا ہے۔ مصنف نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ بیگمات اور لونڈیوں، کہاریوں و مغلانیوں کے لباس اور زیورات کی تفریق بھی مقدم رکھی ہے۔

زیورات کے حوالے سے نسائی الفاظ اور اسماء بھی دلچسپ تھے مثلاً بجلیاں، آڑی ہیکل، کرن پھول۔ سیس پھول، جڑاؤ چاند، چمپا کلی، جوش، لچھیاں، پہنچیاں، کڑے، چوہے دتیاں، چھاگل، کنٹھا، جھومر، بالیاں، چوق، گلوبند، پنج لڑا، نتھ، ہنسلی اور جڑاؤ چاند ٹیکی اور پنج انگلہ وغیرہ۔

سب بیگمات کے ہاں جو لباس مروج تھے ان میں گرنٹ کا پاجامہ اٹھارہ گز کا اور اس پر آٹھ گز گرنٹ کی گوٹ گوٹ پر چٹکی کا لہریا پیچ میں تھل ٹکے ہوئے گوٹ کے آگے بنت لچکا اور پھنسا ہوا شلوکا آستین دار، ململ کا دوپٹہ گوٹ والا اور مہریوں کا عمومی لباس کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ زیادہ تر سرمئی گرنٹ کا لہنگا، گوٹ پر آٹھ آٹھ پلیٹیں اس پر تاج بنے ہوئے سرخ گرنٹ کا نیفہ ریشمی ازار بند، اور بھڑکیلی کرتی بھڑکیلا دوپٹہ ہوا کرتا تھا۔

سرشارؔ کو بیگماتی زبان پر عبور حاصل تھا۔ وہ دلچسپ فقرے چست کرنے کا فن جانتا تھا۔ بسیار نویسی کے باوجود اس کے جملے دلچسپ اور کاٹ دار ہوا کرتے تھے خاص طور پر نسائی زبان و محاورات، کہاوتوں اور ضرب الامثال کا استعمال بہت برمحل اور رواں ہوتا تھا۔ بات بات پہ کوئی کہاوت یا محاورہ جڑ دینا اس کا خاصہ تھا۔ اس کی تحریر میں میاں بیوی کے سنجیدہ تعلقات و مسائل پر گفتگو کم ہی ملتی ہے زیادہ تر لڑائی یا سوتیا پن کے موضوعات پر گلے شکوے اور روٹھنا منانا ہے۔ اس کی عورت کی زبان بھی بے لاگ اور بے جھجک ملے گی شریف عورت کی زبان کا گمان کم ہی گذرے گا۔ ڈاکٹر قمر رئیس لکھتے ہیں کہ "نوابی عہد کے لکھنو کی انحطاط پزیر معاشرے کی مصوری، اس کی اچھوتی ظرافت اور لکھنو کی بامحاورہ ٹکسالی زبان کے فن کارانہ استعمال کو سرشارؔ کے کمال فن کا جوہر کہا جا سکتا ہے۔"(۱۱۳)

فسانہء آزاد میں نسائی زبان و محاورات کو جس سہولت اور روانی سے برتا گیا اور جس طرح مکالمات کا سہارا لے کر اس کو داستانوی ادب کے بیانیے سے نکال کر حقیقی زندگی اور اپنے عہد کی زندہ چلتی پھرتی ارد گرد

ہنستی بولتی زندگی کے قریب لایا گیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس فسانے کی عورتیں مثالی حسن کے سے پریوں کے پیکر سے نکل کر تڑاخ تڑاخ بولتی، لڑتی جھگڑتی، حسد اور احساسِ رقابت میں جلتی بُھنتی، دل کے پھپھولے پھوڑتی اور کہیں اپنے حسن و سنگھار میں مگن رہتی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ ان کی زبان محلاتی و بیگماتی بھی ہے اور گلی محلے کی ماماؤں اور بھٹیارنوں والی بھی۔ وہ زمینی مخلوق نظر آتی ہیں یہی رتن ناتھ کا سب سے بڑا کارنامہ تھا کہ اس نے اردو افسانوی نثر کو نہ صرف مکالمے سے روشناس کروایا بلکہ ساکت و جامد داستانوی اسلوب اور موضوعات سے بھی نکال لایا اور جیتی جاتی چیختی چلاتی زندگی کے میلے کے بیچوں بیچ لا کھڑا کیا۔ اس سے آگے ناول نے اس کی انگلی تھام لی تھی۔

رتن ناتھ سرشارؔ نے بلا جھجک عام آدمی کی محاوراتی زبان کو نثر سے روشناس کروایا، اس کے ہاں ہر کردار مخصوص پس منظر کی زبان بولتا ہوا ملتا ہے، ایک نواب نوابی زبان بولے گا اور ایک پھیری، ٹھیلے والا اپنی بازاری زبان میں آوازیں لگائے گا۔ بیگمات کی زبان میں الفاظ کا رکھ رکھاؤ بیگماتی ہو گا اور مغلانی و کہارن اپنی سماجی حیثیت میں بولے گی اور اسی فطری انداز میں الفاظ کا چناؤ بھی کرے گی۔ یہ لسانی سطح پر سرشارؔ کا بہت بڑا کارنامہ تھا کہ اس نے اردو افسانوی ادب کو زبان و محاورہ کے اس جدید اسلوب سے قریب تر لا کھڑا کیا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف حسن آرا ہے جس کی گفتگو محلوں میں رہنے والی شریف زادیوں کی گفتگو ہے وہی محتاط انداز وہی چنیدہ الفاظ و محاورات، مدبرانہ لہجہ، ذمہ دارانہ باوقار اندازِ تخاطب اور رکھ رکھاؤ ہے۔ اس کے الفاظ و محاورات بھی شائستہ مذاق ہیں اور دوسری طرف ظہورن ہے جو بوالہوسی کا شکار ہے، منہ پھٹ اور بے باک ہے، اپنے حسن و ادا کی قیمت وصول کرنا جانتی ہے اور اس کے جملوں میں ایک خاص کاٹ موجود ہے۔ وہ ٹھکرائے جانے پہ بپھر بھی جاتی ہے اور اسی کم تر درجے کی عورتوں کی سی زبان بولتی ہے اور ایک طرف قمرن ہے جو ایک ادنی درجے کی نوجوان ماما ہے جس کو دنیاداری بھی آتی ہے اور نین مٹکا بھی، جو ہاتھ سے کام کرتی ہے اور آنکھوں سے اشارے، ان سب نسائی کرداروں کی زبان و محاورہ عین ان کی سماجی و نفسیاتی حیثیت و مقام کے مطابق ہے۔

فسانہ آزاد کے نسوانی کرداروں کی زبان اپنے اپنے سماجی مقام اور شعور کے مطابق اسی عورت کی زبان ہے جو اس معاشرے میں جیتی جاگتی، ہنستی بولتی، لڑتی جھگڑتی، ناز اور ادائیں دکھلاتی، طعنے کوسنے سناتی، پیار و محبت کی پینگیں بڑھاتی اور اپنی اپنی انانیت متاثر ہونے پر مکالمہ کرتی برجستہ روزمرہ و محاورات بولتی عورت

ہے۔ جس کی زبان میں معاشرے کے سارے رنگ موجود ہیں تہذیب کی ساری چاشنی موجود ہے، زبان و بیان کے سارے ذائقے نمایاں ہیں اور مصنف کی زباندانی کی مہارت تو بلاشبہ ایک عالم تسلیم کرتا ہے۔

iv. امراؤ جان ادا: مرزا ہادی رُسوا

مرزا سودا نے "امراؤ جان ادا" کو ثقافت، زبان، کردار نگاری، منظر نگاری اور موضوع کے اعتبار سے وہ مقام عطا کیا کہ آج تک اردو زبان و ادب اس شاہکار کی عظمت و انفرادیت کے رطب السان ہیں۔ زبان و بیان اور خصوصا ثقافتی اور سماجی سطح پر مختلف حوالوں سے انھوں نے وہ خاص الفاظ مخصوص اصطلاحات اور محاورات برتے ہیں جو صرف لکھنوی تہذیب کی نسائی زبان کا ہی خاصہ ہیں۔

ڈاکٹر توحید خان کے بقول مرزا رسوا کا زمانہ متضاد کیفیات کا حامل تھا۔ اس وقت تہذیبی قدریں شکست و ریخت سے دوچار تھیں۔ ملکی تہذیب نزع کی کیفیت سے دوچار تھی اور اس دوران ادب بھی نئ کروٹیں لے رہا تھا،۔ ناول کا ابتدائی دور تھا۔ امراؤ ایک کلاسیکل ناول ثابت ہوا جس میں پہلی بار ایک طوائف کی زندگی کو موضوع بنایا گیا اور اس کی نفسیاتی گرہیں قاری کے سامنے لائی گئیں

ساجدہ زیدی کے مطابق

> "کلاسیکل ناول میں صرف ایک 'امراؤ جان ادا' ایسا ناول ہے جس میں رسوا نے ایک مکمل منفرد اور فعال عورت کا کردار پیش کیا ہے اور کس قدر جاذبیت سے پیش کیا ہے۔ کتنے جامع انداز سے وہ وجودی Predicament سے عہدہ براں ہوتی ہے۔ ایک ایسی عورت جس کی زندگی کی ابتدا ہی جبر، ظلم اور استحصال سے ہوئی ہے۔ کسی فن پارے کی زبان ہی اس کے کرداروں اور ماحولیاتی جذبات کا مجموعی تاثر پیش کرنے کا واحد ذریعہ ہوا کرتی ہے اور مرزا رسوا اس فنی کمال سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے زمیں سے جڑے، ثقافت و تہذیب میں گندھے، زبان و اظہار سے اپنے مجوزہ کردار کے تقاضے نبھاتے زندہ اور حقیقی کردار پیش کئے۔"[۱۱۴]

مرزا رسوا نے "امراؤ جان ادا" کے مکالموں اور زبان پر خصوصی توجہ دی اور بہت جاندار مکالمے، بہت برجستہ فقرات اور بہت برمحل محاورات اور لکھنوی تہذیب سے عین مطابقت رکھنے والے بلیغ و جاذب اسلوب بیاں کو اس مہارت سے برتا کہ تحریر زندہ ہو کر تصویر بن جاتی ہے اور تصویر اپنے منظر کی متعلقہ منظر نگاری میں پہنچ کر بولنے لگتی ہے۔ قاری خود کو اس ماحول اور ان مباحثوں کے ساتھ ساتھ ان خلوتوں اور اُن

محسوسات کا بھی عینی شاہد تصور کرنے لگتا ہے اور یہی مرزا سودا کے زبان و بیان کا جادو ہے۔ امراؤ کہتی ہے کہ "آپ مجھ سے کیا چھیڑ چھاڑ کے پوچھتے ہیں مجھ بد نصیب کی سرگزشت میں ایسا کیا مزہ ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد، نامراد آوارہ، خانماں برباد، ننگِ خاندان، عارِ دوجہان کے حالات سن کے مجھے ہرگز یہ امید نہیں کہ آپ خوش ہونگے۔" مرزا رسوا کا یہ جادو نہ صرف "امراؤ جان ادا" بلکہ "شریف زادی"، "اختری بیگم" اور "ذات شریف" میں بھی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر توحید کہتے ہیں: "مرزا رسوا کو زبان و اظہار پر بڑی قدرت حاصل تھی ان کی زبان عام فہم، سلیس اور شستہ ہے۔ جس میں شوخی، متانت، بے ساختگی، ادبیت سب کچھ نہایت لطیف ہم آہنگی کے ساتھ شامل ہے۔"(۱۱۵)

عورت اور مرد کی زبان میں ایک بہت بڑی تفریق ہوتی ہے اور ایک ہی زبان بولنے والے ایک ہی جگہ یا مقام سے تعلق رکھنے والے مرد و عورت کے لب و لہجے اور الفاظ کے چناؤ کا فرق انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔ عورت کے ہاں لچک کا حسن ملتا ہے نرمی اور حلاوت ملتی ہے۔

> "لوسی اری گیرے یہ مان کر چلتی ہیں کہ مردوں کے مقابلے پر عورتوں کی ایک زبان ہوتی ہے اور جس کی خصوصیات ذکر مذکورہ Phalloceric زبان کی ضد پر قائم ہوتی ہے۔ لوسی اری گیرے کے مطابق اس زبان میں قدرے تنوع پایا جاتا ہے۔ مردانہ زبان میں راست پن، جلابت اور دبازت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ جب کہ نسائی زبان ڈھلنے اور ڈھالنے کی خوبی سے متصف ہوتی ہے۔"(۱۱۶)

"امراؤ جان ادا" بلاشبہ اردو زبان و ادب میں نسائی زبان و انداز بیاں کی صداقتوں کا شاہکار نظر آتا ہے۔ قاری اس اسلوبیاتی ندرت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سید وقار عظیم اس ناول کو اردو زبان کا پہلا ناول مانتے ہیں جس میں زندگی اور فن ایک دوسرے سے قدم بہ قدم ساتھ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔ اور زندگی جس طرح ایک عام انسان کو متاثر کرتی ہے اسی طرح اس ناول کے کرداروں میں بھی وہی اسلوک اور وہی تاثراتی صداقت نظر آتی ہے جو ہم سوچ سکتے ہیں۔ یوں زندگی کے حقائق سے جڑی یہ افسانوی تحریر نسائی جذبات کی عکس بندی اور اسی مخصوص اظہار کے ساتھ متاثر کرتی ہے۔ یہاں ہمیں کوئی کردار مثالی کردار کے طور پر نہیں ملتا۔ ہر کردار کی زبان اور الفاظ کا انتخاب اس کی حیثیت اور اس کے مقام کی چغلی کھاتا نظر آتا ہے۔ علی عباس حسینی نے بھی اس ناول کو شاہکار قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس پر اردو زبان جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔ علی عباس حسینی، ناول اور ناول نگار میں لکھتے ہیں کہ مرزا ایک جامع الصفات شخص تھے۔ ادب،

شاعری، ریاضی، موسیقی، کیمیا، طبیعات، ناول، نفسیات، فلسفہ، الٰہیات، مذہب میں گہری دلچسپی تھی۔ اور ان پر بھرپور گرفت حاصل تھی۔

اس ناول کا قاری جانتا ہے کہ اس ناول میں نہ صرف لکھنوی معاشرت پر ہی ارتکاز کیا گیا بلکہ انسانی جذبات و محسوسات کو جن الفاظ کے پیرائے میں پیش کیا گیا وہ کس قدر حقیقی اور کس قدر فطری نظر آتے ہیں خصوصا ہر زبان اپنے عہد کی زندہ تماثیل و تراکیب کا مرکب نظر آتی ہے امراؤ سے لے کر خانم جان تک اور نسیم اللہ سے لے کر خورشید تک سبھی نے اپنی اپنی شخصی انفرادیت کے ساتھ اپنے الفاظ کے چناؤ اور استعمال کو بھی سہارا بنایا ہے اور بلاشبہ وہی استعارات وہی تشبیہات اور وہی دعائیں اور وہی طعنے اور بد فعالیں اور شکوک و گماں کے اندیشوں میں گندھی زبان اور لہجوں کی کپکپاہٹ اردو زبان کے دامن کی وسعت کی غمازی کرتی ہے اور بلاغت کی گواہی دیتی ہے۔ ناول کے ابتدا سے ہی قاری جب امراؤ جان ادا کی زبان سے سنتا ہے کہ کس طرح ایک تہذیب یافتہ طوائف اپنی بابت کس مثالی لکھنوی زبان و لہجے سے مخاطب ہے تو اس کے لگاوٹ اور بناوٹ کے طرز بیان کا شیدائی ہو جاتا ہے۔

رسوا نے اپنے کرداروں کو زندہ، حقیقی اور روایتی رنگ دینے میں سب سے بڑی تکنیک زبان کی اپنائی اور ہر کردار کے منہ سے وہ زبان بلوائی جو اس کی حیثیت اور جذبات کی سچی عکاسی کر رہی تھی۔ کہیں پر بھی رسوا بطور ناول نگار یا مصنف اپنی بولی بولتے نظر نہیں آئے۔ ہر جگہ کردار خود اپنی ذات کا اظہار کر رہا ہے خود اپنے جذبات و حالات کی عکاسی کر رہا ہے۔ خانم کا مضبوط کردار تراشنے میں اس کی زبان اور اندازِ فکر ہی ہے جو کہ قاری کو اس کی مجسم تصویر دکھاتا ہے۔ طعنے، کوسنے اور "کم بخت"، "موئے" جیسے الفاظ صرف خواتین ہی استعمال کرتی ہیں اور نسائی زبان کے ایسے بہت سے حوالے ہمیں اس ناول میں ملتے ہیں۔

> " ٹانگوں میں لال گلبدن کا پائجامہ چھوٹے چھوٹے پائچوں کا، ٹول کا نیفہ، نینوں کی کرتی، تنزیب کی اوڑھنی، ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی نتھنی اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں، کان ابھی تازہ چھدے تھے ان میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے کی بالیاں بننے کو گئی تھیں۔ خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے ماں باپ کا کیا حال ہو گا، خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں۔ ذرا بھی خوفِ خدا نہیں۔ بوا حسینی ہم جیسے لوگ بالکل بے

قصور ہیں۔ عذاب ثواب انہی موؤں کی گردن پر ہوتا ہے ہم سے کیا، آخر یہاں نہ بکتی تو کہیں اور بکتی۔" (۱۱۷)

امراؤ جان ادا میں برصغیر کی روایتی توہم پرستی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ چونکہ توہمات کا زیادہ تعلق خواتین کی زندگی اور حالات سے اور خواتین ہی اپنی کم عقلی کے باعث سنی سنائی روایات پر زیادہ عقیدہ رکھتی ہیں۔ ان کے ہاں بعض گناہ اور ثواب کے تصورات بعض اوقات مضحکہ خیز صورت حال اختیار کر لیتے ہیں۔ ہادی رسوا نے توہم پرستی کو اس ناول میں اس طرح شامل کیا ہے کہ معاشرے میں جادو ٹونہ کرنے والے اور بھولی بھالی کم علم خواتین سے پیسہ لوٹنے والے کرداروں کو بے نقاب کیا ہے۔ "ڈبل شاہ" ٹائپ کے کردار آج کے جدید دور میں متعارف نہیں ہوئے ان کے حوالے سو دو سو سال پہلے بھی ایسے ہی مقبول تھے۔ ایک ایسے ہی شاہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہ شاہ صاحب چیزوں کو ڈبل کر دینے کے حوالے سے مشہور تھا۔ لکھتے ہیں:۔

"وہ ایک کے دو کر دیتے ہیں۔ خورشید نے اپنے کڑے اور کنگن کی جوڑیاں اتار دیں۔ شاہ صاحب نے ایک کوری ہانڈی منگوائی، اس میں سیاہ تِل بھروا دیئے، کڑے، کنگن ہانڈی میں رکھ کر چینی ڈھانک دی، شال باف کا ایک پارچہ گلے میں باندھ ناڑے سے باندھ دیا۔ شاہ صاحب روانہ ہو گئے اور چلتے چلتے کہہ گئے کہ آج نہ کھولنا، کل صبح کھولنا مرشد کے حکم سے ایک کے دو ہو جائیں گے۔ صبح کو ہانڈی کھولی گئی کالے تِلوں کے سوا کچھ نہ ملا۔"(۱۱۸)

داستانوں سے اپنے سفر شروع کرنے والی نسائی زبان اپنے عروج وزوال کا سفر طے کرتی ہوئی کہیں زمرد کی صورت میں فرقہ باطنیہ کا خاتمہ کرتی نظر آتی ہے تو کہیں تعلیم وتربیت کی کمی کی وجہ سے اکبری بن کر ماحول میں بگاڑ کا سبب بنتی ہے اور یہ ہی نسائی کردار کہیں اصغری کی شکل میں گھر کو جنت بناتی ہے یہ ہی نسائی کردار جب ہم امراؤ کی صورت میں قریب سے دیکھتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے جیسے وقت سے پہلے گھونسلے سے گرنے والا پرندے کا بچہ کبھی کامیاب نہیں ہو پاتا اسی طرح اپنی دہلیز کو وقت سے پہلے کسی بھی حالت میں پار کرنے والی عورت کبھی مکمل ٹھکانے کی حقدار نہیں ٹھیرتی اگرچہ وہ سارے معاشرے میں پسند بھی کی جاتی ہو وہ علم و ہنر میں یکتا ہی کیوں نہ ہو وہ معاشرے کے لیے علم و ہنر اور فن موسیقی کے لیے ایک سکول کا درجہ ہی کیوں نہ رکھتی ہو وہ گفت وشنید میں اور رکھ رکھاؤ میں شائستگی کا نمونہ ہی کیوں نہ ہو۔

محمد افضال بٹ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

" طوائف کے وسیلے سے انھوں نے کوٹھے کے محدود ماحول کے ذریعے ایک ایسی زندگی کا نمونہ پیش کیا ہے جہاں معاشرتی حقیقتوں کی جھلکیوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی کڑواہٹ، رومان اور دردناکی کے پہلو بھی ہیں۔"۔ (۱۱۹)

رسوا کے ہاں زبان کو خاص اہمیت حاصل ہے سلاست و سادگی ان کے پیش نظر رہتی ہے مشکل اور دقیق الفاظ نہ ہونے کے برابر ہیں ان کے ناولوں کا پس منظر علمی گھرانوں سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ایک تہذیب تمدن شائستگی اور رکھ رکھاؤ نظر آتا ہے اردو زبان کی شیرینیٔ بدرجہ اتم موجود ہے۔ مرزا رسوا کے ناولوں میں دیکھا جائے تو اس بات کا خاص اہتمام نظر آتا ہے کہ نسائی لب ولہجہ کو بیان کرتے ہوئے اس کی فطری لطافتوں اور نزاکتوں کو بیان کرنے کے لیے ایسے ایسے محاورات اور جملے لکھے گئے جو صرف گھریلو خواتین سے منسوب ہیں نسائی فطرت کی گرہ کشائی بڑے نستعلیق انداز میں کی گی ہے ان کے نسائی لب ولہجہ میں ماحول کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ایک طوائف کی زبانی اتنی شائستگی اتنا وقار جھلک رہا ہے کہ قاری کو پہلے ہی تعارف میں لکھنو کی طوائف کے لہجے کے رکھ رکھاؤ اور تہذیب و تمدن کے اعلی نمونہ ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔

امراؤ اپنے بچپن کی یادیں بتاتے ہوئے جہاں اپنے بھائی کا ذکر کرتی ہے اس کے لہجے میں بھائیوں کے ساتھ بہنوں کی فطری محبت اور حسرت بھرا لہجہ با آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے وہ بہن پھر اپنے بچپن میں کہیں کھو گئی ہے۔ ہماری برِ صغیر پاک وہندی تہذیب میں بہنیں اور وہ بھی خاص طور پر بڑی بہن کا کردار بہت ممتا بھرا ہوتا ہے۔ والدہ کے بعد بھائیوں کا سب سے زیادہ خیال بہنیں ہی رکھتی ہیں۔ انھیں اپنے بھائیوں کا بڑا مان ہوتا ہے شادی ہو جانے کے بعد وہ اپنے بھائیوں کو اپنے میکے کا مان اور شان گردانتی ہیں۔ بھائی بھی بہنوں کی لاج تاحیات نبھاتے ہیں اور ان کے لیے والد کا سا سایہ اور شفقت کا کردار نبھاتے ہیں، بہت سے لوک گیت ہماری مقامی بولیوں خاص طور پر پنجابی اور ہندی میں ایسے موجود ہیں جو بہنیں بھائیوں کی شادی پہ گاتی ہیں جیسے: دیساں دا راجہ میرے بابل دا پیارا

امبڑی دے دل دا سہارا

نی ویر میرا گھوڑی چڑھیا،

بہنوں کو بھائیوں کی شادی کا ایسے ہی ارمان اور شوق ہوتا ہے جیسے ماں کو، بھائی عمر میں چھوٹا بھی ہو تو اسے بڑا سمجھا جاتا ہے اور اس کا رعب بہنوں پر قائم رہتا ہے۔ امیرن بھی اپنے اغوا سے قبل اپنے چھوٹے بھائی

کو اٹھائے اٹھائے گھوما کرتی تھی۔ اپنے ساتھ کھلاتی تھی۔ کوٹھے پر پہلی بار لائے جانے پر امیرن خانم کو دیکھتی ہے اور اس کی شخصیت کے رعب و دبدبے سے متاثر ہوتی ہے اسے عمر کے آخری حصے تک بھی وہ پہلے دن کا خانم کا حلیہ نہیں بھولتا۔

"کیا طرح دار بڑھیا تھی رنگ تو سانولا تھا مگر ایسی بھاری بھر کم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی بالوں کے آگے کی لیٹیں بالکل سفید تھیں مگر ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں ململ کا سفید دوپٹا کیسا باریک چنا ہوا۔۔۔ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے کلائیوں میں پھنسے ہوے۔"(۱۲۰)

کوٹھوں میں رہنے والی خانم قسم کی عورتیں جہاں ایک طرف پیسے کی لالچی جوان لڑکیوں کے لیے سخت دل دکھائی جاتی ہیں تو وہیں ان کی بے بسی ان کی نرمی اور ان کی محبت بھی یوں دکھائی دیتی ہے۔ یہ کاروبار چونکہ خانم کی پہچان ہے اور ایک طوائف معاشرے میں جب ایک بار طوائف بن جاتی ہے تو اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی مقام نہیں رہ جاتا اس لیے خانم یہ کہہ کر بھی اپنے دل کو تسلی دیتی ہے کہ ہم لوگ تو بالکل بے قصور ہیں عذاب ثواب انہی موؤں کی گردن پر ہوتا ہے۔ ایک طوائف ہوتے ہوئے بھی ہمیں بوا حسینی کے لب و لہجے اور رویے میں اس وقت بھی ماں کی مامتا اور شدید محبت نظر آتی ہے جب امراؤ کوٹھے میں پہلی رات گزارتی ہے اور رات بھر خواب میں اپنے والدین کو دیکھتی ہے جیسے نئی دلہن اپنے سسرال جا کے سمجھ لیتی ہے کہ یہاں ایک دو دن کے لیے نہیں بلکہ مرنے اور بھرنے کے لیے آئی ہے ٹھیک وہی میرا حال تھا۔ ہم یہاں امراو کے لب و لہجے میں ایسا درد محسوس کرتے ہیں جو ایک عورت کے دل میں ماں باپ کا گھر چھوڑتے ہوئے ہوتا ہے کہ انھیں سسرال میں مرتے دم تک ہی روز چاہے مرنا جینا ہی کیوں نہ پڑے ہر حال میں انھیں گزارا کرنا ہوتا ہے یہ جملہ ایک عام عورت کی زبان کا ہو یا طوائف کا ہمیں مشرقی روایت کی پاسداری کرنا بتاتا ہے کہ مشرقی عورت کے ذہن و دل میں یہ بات بچپن سے ڈالی جاتی ہے کہ اس کا اصل گھر صرف اس کا سسرال ہوتا ہے وہاں ستی کی جائے یا جلا کر ماردی جائے یا سوتن کا دکھ سہے یا بچے پیدا کرتے ہوئے شہید ہو جائے خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہوگا کس قدر وسیع تھا کتنے کمرے تھے ان سب میں رنڈیاں رہتی تھیں۔

ایک اور بات قابلِ ذکر ہے نسائی زبان کے حوالے سے کہ مرزا ہادی رسوا نے کہیں کہیں امراؤ سے ایسے جملے بھی کہلوائے ہیں جو روایتی عورت عام طور پر اتنی معرب و مفرس زبان استعمال نہیں کرتی۔ مگر چونکہ

امراؤ کی تعلیمی و ادبی تربیت بطور طوائف ہوئی تھی اس لیے اس کے کردار میں ادبیت کی شان اور علمیت کی تمکنت بھی موجود تھی۔ اس پر وہ شعر بھی کہتی تھی۔ جب امراؤ دو دن سے بھوکی ہوتی ہے اور مولوی صاحب کہتے ہیں کہ میرا شاگرد کھانا لاتا ہی ہوگا آپ اس میں سے کھالینا تو وہ جواب دیتی ہے کہ کہ وہ تو آپ کی قوتِ لایموت کے لیے بھی کافی نہ ہوگا میری شرکت چہ معنی اور من وجہ کفالت بھی کرتے تو لا انتظار اشد من الموت کا انتظار ہے تا تریاق از عراق آوردہ شود۔ یہ گفتگو امراؤ کی اصطلاحاتِ علمیہ سے واقفیت کی دلیل ہے

اسلوب احمد انصاری " اردو کے پندرہ ناول" میں لکھتے ہیں: "امراؤ جان ادا کا محاورہ، گفتگو، رواں دواں اور جست خیز ہے۔ اس کی حاضر جوابی کی کاٹ مشکل سے کی جاسکتی ہے کہ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے وہ اپنے جملوں سے پے در پے مولوی صاحب کو پسپا کر کے چھوڑتی ہے۔"[۱۲۱]

ہادی رسوا نے نسائی فکر و عادات کو بھی بخوبی ناول میں سمویا ہے۔ چونکہ خانم کے کوٹھے پر طوائفوں کی تمام کمائی خانم کے پاس جمع ہوتی تھی اور گاہک جو بھی انعام و تحائف دیتے تھے وہ سب خانم کے پاس ہی چلے جاتے تھے، ایک جگہ جب امراؤ کو مرزا صاحب کی طرف سے پانچ اشرفیاں چمکتی دمکتی بطور تحفہ ملتی ہیں تو اس کو وہ بہت پسند آتی ہیں ان کو ہتھیلی پہ رکھ کے سوچتی ہے کہ انھیں اپنے پاس کہیں چھپالے۔ تب وہ پلنگ کے پائے کے نیچے دبا دیتی ہے تاکہ کسی کو معلوم نہ پڑے۔ امراؤ اپنی زبانی خود کئی جگہ پر نسائی عادات و خصائل کا تذکرہ کرتی ہے جیسے وہ بتاتی ہے کہ ہر عورت کو اچھے لباس اور زیورات کی فطری خواہش ہوتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ وہ سجی سنوری رہے اس کے حسن کو سراہا جائے۔

بوا حسینی مخصوص لہجے میں "موا" اور "نوج" جیسے الفاظ استعمال کیا کرتی امراؤ جان ادا بچپن سے جوانی کی حدوں میں قدم رکھتی ہے اپنے اندر کچھ نفسیاتی تبدیلیاں بھی محسوس کرتی ہیں اس عمر کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اپنی اس کیفیت کو وہ بھی سمجھنے سے قاصر ہے ایک کم عمر لڑکی ہونے کی وجہ سے اس کے دل میں بھی چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا بیدار ہونے لگتی ہے اس عمر کا فطری تقاضا ہے۔ امراؤ کا یہ کہنا کہ میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے مجھے چاہیں اور سب پہ مرنے والے مجھ پہ مریں نہ کسی کی طرف انکھ اٹھا کر دیکھیں نہ کسی پر جان دیں۔

بسم اللہ جب جھلا کے کہتی ہے کہ یا اللہ! کوئی چوروں سے بہوا رہے میں تمہارے کڑے کچھ کھانہ لو گی اس وقت میرے ہاتھ میں ساوی پڑیاں پڑی ہوئی ہیں اماں جان سے چھپ کہ جاتی ہوں ان سے کڑے مانگوں گی تو کیا کہیں گی کیا کرو گی اس لیے ذرا ہاتھ میں ڈال لیے صبح لے جانا۔ بسم اللہ کے جانے کے بعد

مجھ سے کہا دیکھا بہن! یہ بڑا قابوچی ہے نواب کا گھر اسی موذی نے تہس نہس کیا میں مدت سے اس موئے کی تاک میں تھی آج ہی تو داؤ چڑھا ہے یہ کڑے میں اس کو کب دیتی ہوں، کر ہی کیا سکتا ہے چوری کا مال ہے بسم اللہ میاں حسن نے روپے دیے تھے اور جب بڑے نواب نے پوچھا تو کیسا مکر گیا اگر یہ کچھ زیادہ ٹھر پھس کریں گے تو ان کو کوتووالی کا چبوترا دیکھاؤں گی"

عورت جب مدر سری نظام سے نکل کر پدر سری عہد میں داخل ہوئی تو اس کی سماجی حیثیت اور مقام بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ جائداد اور اولاد کے ساتھ یہ بھی ملکیتِ مرد میں آکر ایک قابلِ استعمال چیز بن کر رہ گئی جو دیگر زندگی کے وسائل جیسے جنگلات، زمیں، طاقت، افرادی قوت اور دوسروں سے سبقت کا احساس دلانے والے عناصر کی طرح سمجھی جانے لگی۔ اسے بچے پیدا کر کے اپنی افرادی قوت بڑھانے کا ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ اسے گھروں میں قید کیا جانے لگا اس کی مرضی اور پسند کو معاشرے کے لیے غیر اہم معاملہ قرار دیا جانے لگا۔ تب حرمت کے تصور کو قیدی عورت سے مشروط کیا جانے لگا۔ آزاد عورت صرف طوائف کہلائی۔ زبان بھی اس سفر کے ساتھ ساتھ کروٹیں لے رہی تھی۔ انسانی رشتوں کی قیمتیں مقرر ہونے لگیں۔ جسم کی منڈیاں سجنے لگیں، جسم فروشی کا پیشہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین پیشوں میں شامل ہے۔ زاہدہ حنا لکھتی ہیں:

> "بازارِ حسن پدر سری سماج کا جزولازم ہے اور اس بھیانک تضاد کا مظہر ہے جو معلوم تاریخ سے آج تک پدر سری سماج میں پایا جاتا ہے وہ مرد جو اپنی عورت کو سات پردوں میں رکھتا ہے اور اپنے نسائی رشتوں کی حرمت کے لیے جان دے دیتا ہے وہی بازار حسن کی سیڑھیاں چڑھ کر عورت کی عظمت وعفت کو سکوں سے خرید تا نظر آتا ہے پدر سری خاندان کا یہ پہلو ہمیں اردو کے ناول "نشتر" میں نظر آتا ہے جس میں اٹھارویں صدی کی مسلمان طوائف کا نقشہ کھنچا گیا ہے اسی موضوع کو کمال ہنر فن سے مرزاہادی رسوانے "امراو جان ادا" میں برتا اور انیسویں صدی کے برصغیر میں عورت اور مرد کا یہ تعلق ہمیں جذیات کے ساتھ دکھایا پدر سری نظام طوائف کے ساتھ کیا برتاو کرتا ہے وہ ہمیں "امراؤجان ادا" کے آئینے میں نظر آتا ہے "[۱۲۲]

لکھنو کے ماحول میں محرم کی جو مجالس اور تقاریب کا اہتمام ہمیں ملتا ہے اور جس کا تذکرہ اس سے پیشتر کے افسانوی، تاریخی اور ثقافتی ادب میں موجود تھا وہ ہمیں اس ناول میں بھی ملتا ہے، فسانہء عجائب سے لے کر فسانہء آزاد تک اور بعد ازاں گزشتہ لکھنو اور واجد علی شاہ کے عہد کی تحاریر میں بھی محرم الحرام کے دنوں کو

خاص اہتمام سے منانے کا ذکر مکمل تفصیلات کے ساتھ موجود ہے۔ اس ناول میں بھی مرزا ہادی رسوآنے خانم کے کوٹھے کی طوائفوں کا اہتمام اور مجالس کا ذکر کیا ہے۔ تعزیہ داری کی تیاریاں اور محتاجوں کی امداد اور نذر نیاز کا تذکرہ موجود ہے۔ اس کے حوالے سے وہ لکھے ہیں:

> "خانم کی تعذیہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کے تھی۔ امام باڑہ میں پٹکے، شیشہ آلات جو شے تھی نادر تھی۔ عشرہ محرم میں دس روز تک مجلس ہوتی تھی۔ عاشورہ کے دن سیکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ کشی کی جاتی تھی، چہلم تک ہر جمعرات کو مجلس ہوتی تھی۔" (۱۲۳)

دراصل عورتوں کی زبان لکھنے کے لیے خاص نفسیاتی سوجھ بوجھ بھی درکار ہوتی ہے ایک جذباتی سطح پر جا کر عورت کے دل اور عورت کی آنکھ سے محسوسات کے جہان کو محسوس کرنا پڑتا ہے تب نسائی الفاظ قلم کی نوک پر آتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری "اردو کے پندرہ ناول" میں لکھتے ہیں کہ مرزا ہادی رسوا نے ایک عورت کے فطری لب و لہجے کو رقم کیا ہے کہیں بوا حسینی کے خارجی لبادے کے پیچھے ممتا بھری ایک حقیقی عورت موجود ہے جو بڑے پیار اور دلار سے امیرن کو سمجھا رہی ہوتی ہے کہ آج کے بعد سے جب کوئی اُمراؤ کہہ کر پکارے تو تم نے کہنا ہوگا 'جی" ایسی نرمی اور حلاوت کے ساتھ بچی کو سمجھانے کا انداز عین فطری لگتا ہے۔ اسی طرح جب اُمراؤ اپنی اوائل جوانی کے دنوں کو یاد کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ کیسے اس کے اندر نسوانیت اور نرگسیت کے احساسات نمو پانے لگتے ہیں اور کیسے وہ اپنے اردگرد موجود رومانوی ماحول کے رنگ میں رنگنے لگتی ہے۔ اس موقع پر امراؤ کا یوں بتانا کہ بسم اللہ جان کی چوٹی نواب چھپن گوندھتے یا جب دیگر طوائفیں سجتی سنورتی تھیں تو میں رشک اور حسد کے مارے جلنے لگتی، ہادی رسوا امراؤ کی زبان سے کہلواتے ہیں کہ "عورت کو عورت سے جو رشک ہوتا ہے اس کی انتہا نہیں ہے، سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔۔۔ میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے مجھی کو چاہیں اور سب کے مرنے والے مجھی پر مریں۔

یہ تمام نسائی جذبات ایک عورت ہی محسوس کر سکتی ہے اور مرزا ہادی رسوا نے جس خوب صورت پیرائے میں نسائی زبان سے یہ کہلوائے ہیں ان کی مثال نہیں ملتی۔ ایک عورت جو طوائف ہونے کی وجہ سے معاشرے کی نفرت کی حقدار ہونی چاہیے تھی جیسا کہ زمانے کا دستور ہے کہ عورت کی عصمت ہی اس کا سب سے قیمتی اثاثہ سمجھی جاتی ہے اس کو لوٹنے اور نوچنے والے مرد پدرسری نظام میں ہمیشہ معزز و معتبر کہلواتے

آئے ہیں آج بھی معزز ہیں اور شرفاء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مگر عورت معتوب قرار دی جاتی ہے قابلِ نفرت اور ذلیل ہے کیونکہ وہ جسم کی جنس کو بازار میں بیچ کر رزق کماتی ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہی عورت جب امراؤ کے روپ میں مرزاہادی رسوا کے قلم کا شاہکار بن کے ابھرتی ہے اور اس کی نسائی زبان اس کی مظلومیت کو بیان کرتی ہے تو ہمیں اسی طوائف سے ہمدردی محسوس ہونے لگتی ہے۔

۷۔ فردوسِ بریں: عبدلحلیم شررؔ

مولوی عبدالحلیم شرر اُردو کے اولین تاریخی ناول نگار ہیں۔ وہ نہ صرف ناول نگار تھے بلکہ ایک عظیم مؤرخ، ڈرامہ نگار، اور ادیب بھی تھے۔ شرر نے اسلامی تاریخ کا انتہائی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اور انتہائی صاف اور سادہ الفاظ میں بھی واقعات کو انتہائی خوبصورتی سے دلچسپ بنادیا۔ فردوس بریں بھی ان کے تقریباً آخری ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ جس کا پلاٹ ایران میں دکھایا گیا ہے۔ اُس وقت جب جبال طالقان اور التمونت میں باطنیوں کا، (جنھیں اسماعیلی بھی کہتے ہیں) اُن کا بہت زور تھا اور لاکھوں نیک و برگزیدہ ہستیاں ان کے ظلم کا نشانہ بنی، اور اُن کے اور اُن کے فدائیوں کے خنجر سے ماری گئیں۔

یہ لوگ چونکہ باتوں کے دھنی، انتہائی باکمال گفتگو اور فلسفانہ تقاریر اور پر تاثیر لب و لہجے میں ماہر تھے۔ اور اپنی چرب زبانی سے سادہ و بے وقوف لوگوں کو اپنا اس طرح گرویدہ بناتے تھے کہ وہ ذہنی و جذباتی طور پر ان کے یرغمال بنے رہتے تھے۔ اور اُن کے ایک اشارے پر بغیر سوچے سمجھے قتل و غارت کرتے تھے۔ جیسا کہ فردوس بریں میں بتایا گیا کہ ان کے بادشاہ نے پہاڑوں میں ایک جنت بنارکھی تھی۔ اور اس جنت میں وہ سب سامان موجود تھا جو مسلمان اپنے نیک اعمال کے نتائج میں حاصل کرنے کا یقین رکھتے تھے۔

وہ ایک بھنگ کے طرز کی بوٹی جس کو حشیش کہتے ہیں پلا کر اور بے ہوش کر کے جدھر چاہتے لے جاتے۔ اور جنت کا نام دے کر انھیں مختلف خوبصورت مقامات کی سیر کرا کے اپنا گرویدہ بنالیتے۔ فرقہ باطنیہ کے راستے میں جو جو بھی آتا اس کو اپنے فدائیوں سے قتل کراتے گئے۔ اور ایسے سادہ و احمق لوگوں کا اپنے گرد ایک وسیع حلقہ جمع کر لیا۔

یہ تو فردوس بریں کا ہلکا سا تعارف ہے۔ لیکن ہمارا اصل موضوع فردوس بریں کی کہانی نہیں ہے۔ بلکہ اس ناول میں موجود نسائی زبان و محاورہ ہے۔

یہ چونکہ ایک تاریخی حقیقت پر مبنی ناول ہے۔اس لئے اس میں دِلی و لکھنؤ کے قصہ کہانیوں کی طرح مصنف کا مقصد محاورہ و زبان پر ہنر مندی دکھانا نہیں بلکہ ایک تاریخی حقیقت اور اس کے انجام کو دکھانا ہے۔۔لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ یہ ناول دو بنیادی کرداروں،زمرد اور حسین سے شروع ہو کر اُنھیں پر ختم ہوتا ہے۔

حسین، جس کی ابتدا جوانی ہے ایک خوبصورت نوجوان ہے۔یہ ایک اونی کفتان پر بڑا پوستین کالباس پہنے ہے۔ سر پر تریم لمبی ٹوپی ہے۔جو بانس کی تتلیوں سے ایک مخروطی صورت میں بنا کر بکری کی سیاہ کھال سے منڈھ دی گئی ہے۔ٹوپی پر عمامہ ہے۔اور اس کے کئی پیچ سر سے نیچے اُتر کر کانوں اور گلے میں بھی لپٹے ہیں۔پاؤں میں موزے اور ایک پاجامہ ہے۔کمر میں چمڑے کی پیٹی ہے۔جس میں خنجر لگا ہے۔اور تلوار لٹک رہی ہے۔اور اس نوجوان کے پاس تیروں کا ترکش بھی ہے۔اور یہ نوجون ایک گدھے پر سوار ہے۔

جبکہ دوسرے گدھے پر ایک اٹھارہ اُنیس برس کی پری جمال ہے۔موٹے موٹے کپڑے اور بھاری پوستین اس کے ظاہری فریب حسن کو بہت کچھ چُھپا رہے ہیں۔ مگر ایک باہوش کی شوخ ادائیں کہیں چھپاتے چھپتی ہیں، جس قدر چہرہ کھلا ہے۔حسن کی شعاعیں دے رہا ہے۔اور دیکھنے والے کی نظر کو پہلا ہی جلوہ یقین دلا دیتا ہے کہ ایسی نازنین و حسین پھر نظر نہ آئے گی۔یہ آفت روز گار مہ جبین ایک زرد ریشمی پائجامہ پہنے ہے۔جو اوپر سے نیچے تک ڈھیلا،اور پاؤں کے گٹوں پر خوشنما چنٹ کے ساتھ بندھا ہے۔گلے میں دیبائے سرخ کا ایک کرتا ہے اور سر پر نیلی پھولدار اطلس،جو چیز کہ اُس کے عورت ہونے کو عام طور پر ظاہر کر رہی ہے وہ چھوٹی چھوٹی سیکڑوں چوٹیاں ہیں جو خمار کے نیچے سے نکل کر ایک شانے سے دوسرے شانے تک ساری پیٹھ پر بکھری چلی گئی ہیں۔اور راستے کے نشیب و فراز یا گدھے کی تیز روی سے بار بار کُھل جاتی ہیں۔

اس لباس و حلیے کے ساتھ ساتھ اس دوشیزہ کے حسن کی پوری تصویر کھینچی گئی ہے۔

"سرخی کی جھلک دینے والے گال،بڑی بڑی شربتی آنکھیں،نوکدار پلکیں،بلند پیشانی،مگر کسی قدر پھیلی ہوئی نازک اور خمدار ہونٹ،باریک اور پھیلی ہوئی باچھیں،چھوٹے سے سانچے میں ڈھلی ہوئی نوکدار ٹھوڑی شرمگیں اور معمولاً جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ شوخ اور بے چین چشم و ابرو۔"(۱۲۴)

عموماً قصے کہانیوں، میں ہیر وئنوں کے حسن و جمال کی ایسی ہی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ لیکن یہاں پر چونکہ آگے چل کر اس نازک بدن لڑکی کو فرقہ باطنیہ والوں نے اپنی مصنوعی جنت کی حور بنا کر حسن کو استعمال کرنا تھا۔ اس لئے اس کے حسن میں حوروں کی ایک شبیہ بھی پیش کی گئی ہے۔ علی احمد فاطمی مزید لکھتے ہیں:

"وہ ایک ایسا دور تھا جب قاری کے ذہن کو داستانوی فضا سے نکال کر ناول کی حقیقی دنیا میں لایا جارہا تھا اس سے روشناس کرایا جارہا تھا ان حالات میں اس وقت کے ادیبوں کو خاصی دشواری اور الجھنوں کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا مسلم ناول میں عشق و محبت کے مضامیں بھی ہوتے ہیں ہیرو اور ہیروئن کے معاشقے کا بھی ذکر ہوتا ہے۔۔۔ شرر کا میدان تاریخ تھا اور ہر ناول میں عشق و محبت کے چرچے بڑے زور و شور سے کرتے تھے۔"(۱۲۵)

لڑکی اور نوجوان کی باتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں بلند مقصد اور پاکیزہ کردار کے حامل ہیں۔ اگرچہ گھر سے بھاگے ہوئے ہیں اور نوجوان حسینہ اس بات پر بے چین بھی نظر دکھائی دیتی ہے کہ وہ گھر والوں کے لئے رسوائی کا باعث بنے گی۔ لیکن یہ بھی سوچتی ہے کہ جلد رشتہ ازدواج میں جڑ جائیں گے۔ اور فریضہ حج بھی ادا کریں گے۔

"لڑکی : خُدا جانے کون لوگ کیا کیا باتیں کہتے ہوں گے اور کیسی رائیں قائم کی جاتی ہوں گی۔
نوجوان: یہی کہتے ہوں گے کہ حج کے شوق نے ہم سے وطن چھڑایا۔
لڑکی: مجھے الزام بھی دیتے ہوں گے کہ نامحرم کے ساتھ چلی گئی۔
نوجوان: اب میں نامحرم نہیں ہوں۔ دو چار ہی روز میں ہم قزوین پہنچ جائیں گے اور وہاں پہنچتے ہی نکاح ہو جائے گا۔(۱۲۶)

لڑکی یہ گفتگو ہمیں بتاتی ہے کہ کسی بھی ملک کی شہزادی ہو یا عام عورت، جہاں کہیں، کسی بھی شوق یا مجبوری سے نکلی، اُسے خود بھی اپنا ضمیر ملامت کرتا ہے کہ وہ والدین کی رُسوائی کا سامان بنی ہے۔ ایک نامحرم کے ساتھ ہے۔ یہاں بھی ہمیں کچھ ایسے ہی خیالات سے آگاہی ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی زمرد مُلاحدہ سے بھی ڈر کا اظہار کر رہی ہے۔ جبکہ اپنے راستے کی دشواریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جب حسین سے تکرار کر کے بھائی کی قبر پر جانے کی خواہش کرتی ہے تو ایک بہن کی محبت و

عقیدت دکھائی گئی ہے۔ اور بھائی کے مرنے کا حال بھی حسین کو بتاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب بھائی کی قبر پر اسکی طبیعت بگڑنے لگتی ہے تو وہ اپنے محبوب کے ساتھ بھی انتہائی محبت اور والہانہ عقیدت کا اظہار کرتی ہے۔ اور اُسے اپنے مرنے اپنے کے بعد واپس جانے اور اپنے کردار کی حفاظت کی منت کرتی ہے۔ اور اسی دوران پریاں جو کہ فرقہ اسماعیلیوں کی مصنوعی جنت کی نوجوان عورتیں تھیں آ گئیں اور ان کے ساتھ ہی زمرد غائب ہو گئی۔ اس کے بعد کی تمام ملاقاتیں صرف اور صرف زمرد کے خط تک محدود رہتی ہیں۔ لیکن در حقیقت اس پورے ناول کی جان زمرد ہی ہے۔ کیونکہ گھر سے حج کی غرض سے نکلنے تک سے لیکر حج تک جانے تک زمرد کا کردار انتہائی، پاکیزہ، جاندار، مضبوط، عقل و فہم اور تدبیر سے بھرپور دکھایا گیا ہے کیونکہ وہ مصنوعی جنت میں ہزارہا تکالیف کے باوجود بھی خود کو پاکدامن رکھتی ہے۔ جبکہ حسین بہت ہی سادہ دکھایا گیا ہے اور نہ زمرد ہی اپنے خطوں سے اُسے اصل حقیقت کی ہوا لگنے دیتی ہے۔ پروفیسر عبدالحسین اظہر رقم رکھتے ہیں۔: "شرر کے ہاں خطیب جیسا انداز تخاطب بھی پایا جاتا ہے اکثر اوقات وہ یہ جملہ استعمال کرتے ہیں اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں، ہم یہ کہہ چکے ہیں، ہم بقدر ضرورت بتا چکے ہیں، ہمیں یہ بھی بتا دینا چاہیے۔"(۱۲۷)

یہ انداز خالصتاً لکھنوی انداز کہا جا سکتا ہے اور دوسرے اس میں ایک خطیبانہ انداز بھی نظر آتا ہے جو ان کی تحریر کو مخصوص رنگ دیتا ہے اور اس طرز تحریر کے ساتھ یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنی بات جوش و خروش سے بیان کرنا چاہتے ہیں یا اپنی بات میں زور ڈالنے کے لیے جذباتی ہو جاتے ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو لکھنوی تہذیب میں اکثر اوقات میں "میں" کی جگہ "ہم" یا واحد کی جمع بولا جاتا ہے جیسے بیگماتی زبان میں ایک بھی روٹی پک رہی ہو تو کہا جاتا ہے کہ "روٹیاں پک رہی ہیں" ہم کچھ کہنا چاہتے ہیں، ہماری منشا یہ ہے، ہماری خواہش تھی کہ، ہم عرض کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یعنی اپنے لئے "میں" کے بجائے "ہم" کا لفظ استعمال کرنا لکھنوی تہذیب کا ایک خاص حصہ تھا جبکہ چوتھے باب میں مختلف مدارج طے کرتا ہوا جب حسین جنت پہنچ جاتا ہے۔ تو نازنین کی صورت میں ایک حور اُسے اپنی طرف متوجہ کرنیکی کی کوشش کرتی ہے اور کہتی ہے "وہ بھی مل جائیں گی۔ آپ کی خوشی کا یہ پیمانہ تنگ ہے۔ زرا ان سرحدی مسرتوں سے نگاہ اور دِل آشنا ہو تو ان سے ملئے گا۔ وہ سامنے جو موتی کا قصر ہے۔ وہ آپ ہی کے لئے ہے اور زمرد اسی میں ہے"(۱۲۸)

رام بابو سکسینہ نے ان کی افسانوی اور غیر افسانوی نثر کی تعریف کی ہے کہ ان کی افسانوی نثر سے زیادہ ان کی غیر افسانوی نثر کو سراہا ہے بابو سکسینہ کا کہنا ہے کہ شرر ہی نے در حقیقت وہ زبان استعمال کی جس کی نسبت سب کو اتفاق ہے کہ یہی جدید اردو ہے اور وہ زبان ہے جو فی الحال ملکی لٹریچر پر حکومت کر رہی

ہے۔ الطاف حسین حالی کا کہنا تھا کہ "روزمرہ کی پابندی محاورات کے درست استعمال کے ساتھ ہی جچتی ہے شرؔر نے روزمرہ اور محاورہ دونوں کا توازن برقرار رکھا ہے" (۱۲۹)۔ پروفیسر افضل حسین شرر کی نثر نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"شرر نے نہ صرف روزمرہ زبان کی پابندی کی ہے بلکہ محاوروں کو بڑی خوبصورتی اور برجستگی سے استعمال کیا ہے اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے اور محاورات کے بے جا استعمال سے کوئی فائدہ نہیں مگر شرؔر نے روزمرہ اور محاورہ دونوں کا پورا پورا خیال رکھا ہے محاوروں کا استعمال نہ صرف طرز تحریر کو معیاری اور دلکش بناتا ہے بلکہ اس سے مطالب کی توضیح میں بھی بڑی مدد ملتی ہے اس کے ذریعے اپنے طرز تحریر میں اختصار و جامعیت اور حسن پیدا کر دیا ہے" (۱۳۰)

زمرد کے اس لہجے میں ایک محبوبہ یا معشوقہ کی بجائے ایک انتہائی بہادر دور اندیش اور عقلمند خاتون کا کردار ادا کرتی ہے۔ جس کے لہجے میں محبت کی بجائے نصیحت، تنبیہ اور ہلکا سا دھمکی کا لہجہ ہے۔

چھٹے باب میں جب زمرد ایک خط کے ذریعے بلغان خاتون کا مرد کے لئے اور آخری معرکے کے لئے انتخاب کرتی ہے۔ اگرچہ اس معرکے میں ایک بڑے مقصد کے ساتھ ساتھ بلغان خاتون کے والد کے قتل کا بدلہ لینے کا ذاتی مفاد بھی چھپا ہے۔ جو کی ایک فدائی دیدار کے ہاتھ سے نہایت دغابازی سے قتل ہوا تھا۔ اور یہیں پر خاتون کو حسین کی سادگی بتا کر اپنا راز دار بناتی ہے۔

"مجھے تیرے رنج و الم سے ہمدردی ہے۔ اسی لئے اپنے منصب کے خلاف تجھے خبر دیتی ہوں کہ دیدار یہاں التمونت میں بیٹھا جنت کے مزے لوٹ رہا ہے۔ اگر آپ اپنے باپ کا انتقام چاہتی ہیں، اگر دنیا کے پردے سے ایک بہت بڑا فتنہ دور کرنا چاہتی ہیں تو اسی حسین کے ساتھ جو میرا خط لایا ہے۔ جو جنت کی زیارت کے شوق میں عقل و ہوش بلکہ دین و ایمان تک کھو چکا ہے۔ کوہالبرز کی وادی میں میری تربت پر آ۔ قبر کے پتھروں کو اُلٹ۔ اس کے نیچے میرا دوسرا خط پائے گی۔ جو تیری راہبری کرے گا۔ اور تو اپنے باپ کے انتقام کے ساتھ ایک بڑے طلسم کو توڑ کر دنیا کا سب سے بڑا راز کھولے گی۔" (۱۳۱)

زمرد کا یہ خط اور اس کا مضمون ثابت کرتا ہے کہ وہ کس طرح بلغان خاتون جو کہ ہلاکو خان کی بہن ہے۔ اور تاتاری کسطرح وحشت و بربریت اور ظلم و ستم میں مشہور ہیں۔ اور پوری دُنیا پر کس طرح ان کی

دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔اور کس طرح ہر قوم پوری پوری بستیوں کو تاخت و تاراج کرتی گزرتی تھے۔چونکہ شرؔر کی تحریروں میں مقصدیت بھی شامل تھی اور وہ بزرگوں کے ماضی کے کارناموں سے نئی نسل کو آشنا بھی کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے لفاظی کی طرف دھیان کم دیا اور واقعات نگاری پر زیادہ توجہ مرکوز کی۔اعجاز الرحمان لکھتے ہیں:

"شرؔر رومانی ادیب ہیں، تفکر و تعقل کے مقابلے میں جذبات کی شدت آتی ہے ۔دنیاؤں کا آباد کرنا،زندگی کے سنگین حقائق کے بجائے ماضی کی دھندلی دھندلی فضاؤں سے لَو لگانا، حسن اور عشق اور خاص کر عورت کے تصور سے حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی، رنج و غم کا شدید احساس، یہ وہ تمام خصوصیات ہیں جو ایک رومانی ادیب میں ہوتی ہیں۔ شرر پر اگر روایات کا اثر نہ ہوتا تو شاید ان کی رومانیت زیادہ نکھری ہوئی ہوتی۔اس لیے آل احمد سرورؔ نے لکھا شرر کے عاشقانہ اشعار اور ان کے مضامین میں ایک طمانیت ہے اور ان کے دلوں میں ماضی کے حسین جادو کا ایک رنگ محل ہے۔"(۱۳۲)

ایک طرف زمرد کا خون خرابہ پر خوف زدہ ہونا جبکہ دوسری طرف بلغان خاتون کا انتہائی پُر ملال الفاظ میں سمجھانا۔دونوں خواتین کی عقل مندی،نازک دلی کا ثبوت ہے۔اور آخر میں ایک بڑے فتنے کا قلع قمع کرنے کے بعد دونوں کی سربراہ بلغان خاتون بنتی ہے۔اور ایک ہمدرد خاتون ہونے کے ناطے نہ صرف دونوں کے نکاح کا ذمہ اٹھاتی ہے بلکہ دونوں اپنے نیک مقصد فریضہ حج کو رُخصت ہو جاتے ہیں۔سید وقار احمد رضوی ایک جگہ نذیر احمد اور شرر کے اسلوب کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نذیر احمد نے ناول سے پند و نصیحت اور اصلاحِ معاشرت کا کام لیا انہوں نے اپنے ناولوں میں اخلاق اور انسانی دوستی کو اہمیت دی نذیر احمد جزئیات کے بیان پر قادر ہے جبکہ عبدالحلیم شرر کے ہاں یہ بات نہیں پائی جاتی ہے شرر کے ہاں زبان کی لطافتوں کو انگریزی زبان سے مربوط کیا گیا ہے ان کی تشبیہات و استعارات ایشیائی ہے لیکن خیالات پر انگریزی کی چھاپ ہے۔ شرر کے ہاں صناعی ہے لیکن ان کو نذیر احمد کی طرح کردار نگاری نبھانا نہیں آتا ہے جبکہ نذیر احمد معاشرتی ناول نگار ہیں۔شرر نے چونکہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا تھا اس لئے ان کے ہاں تاریخی رنگ زیادہ ہے"(۱۳۳)

عبد الحلیم شرر کے ہاں ہمیں اردو ادب کا وہ مزاج، وہ اسلوب اور وہ چاشنی نظر نہیں آتی جو دیگر اس عہد کے لکھنے والوں کے ہاں ملتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عبد الحلیم شرر نے انگریزی زبان سے اپنا ربط بر قرار رکھا وہ اور انگلستان سے کسی نہ کسی صورت میں منسلک رہے شرر اپنے اسلوب اور طرز فکر کے حوالے سے سر سید احمد خان کے بہت قریب تھے اور ان کی عقلمندی کے مداح بھی تھے. انہوں نے عربی کی تعلیم مٹیابرج سے حاصل کی تھی لیکن اپنے کلکتہ میں قیام کے دوران وہ انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہوئے اور انگریزی ادب کا مطالعہ کیا جس نے ان کی ان کے ذوق وشوق کو ایک نیا رنگ اور اسلوب عطا کیا کیونکہ کلکتہ کی تعلیم میں انگریزی تہذیب کا خاصا عمل دخل موجود تھا۔ یہ ایشیائی اور انگریزی دونوں رنگ ان کے تخلیقی کام میں ہمیں نظر آتے ہیں وہ فطرتا ایک جدت پسند مصنف تھے۔ اپنے مٹیابرج کے قیام کے دوران ان کا تعلق نظم طباطبائی سے بھی رہا جو مٹیابرج میں شہزادوں کے اتالیق تھے انھوں نے بھی نظم طباطبائی سے معقولات کی تعلیم حاصل کی تھی جس کا اثر ان کی تحاریر میں واضح نظر آتا ہے اور عقل پسندی و جدید فکر کا رجحان پایا جاتا ہے یہ جدید رجحان پسندی اس بات کی بھی دلالت کرتی ہے کہ قدیم نثر میں جو تکلف و تصنع موجود تھا وہ انکے ہاں نہیں پایا جاتا شرر دراصل میر امن ، مرزا غالب اور غالب کے بعد سر سید کے مقلد تھے اور انہیں سلاست پسند تھی. اور جدید نثر کا تقاضا بھی یہی تھا اور اس طرز تحریر نے ان کے بعد آنے والے لوگوں کو متاثر بھی کیا.

پروفیسر جعفر رضا بھی ان کے بارے میں یہی کہتے ہیں کہ عبد الحلیم شررؔ نے سادہ اور عام فہم نثر کو رواج دیا تھا اس نثر میں سادگی اور بے تکلفی تھی اور کہیں کہیں گفتگو کرتی عبارتیں بھی موجود ہیں۔ ان کے خیال میں تہذیب، اخلاق کی تکلفات کا نام ہے جس کو کوئی قوم تقاضائے شرافت سمجھنے لگے۔ شررؔ کے ہاں بے جا تکلفات پسندی اور سجاوٹ بناوٹ نظر نہیں آتی اور نہ بہت زیادہ تشبیہات و استعارات کا استعمال کرتے تھے بلکہ اپنی عبارت کو بے جا رنگین اور دلکش بنانے کے لئے ضرورت سے زیادہ استعارات اور تشبیہات کا استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے. ہے پروفیسر عبد السلام عبد الحلیم شررؔ کی نثر نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں: "اگر ہم شررؔ سے پہلے کی زبان کا شررؔ کے بعد کی زبان سے مقابلہ کریں ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نثر شررؔ کی کس قدر احسان مند ہے کہ لکھنے والے پہلے بھی انگریزی سے واقف تھے مگر اردو نثر کو انگریزی کا رنگ دینے والے شررؔ ہی ہیں[۱۳۴] عبد الحلیم شررؔ نے دراصل اردو کو قدیم دبیز سجاوٹ اور بناوٹ سے مزین پردوں سے نکال کر ایک جدید اور فطری رنگ عطا کیا اور آج جدید اردو میں ہماری نثر کا وہی رنگ ہے۔

حوالہ جات

۱. کریم الدین، مولوی، طبقات الشعراء ہند، مطبع منشی نول کشور، ۱۸۴۸ء، ص ۶۱
۲. حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اردو، اے۔بی۔سی آفیسٹ پرنٹرز حوضِ قاضی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۸۷
۳. احسن ماہروی، تاریخ نثر اردو بنام تاریخی منشورات (حصہ اول) مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۳۰ء، ص ۲۴
۴. عظمت اللہ نیاز، قصہ رنگین (قلمی نسخہ)، ہر دیال مونسپل پبلک لائبریری، ۱۸۱۲ء، ص ۱۴۴
۵. سید انشاء اللہ خان انشاء دہلوی، کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی (مرتبین) مولوی عبد الحق، امتیاز علی عرشی `سید قدرت نقوی، انجمن ترقی اردو کراچی پاکستان، ۱۹۹۳ء، ص ۲۱
۶. ایضاً ص ۹
۷. رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر، اردو نثر کا آغاز و ارتقا، مجلس تحقیقاتِ اردو حیدر آباد، س ن، ص ۳۸
۸. سید وقار عظیم، فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ، یونیورسل بکس اردو بازار لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۳۹
۹. قدرت نقوی،، کہانی رانی کیتکی اور کنور اودے بھان کی، ص ۱۹
۱۰. شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقا (۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۷ء)، شعبہ جامعیہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، جامعہ نگر دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۱۹
۱۱. مولوی عبد الحق، سب رس، اشاعت چہارم, انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ا
۱۲. ملا وجہی، (دیباچہ) سب رس، (مرتبہ) مولوی عبد الحق، جلد چہارم، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ۴۳۵
۱۳. جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، (جلد سوم) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۴۲۸
۱۴. ملا وجہی، سب رس، ص ۴۳۵
۱۵. ملا وجہی، سب رس، ص ۴۱
۱۶. ابو اللیث صدیقی، اضافِ سخن، مشمولہ، تاریخِ ادبیات پاکستان و ہند، ص ۹۷
۱۷. سبط حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۹۴ء ص ۴۰
۱۸. میر امن، باغ و بہار، (مرتبہ) رانا خضر سلطان، بک ٹاک، میاں چیمبرز ٹمپل روڈ لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۴۰-۳۹

۱۹. ممتاز منگلوری، ڈاکٹر، مقدماتِ باغ و بہار، (مرتبہ) اسلم عزیز درانی، ڈاکٹر، کاروانِ ادب ملتان، ۱۹۹۰ء، ص ۱۱۵

۲۰. ابوالخیر کشفی، (مقدمہ) باغ و بہار، مشمولہ: مقدمات باغ و بہار، (مرتبہ) اسلم عزیز درانی،، ص ۱۱۳

۲۱. میر امن، باغ و بہار، ص ۵۲، ۵۳

۲۲. سید وقار عظیم، فورٹ ولیم کالج، تحریک اور تاریخ، یونیورسل بکس اردو بازار لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۳۹

۲۳. میر امن، باغ و بہار، ص ۳۳

۲۴. سید عبد اللہ، ڈاکٹر، میر امن سے عبد الحق تک، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۴۱

۲۵. سید عبد اللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبد الحق تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۶

۲۶. سید عبد اللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبد الحق تک، ص ۳۸

۲۷. سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو داستان، ص ۴۶۲

۲۸. آغا سہیل، ڈاکٹر، دبستان لکھنو کے داستانی ادب کا ارتقا، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۲۴

۲۹. ایضاً ص ۱۵۳

۳۰. رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اُردو، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۴۸

۳۱. انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰۸

۳۲. جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو (جلد سوم) طباعتِ دوم ۲۰۰۸، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور،، ص ۴۲۲

۳۳. نیر مسعود رضوی، ڈاکٹر، رجب علی بیگ سرورؔ: حیات اور کارنامے، شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۴

۳۴. محمود الٰہی، ڈاکٹر، فسانہء عجائب کا بنیادی متن، ادارہ تصنیف دہلی، ۱۹۷۳، ص ۱۲، ۱۱

۳۵. .A.S.Altekar, Dr, Position of woman in Hindu civilizationArchive.org/details/in.ernet.dli.2015.56806,20 ،january,2020, p 86,11 pm

۳۶. رجب علی بیگ سرورؔ، فسانہء عجائب، ص ۱۴۷

۳۷. نیر مسعود رضوی، رجب علی بیگ سرورؔ حیات و کارنامے، شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، ۱۹۴۷ء، ص ۱۷

۳۸. محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، یورپ اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۲۲

۳۹. نذیر احمد، مراۃ العروس، اُردو بازار لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲
۴۰. رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اُردو، ص، ۳۷۶
۴۱. نذیر احمد، دیباچہ دوم، مراۃ العردوس، ص ۲
۴۲. ایضاً ص ۲۹
۴۳. ایضاً ص ۲
۴۴. شبیر ابن عادل، اردو ناول کے بانی ڈپٹی نذیر احمد، مشمولہ: ادبیات ناول نمبر، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۲۰۲۰، ص ۲۸۲
۴۵. نذیر احمد، مراۃ العروس، ص ۳۶
۴۶. حامد حسن قادری، داستان تاریخ، اردو، اے بی سی آفیسٹ پرنٹرز حوض قاضی، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۵۵۱
۴۷. ڈپٹی نذیر احمد، دیباچہ دوم مراۃ العردوس، ص ۲
۴۸. نذیر احمد، مراۃ العروس، ص ۲۹
۴۹. ایضاً ص ۳
۵۰. ایضاً ص ۳۴
۵۱. ایضاً ص ۲۱
۵۲. ایضاً ص ۳۳
۵۳. ایضاً ص ۵۵
۵۴. ایضاً ص ۳۵
۵۵. ایضاً ص ۵۶
۵۶. ایضاً ص ۵۶
۵۷. ایضاً ص ۵۷
۵۸. ایضاً ص ۶۵
۵۹. ایضاً ص ۷۰
۶۰. ایضاً ص ۷۱
۶۱. ایضاً ص ۷۵
۶۲. ایضاً ص ۷۶

۶۳. ایضاً ص ۸۱

۶۴. ایضاً ص ۸۸

۶۵. ایضاً ص ۴۳

۶۶. ایضاً ص ۹۷

۶۷. ایضاً ص ۱۰۰

۶۸. ایضاً ص ۱۱

۶۹. ایضاً ص ۱۱۷

۷۰. ایضاً ص ۱۱۶

۷۱. ایضاً ص ۱۱۸

۷۲. ایضاً ص ۱۲۹

۷۳. ایضاً ص ۱۳۱

۷۴. ایضاً ص ۱۳۲

۷۵. ایضاً ص ۱۳۷

۷۶. ایضاً ص ۱۳۸

۷۷. ایضاً ص ۱۴۹

۷۸. ایضاً ص ۱۵۰

۷۹. ایضاً ص ۱۵۰

۸۰. ایضاً ص ۱۵۰

۸۱. ایضاً ص ۱۵۷

۸۲. ایضاً ص ۴۲

۸۳. ایضاً ص ۴۷

۸۴. علی عباس حسینی، ناول اور ناول نگار، مشمولہ: ادبیات ناول نمبر، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۲۰۲۰، ص ۸۶-۸۷

۸۵. ایضاً، ص ۵۲

۸۶. وحید خاں، ڈاکٹر، مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار، تخلیق کار پبلشرز، دریا گنج، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۲۲

۸۷. ایضاً ص ۲۲
۸۸. وضاحت حسین رضوی، ڈاکٹر، دیباچہ، ڈپٹی نذیر احمد، ایامیٰ، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، ۲۰۱۵، ص ۲۱
۸۹. احمد ادیب، اردو کا پہلا ناول نگار، برِ صغیر پاک وہندی اکیڈمی یوپی۔ ۱۹۳۴ء، ص ۱۱۹-۱۲۰
۹۰. سید علی محمد خسرو، اردو کی تہذیبی معنویت، مکتبہ جامع لمٹیڈ جامع نگر، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۱-۱۲
۹۱. ایضاً ص ۱۲۷
۹۲. سفینہ، ڈپٹی نذیر کے ناول ایامی کا جائزہ، مقالہ، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، ہماری ویب،، جون، ۲۰۱۵،
۹۳. نذیر احمد، ڈپٹی، ایامیٰ، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو، ۲۰۱۵ء، ص ۲۴
۹۴. ایضاً ص ۲۲۸
۹۵. ایضاً ص ۱۷۱-۱۷۲
۹۶. ایضاً ص ۱۸۴
۹۷. ایضاً ص ۱۷۳
۹۸. ایضاً ص ۱۸۴
۹۹. سید محمد عبد الرشید، نذیر احمد بہ حیثیت انشا پرداز، مشمولہ :ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار، ترتیب و تدوین محمد اکرم چغتائی، پاکستان رائٹر کو آپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۳، ص ۳۰۷
۱۰۰. حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، ص ۵۵۰
۱۰۱. عظیم الشان صدیقی، نذیر احمد کی ناول نگاری، (مضمون) مشمولہ: نذیر احمد احوال و آثار، (مرتب) محمد اکرام چغتائی، پاکستان رائٹرز کو آپریٹو سوسائٹی، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۳۸۴
۱۰۲. رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ص ۲۹۶
۱۰۳. سید لطیف حسین ادیب، رتن ناتھ سرشارؔ کی ناول نگاری، انجمن ترقی اردو کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۵۱
۱۰۴. رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اُردو، ص ۵۷۴
۱۰۵. فیروز مکرجی، لکھنو اور سرشارؔ کی دنیا، مترجمہ مسعود الحق، سٹی پریس بک شاپ صدر کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۳
۱۰۶. علی عباس حسینی، ناول اور ناول نگار، ص نمبر ۹۱-۹۲۔
۱۰۷. آل احمد سرورؔ، اردو ناول کا ارتقا. ادبیات ناول نمبر، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۲۰۲۰ء، ص ۲۰۷

۱۰۸.	عبد الرشید صدیقی، ڈاکٹر، فسانہء آزاد کی تہذیبی فرہنگ، انٹر نیشنل پرنٹنگ پریس جیل روڈ، علی گڑھ، ۲۰۰۵، ص ۶

۱۰۹.	رام بابو سکینہ، تاریخ ادب اُردو، علمی بک ہاؤس لاہور۔ ۱۹۸۴ء، ص ۴۷۳

۱۱۰.	سید لطیف حسین ادیب، رتن ناتھ سرشارؔ کی ناول نگاری، انجمن پریس لارنس روڈ کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۲۹۲

۱۱۱.	عظیم الشان صدیقی، اردو ناول آغاز و ارتقا، (۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۷۹

۱۱۲.	علی عباس حسینی، ناول اور ناول نگار، ص ۱۱

۱۱۳.	ایضاً، ص ۱۱

۱۱۴.	ساجدہ زیدی، تانیثی تنقید، مشمولہ: کسوٹی جدید نسائی ادب نمبر، پٹنہ، انڈیا، شمارہ ۲۴-۲۵ اپریل تا ستمبر ۲۰۱۴ء، جلد ۷/۶، ص ۱۸

۱۱۵.	توحید خان، ڈاکٹر، مرزا رسوا کے ناولوں کے نسوانی کردار، ص ۷۷

۱۱۶.	عتیق اللہ، تانیثیت: ایک مطالعہ، مشمولہ: کسوٹی جدید نسائی ادب نمبر، پٹنہ، انڈیا، شمارہ ۲۴-۲۵ اپریل تا ستمبر ۲۰۱۴ء، جلد ۷/۶، ص ۲۹

۱۱۷.	مرزا ہادی رسوا، امراؤ جان ادا، تخلیقات لاہور ۲۰۰۲ء، ص ۴۱

۱۱۸.	ہادی رسوا، مرزا، امراؤ جان ادا، ص ۴۱

۱۱۹.	محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۵۵

۱۲۰.	ایضاً، ص ۴۰

۱۲۱.	اسلوب احمد انصاری، اردو کے پندرہ ناول، یونیورسل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ علی گڑھ، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۰

۱۲۲.	عورت زندگی کا زندان، زاہدہ حنا، دی سمیع سنز پرنٹر، کراچی ۲۰۰۰ء، ص ۱۶۲

۱۲۳.	مرزا ہادی رسوا، امراؤ جان ادا، ص ۲۱

۱۲۴.	عبد الحلیم شررؔ، فردوس بریں، الحمد پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۱۰-۱۱

۱۲۵.	علی احمد فاطمی، تاریخی ناول فن اور اصول، مشمولہ: خصوصی نمبر، اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ جلد اول، ادبیات اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۲۰۲۰ء، ص ۴۰

۱۲۶.	عبد الحلیم شررؔ، فردوس بریں، ص ۲۲

۱۲۷.	افضل حسین اظہر، پروفیسر شررؔ کی انشاء پردازی، مشمولہ: خیابان شررؔ نمبر، س۔ن ص ۱۸۸

۱۲۸. عبدالحلیم شررؔ، فردوس بریں، ص۶۹-۶۳

۱۲۹. رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، ص۱۳۱

۱۳۰. افضل حسین اظہر، پروفیسر، شررؔ کی انشاءپردازی،، مشمولہ: خیابان شررؔ نمبر، س۔ن، ص ۱۹۲

۱۳۱. عبدالحلیم شررؔ، فردوس بریں، ص۱۰۱

۱۳۲. اعجاز رحمان، شررؔ کا اسلوب بیان، مشمولہ: خیابان شررؔ نمبر، س ن، ص ۱۸۰

۱۳۳. سید وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ نقد، آگہی پبلی کیشنز، کراچی ۱۹۹۲ء، ص۳۳۹-۳۴۰

۱۳۴. عبدالسلام، پروفیسر، اردو ناول بیسویں صدی میں، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۷۳ء، ص۸۶

باب چہارم :

اردو نسائی زبان محاورے کے ثقافتی تناظرات

کسی بھی زبان کے ادب کو مکمل طور پر سمجھنے اور اس کے حقیقی معنوں تک پہنچنے کے لئے اس خاص ثقافتی پس منظر سے واقف ہونا بہت ضروری ہے جس کے تناظر میں وہ ادب تخلیق ہوا تھا۔ صرف زبان و ادب ہی نہیں بلکہ فن موسیقی، فن مصوری، مجسمہ سازی، عمارت سازی سے لے کر رسومات و عقائد، اجتماعی فکر و عمل کے مظاہرات، جغرافیائی اور سیاسی و سماجی حالات بھی اسی ثقافتی پس منظر میں شامل ہوتے ہیں۔ ثقافت جس کے لئے انگریزی لفظ کلچر استعمال کیا جاتا ہے اس سے قریب ترین دو لفظ تہذیب اور تمدن کی تفہیم بھی ضروری ہے۔ "کلچر" انگریزی زبان کا وہ لفظ ہے جسے ہم اردو میں ثقافت کے معنوں میں ترجمہ کرتے ہیں اس کے معنی پالنا، ہل چلانا، تربیت کرنا، کھاد ڈالنا، پانی دینا ہے اس کا مادہ KULT ہے۔ اس سے مراد ذہنی تربیت بھی لیے جاتے ہیں انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں لکھا ہے

> "The term culture assumed it meaning in application to the variety of things that might be cultivated.The term culture and the cult have the same drivated and were appied by the Romans to the cultivation of the mind and cultivation of the religion and God"(1)

کلچر کے لفظی معنی تو مادی تربیت، مادی ترقی کا ارتقاء، تربیت، کھیتی باڑی کے ہیں مگر یہ مادی کے علاوہ روحانی تربیت، فنون لطیفہ، مذاہب، قوانین، فلسفہ، اخلاقیات کے ساتھ اپنے اصطلاحی معنی مکمل کرتا ہے۔ اس لفظ کلچر یا ثقافت سے مراد ہم کسی انسانی گروہ یا قوم کے اجتماعی فکر و عمل لیتے ہیں۔ دراصل ثقافت ایک اکتسابی عمل ہے اور اس میں ہمارے خیالات کے ساتھ اقدار کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ وہ اعمال جو ہم منظم گروہ کی صورت میں کرتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے مختلف خطوں میں زبان، لباس، طرزِ فکر اور قوانین کے حوالے سے بے شمار مختلف ثقافتیں موجود ہیں جو ہمیں کبھی کبھار حیرت زدہ بھی کر دیتی ہیں۔ سبطِ حسن نے "پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء" کے پہلے باب میں تہذیب کی تعریف کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں تہذیب معاشرے کی طرز زندگی اور طرز فکر و احساس کا جوہر ہوتی ہے چنانچہ زبان ، آلات واوزار، پیداوار کے طریقے اور سماجی رشتے رہن سہن فنون، لطیفہ، علم و ادب، فلسفہ و حکمت، عقائد ، اخلاق وعادات, رسوم و روایات، عشق و محبت کے سلوک اور خاندانی تعلقات وغیرہ تہذیب کے مختلف مظاہر ہیں۔"(۲)

سرسید احمد خان کے خیالات بھی کچھ اسی نوعیت کے ہیں ان کے ہاں بھی انسانی زندگی کی اجتماعی سرگرمیاں ثقافتی زندگی کی شکل وصورت کو ترتیب دیتی ہیں۔ یہ سرگرمیاں انسانی بنیادی ضروریات سے جنم لیتی ہیں اور پھر ان کے دیگر مشاغل، اچھائی برائی کے معیارات بھی متعین کرتی چلی جاتی ہیں۔ مقالاتِ سرسید میں وہ لکھتے ہیں: کہ جب ایک انسانی گروہ کسی جگہ اکٹھا رہتا ہے تو اکثر ان کی حاجتیں، غذائیں ان کے لباس اور خیالات، خوشی و غم کی رسومات یکساں ہوتی ہیں۔ نیکی و بدی بابت تصورات یکساں ہوتے ہیں، خواہشات بھی ایک سی ہو جاتی ہیں اور پھر یہی مجموعی خواہش تبادلہ اس گروہ کی سولائزیشن کہلاتا ہے۔"(۳)

وادی سندھ کی یعنی موہن جودڑو اور ہڑپہ کی تہذیب نہ صرف برصغیر کی بلکہ دنیا کی عظیم بڑی تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے اس کا دائرہ ہم عصر مصری اور ایرانی تہذیبوں سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ یہ تہذیب تقریباً پچیس سو سے پندرہ سو قبل مسیح تک زندہ رہی تھی اس کی کھدائی سے جس تاریخی سفر کا ہم عمیق مشاہدہ کرتے ہیں تو اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں کے باشندوں کی زندگی کے معمولات کس طرح کے تھے اور وہاں کے مرد وزن کے زندگی کے معمولات اور ان کی دلچسپیوں کے آثار بتاتے ہیں کہ بنیادی طور پر یہ لوگ زراعت پیشہ تھے، اناج اُگاتے تھے اور تجارت کرتے تھے مٹی کے برتن بناتے، سونے اور چاندی کے زیورات بناتے تھے۔

موہنجو دڑو اور ہڑپہ کی تہذیب کے بارے میں ماہرین کا یہ کہنا ہے کہ یہ تہذیب امن پسند لوگوں کی تہذیب تھی یہاں کے رہنے والے لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے اور ان کا شیوہ جنگ وجدل یا لشکر وسپاہ رکھنا نہیں تھا۔ انکی اونچے طبقے کی عورتیں چاندی کے زیورات جس میں مختلف قسم کے ہار مالا، جھومر اور بالوں کے پھول، ناک کی کیل، ہاتھوں کی چوڑیاں اکثر استعمال کرتی تھی اور یہاں پر چھوٹے موٹے اوزار تھے جیسے استرا اور کلہاڑی وغیرہ عام روزمرہ تھے صرف وہی دریافت ہوئے ہیں جبکہ یہ حیرت کی بات ہے کہ یہاں سے کوئی جنگی

اسلحہ دریافت نہیں ہوا یا سامنے نہیں آیا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قتل و غارت پسند نہیں کرتے تھے اور امن پسند لوگ تھے جبکہ ان کے ہم عصر جو مصری اور عراقی وایرانی تہذیب تھی وہاں پر کثرت سے موجود ہے۔ لشکر و سپاہ رکھنا اور جنگی ہتھیار بنانا یہ ہنر ہر انسان کے پاس موجود ہوتے تھے اور عام رواج تھا جبکہ ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی تہذیب میں ایسا نہیں تھا۔ چونکہ یہ دو بڑے تجارتی مراکز تھے اس لیے تجارتی سرگرمیاں یہاں ہوتی تھیں۔

ترکی اور ایرانی تہذیب کے برصغیر پر اثرت سے ہندو معاشرے میں عورتوں کی حیثیت میں بھی فرق پڑا اور پہلی بار کسی منظم حکومت کے قائم ہونے کے بعد برِ صغیر پاک و ہندی معاشرے میں بہت ساری تبدیلیاں رونما ہوئیں اور ان کا اثر عورتوں کی زندگی پر بھی پڑا۔ چونکہ اس وقت برِ صغیر پاک و ہندی تہذیب میں دیہات کے باشندوں کو خاص طور پر ملک کے امور میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا تھا نہ کوئی دلچسپی ہوتی تھی مسلمان حکمرانوں کی وجہ سے برِ صغیر پاک و ہند جب دنیا کے نقشے پر ایک جغرافیائی اور سیاسی وحدت کی صورت میں نمودار ہوا تو زندگی کے تمام شعبوں پر اس کے اثرات مرتب ہوئے۔

جہاں تک نسائی معاشرت کا تعلق ہے تو یہاں پر نچلے طبقے کی عورت آزادانہ باہر نکلتی تھی لیکن مسلمانوں کے عہد میں پردے کا رواج عام ہوا تو آہستہ آہستہ ہندو عورتوں پر بھی اس کے اثرات مرتب ہونا شروع ہو گئے اور بہت سی ہندو عورتیں بھی گھونگھٹ کاڑھ کر گھر سے باہر نکلتی تھیں ۔ اگرچہ ہندو عورت کے پردے کا رواج نہیں تھا لیکن ایک ہندو کنیز جو سلطان کی کنیز تھی اس کے بیمار ہونے پر جب حکیم کو دکھانے کا وقت آیا کہ اس کے لیے علاج تجویز کر سکے تو پردے کی وجہ سے نہ دکھایا گیا۔ یعنی یہ اثرات ہندو عورتوں پر بھی پڑے اور دیہاتی عورتیں جو ویسے تو پردہ نہیں کرتی تھی لیکن کھیتوں میں کام کرتے ہوئے گھونگٹ لے لیا کرتیں جہاں ہندو عورتوں پر اسلامی تہذیب کے کے اثرات مرتب ہوئے وہاں مسلمان عورتوں پر بھی ہندو تہذیب کے اثرات مرتب ہوئے اور خاص طور پر چونکہ برِ صغیر پاک و ہندی عورت کو دوسری شادی کی اجازت نہیں تھی بلکہ اسے ستی کر دیا جاتا تھا یا اس پر زندگی کی تمام رنگینیاں اور آسائشیں حرام کر دی جاتی تھی تو مسلمان طبقے میں بھی بیوہ کی شادی کو عزت اور وقار کی توہین سمجھنا شروع کر دیا گیا اور آہستہ آہستہ بیوہ کی دوسری شادی کروانے کا رواج تقریباً ختم ہو گیا تھا جو بنیادی طور ہندو سماج کا اثر تھا۔

ایک اور سب سے بڑا اثر جو مسلم سماج پر ہوا وہ یہ تھا کہ ہندو مذہب میں رقص اور موسیقی مذہب کی حیثیت رکھتی تھی اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی جب کہ مسلمانوں کے ہاں یہ معیوب بلکہ اس پر کئی فتویٰ موجود

تھے جس میں موسیقی اور رقص کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے گھروں میں سازندوں کی مدد سے ناچنے گانے کا رواج عام ہوا اور انہوں نے شروع میں سرپرستی شروع کر دی نہ صرف یہ بلکہ وہ موسیقی کی محافل جو طوائفوں کے ہاں ہوتی تھیں اور مسلمان وہاں پر اپنا وقت گزارتے تھے پھر آہستہ آہستہ ان میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ طوطی ہند امیر خسرو کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ امیر خسرو جو فارسی کے دلدادہ تھے وہ اپنی فارسی شاعری میں بھی ہندی الفاظ شامل کرتے تھے اور ایک خاص تہذیبی امتزاج ان کی شاعری میں ملتا ہے انھوں نے اپنی بہت سی نظموں میں اپنے جذبات کا اظہار عورت کی زبان سے کیا ہے جو ان کی تہذیب سے وابستہ ہونے کی ایک دلیل مانا جاتا ہے ان کے کلام میں تہذیبی امتزاج کی دوسری مثال ان کی مشہور نظم "خالق باری" ہے جس میں آدھے الفاظ فارسی کے ہیں اور آدھے ہندی کے۔ اسی سے ملتی جلتی ان کی وہ غزل ہے جس میں امیر خسرو ہندی روایت کے مطابق اپنے جذبات کا اظہار عورت کی زبان سے کرتے ہیں

زحالِ مسکیں مکن تغافل ورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کا ہے لگائے چھتیاں
شبان ہجراں دراز چوں زلف وا روز وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اردو میں "ثقافت" کے معنی علوم و فنون، سیدھا کرنا، سمجھنا، قدرت اور مہارت رکھنا کے ہیں اب ہم لفظ "تہذیب" کا جائزہ لیتے ہیں جو عربی زبان سے ہے اور اس کے لغوی معنی تراش خراش کانٹ چھانٹ، تربیت کرنا کے ہیں۔ اردو زبان و ادب میں تہذیب شائستگی اور نفاست کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اس لیے ہم اعلی اخلاقی اقدار اور اعلی ذوق رکھنے والے شخص کی بابت کہتے ہیں کہ فلاں بہت مہذب انسان ہیں یا فلاں انتہائی تہذیب یافتہ آدمی ہے یعنی انسان نے زمیں پر اپنی زندگی آغاز کرنے کے بعد سے آج تک جس قدر مادی ترقی کی ہے اور جس قدر ہنر مندی و مہارت سیکھیں جو ایجادات کیں اور اصلاحات کا جیسا نظام حیات بنایا اور اپنایا کوئی خاص سیاسی اور مذہبی شعور اپنایا خیر بھلائی نیکی اچھائی کے جو اصول وضع کیے اور ان کو عمل میں لایا اس کے ان تجربات کے نچوڑ کو ہم تہذیب قرار دے سکتے ہیں ان تجربات کے نچوڑ کو حتی الوسع اپنانے والے شخص کو ہم مہذب انسان کہتے ہیں انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنسز کے مطابق:

" Culture or civilization taken its wide senses, is that complex whole which includes knowledge, belief, art, morals, law, custom and any other capabilities acquired by man as member of society"[۴]

لفظ تمدن دراصل مدن سے نکلا ہے جس کے معنی شہریت کے ہیں مدینہ، شہر کو کہتے ہیں تمدنی سے مراد شہری زندگی ہے یہ خالصتاً مادی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جب انسان نے شہر آباد کیے زندگی کے مختلف شعبہ جات اپنائے، ضروریات زندگی کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرنا شروع کیا اور بحیثیت انسان عمرانی زندگی کا آغاز کیا، مادی، روحانی و اخلاقی معیارات مقرر ہوئے، بحیثیت مجموعی ثقافت اور تمدن تہذیب ہی کے کل کا حصہ ہیں مگر تہذیب کے معنی ان تک محدود نہیں ہیں کیونکہ حیات انسانی کے مختلف ادوار میں تہذیب کے معنی و معیارات بدلتے رہے ہیں ان میں تبدیلیاں آتی رہی ہیں اور اس کی جامع تعریف بھی ہنوز نہیں ہو پائی ہے۔

کلچر اینڈ انارکی Culture and Anarchy کے مصنف میتھیو آرنلڈ Mathew Arnold کے مطابق مختلف ادوار میں انسان نے جتنے علوم سیکھے جن کا مقصد انسانیت کی کی تکمیل رہاہو بشمول مذہب یہی تہذیب کہلاتا ہے۔ انسان فطری سطح پر تمدن پسند مخلوق ہے پروفیسر میک ایورنے تہذیب کو ایک بڑی مشینری کی مانند قرار دیاہے وہ کہتے ہیں "تہذیب وہ پوری مشینری ہے جسے انسانوں نے اپنی زندگی میں ترتیب دیاہے اس میں نہ صرف ہماری معاشرتی تنظیم شامل ہے بلکہ ہماری ہنرمندیاں اور ہماری ماد ی ترقی کے اوزار بھی شامل ہیں۔ [۵]

کسی تہذیب کو جو عناصر بناتے اور دیگر تہذیبوں سے ممتاز کرتے ہیں ان میں اس کے جغرافیائی اقتصادی وسیاسی حالات کو اہمیت حاصل ہے جس جگہ ناگہاں حوادثِ ارضی اور تبدیلیوں کا زیادہ عمل دخل ہو وہاں کوئی بڑی تہذیب نہیں پنپ سکتی، انسانی زندگی کی تعمیر و ترقی کے ارتقاء کا سفر جاری نہیں رہ سکتا جو کسی تہذیب کی بنیاد کہلایا جاسکے۔ معروف تاریخ دان آرنلڈ جے ٹائن بی نے اپنی کتاب "A Study of History" کے پہلے باب میں جہاں ہندو معاشرے کا ذکر کیا وہاں اس کو متاثر کرنے والے فکری و روحانی عناصر کا ذکر کرتے ہوئے محض یونانی اثرات پر اکتفا کرتے ہوئے اختصار سے کام لیا اور لکھا: " ہندو دھرم یہاں کا ہمہ گیر مذہبی نظام ہے جس نے گپت حکمرانوں کے عہد میں برِ صغیر پاک وہند میں تفوق حاصل کیا اور بدھ مت کو سات سو برس کے اقتدار کے بعد اس بر صغیر سے خارج کر دیا جو دونوں کا گہوارہ تھا۔" [۶]

جب کہ اسی کتاب کے حواشی میں غلام رسول مہر نے انسانی معاشرے پر اسلام کے اثرات کی طرف توجہ دلاتے ہوئے مصنف کی کوتاہی کی شکایت کی ہے کہ برِ صغیر پاک وہندی ثقافت اور علم وادب پر چاہے وہ دکنی ہو یا دہلوی اسلام کے آنے کے بعد اثرات کسی نہ کسی حد تک ضرور مرتب ہوئے۔ ڈاکٹر تاراچند نے برِ صغیر پاک وہندی ثقافت پر اسلامی اثرات میں اس کی تفصیل ووضاحت پیش کی ہے ان کے بقول:

"برِ صغیر پاک وہندی زندگی کے تمام شعبوں پر مسلم فاتحین کا جو زبردست اثر ہوا اس میں مبالغہ کرنا دشوار ہے لیکن اس اثر کے نمایاں علامات سب سے زیادہ ہندوؤں کی خانگی زندگی رسوم و رواج، لباس اور وضع، شادی کے طور طریقوں، تیوہاروں، میلوں اور درباری آداب میں نظر آتے ہیں۔ بابر کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی زندگی اور فکر میں اتنی یکسانیت پائی جاتی تھی کہ مغل شہنشاہ کو اس امر سے کافی تعجب ہوا۔"(۷)

برصغیر پاک وہند کی ثقافت کے وسیع منظر نامے کا مشاہدہ ہمیں نسائی اردو زبان کے پس منظری مطالعہ کے طور پر ملتا ہے بہت سی اصطلاحات و تلمیحات ایسی ہے جو خالصتاً اسلامی عقائد سے متعلق ہیں اور بہت سے الفاظ و محاورات برِ صغیر پاک وہند کے جغرافیائی حالات ہندوازم اور سماجی رسوم وعقائد کے متعلق ہیں۔ زبان کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر یہ تمام مذاہب، تمام افکار و علامات، تمام حالات اور تاثرات و مشاہدات کو اپنے اندر سموتی چلی جاتی ہے اردو زبان پر بھی ثقافتی اثرات کا گہرا رنگ غالب ہے۔

الف) اردو نسائی زبان ومحاورہ کے ثقافتی تناظرات (۱۸۵۷ء سے قبل)

نسائی زبان خواتین کی زندگی اور معاملات کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات واحساسات کی شہادت بھی پیش کرتی ہیں جن سے وہ گزرتی رہی ہیں اردو کے ابتدائی شعری ادب پر دبستان لکھنو اور دبستان دہلی کی ذیل میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے جس میں زبان کے ثقافتی اور تہذیبی حوالوں کی جھلک واضح ہے۔

۱۸۵۷ء سے پیشتر اردو زبان اور اس پر تہذیبی اثرات کا دائرہ زندگی کے ہر شعبے کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ ہر زبان اپنا ارتقائی سفر اسی طرح طے کرتی ہے زبان زندہ انسانوں اور زندگی کے معاملات سے جنم لیتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ جب کسی پیشے کی موت ہو جاتی ہے تو آہستہ آہستہ اس کے اوزاروں کے نام بھی لینا لوگ بھول جاتے ہیں اس طرح خیال کے مرنے پر اس کے متعلقہ الفاظ بھی متروک ہو جاتے ہیں زبان زندہ لوگوں کی ضرورت ہے اسلامی خیالات اور ہندوانہ خیالات جب ملے تو دونوں پر باہم اثرات مرتب ہوئے اور

ایک گنگا جمنی تہذیب کا جنم ہوا جس کا مشاہدہ ہم اردو زبان کے الفاظ سے بھی کر سکتے ہیں مگر یہ صدیوں کا سفر ہے بابو چرن جی لال مثال دیتے ہیں کہ ۱۱۹۲ء میں پر تھا بائی جو سمر سنگھ کی پہلی بیوی تھی اس نے اپنے پتی دیو کی وفات کے بعد اپنے ستی ہو جانے سے قبل بیٹے کو لکھا کہ سر حضور سمر جنگ میں مارے گئے ہیں اور ان کے سنگ رشی کیش جی بھی بیکنٹھ کو پدھارے۔ رشی کیش جی ان چار لوگوں میں سے ہیں جو دلی سے میرے ساتھ دہیج میں آئے تھے۔ بابو چرن جی لال آگے چل کر لکھتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت یعنی ۱۱۹۲ء میں فارسی الفاظ عوام میں عام روز مرہ گفتگو کے دوران استعمال ہوتے تھے جیسے حضرت (حجرت) پگام (پیغام) غریب نواز (گریب نواز) گرو گرنتھ صاحب میں بھی عربی اور فارسی الفاظ کی کافی تعداد موجود ہے جو کہیں تندرست اور کہیں مقامی لب و لہجے کے تلفظ کے ساتھ شامل ہوئے ہیں۔ منشی چرنجی لال لکھتے ہیں:

"اردو زبان وہ زبان ہے جس میں سب سے زیادہ ہندی، دوم درجے فارسی، سوم درجہ عربی، کچھ ترکی اور کچھ اب انگریزی وغیرہ الفاظ شامل ہیں۔ اور یہ دہلی لکھنو اور اس کے مضافات وغیرہ جہاں کی یہ مادری زبان ہے برِ صغیر پاک وہندی شمالی کے ہر قصبے و شہر کے پڑھے لکھے بولتے اور سمجھتے ہیں اور آجکل بوجہ عدالتی و اخباری زبان ہو جانے کے پھیلتی جاتی ہے"(۸)

دکن میں عربوں کی آمد اور قیام باقی برِ صغیر پاک وہند کے مقابلے میں زیادہ رہا اور وہاں افغانی، عربی، ترکی اور ایرانی صحابہ کی آمد کا تذکرہ بھی ملتا ہے دکن میں بہمنی سلطنت جو ۱۳۴۷ء تا ۱۵۲۹ء تک رہی۔ اس میں ۱۸ مسلم حکمرانوں نے حکومت کی اور ایرانی فارسی زبان کی ترقی ہوئی بہمنی عہد میں اردو اور فارسی ادب کی برِ صغیر پاک وہندی بنیاد مضبوط ہوئی دہلی اور قطب شاہی سلاطین خود بھی اکثر شاعر تھے یا علمی و ادبی شغف رکھتے تھے تو ان کے زیر سایہ زبان نے پرورش پائی اس بہمنی دور میں بہت سے ایرانی شعراء نے دکن میں آکر سکونت اختیار کی اور دربار سے وابستہ ہوئے جن میں فضل اللہ بخو، محمود گاء ونرانی. حسن گیلانی `مولانا سلامت اللہ اور ملا نظیری جیسے نام شامل ہیں۔

"عربی اور فارسی زبان کے ساتھ ساتھ ہندی زبان کے الفاظ بھی اردو کی بنیادی رکھتے چلے گئے اکثر امراء و سلاطین کے ہاں ہندو عورت حرم میں داخل ہوئیں یوسف عادل شاہ کی شادی مرہٹہ سردار مکٹ راؤ کی بہن پونجی خانم سے ہوئی ابراہیم قطب شاہ نے بھاگیارتی نامی تلگو عورت سے شادی کی جس کے صاحبزادے سلطان محمد قلی قطب شاہ تھے مسلمانوں کی نسبت سے

انہیں مقامی ثقافت اور زبان سے بڑا پیار تھا قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریاں
تاریخ کا حصہ ہیں۔ "(۹)

چونکہ ابتدا میں نثری اور شعری ادب کے نمونے زیادہ تر تصوف و مذہبی موضوعات پر مبنی تھے صوفیا نے اسی ملی جلی مقامی زبان جس میں فارسی، عربی، ہندی، اردو اور مقامی زبان کے الفاظ شامل تھے اسی کو ذریعہ اظہار بنایا۔ ساجد احمد نے یہ بھی لکھا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے کہ ہندوؤں کو موسیقی پر کافی عبور تھا وہ عوام کی اسی رغبت کو دیکھتے ہوئے مسلم صوفیاء نے بھی بھگتی شاعری کی طرز پر شلوک، شبد، ساکھی، کی مدد سے معرفتِ توحید سے متعلقہ خیالات کو عربی و فارسی زبان کے بجائے مقامی لوک گیتوں کی شکل میں بیان کیا۔

رجب علی بیگ سرورؔ کا نام لکھنوی زبان و تہذیب کے حوالے سے بہت نمایاں مقام وحیثیت کا حامل ہے اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ان کی تمام تصنیفات میں سے سب سے زیادہ شہرت "فسانہ عجائب" کے حصے میں آئی باوجود یہ کہ اس میں تصنع بہت ہے کئی کئی ایسے تصرفات بھی سامنے آئے جو تحریر کے معیار کو مجروح کرتے ہیں وہ اپنی تحریر میں کئی مقامات پر محاورات و روز مرہ الفاظ کی معنوی نزاکت و لطافت سے انکار کرتے بھی نظر آتے ہیں ہیں حتیٰ کہ تذکیر و تانیث کے بعض معاملات میں بھی زبان کی پابندی کو خاطر میں نہ لائے مگر اس کے باوجود ایک صاحب طرز ادیب اور نثر نگار و انشاء پرداز کے طور پر مشہور ہوئے۔ شروع میں انہیں مرثیہ خوانی کا بھی کافی شغف رہا بعد ازاں خوشنویسی کی طرف مائل رہے انہوں نے شاعری بھی کی مگر اس کی طرف زیادہ توجہ نہ دی "گلزار سرورؔ" میں انہوں نے فارسی اشعار کا منظوم اردو ترجمہ بھی کیا جس عہد میں سرورؔ نے لکھنا شروع کیا وہ واحد، ناسخ اور ان کے شاگردوں کا عروج کا زمانہ تھا اپنے اشعار میں بھی سرورؔ نے ناسخ کو جہاں جہاں خراج عقیدت پیش کیا اس سے ناقدین خصوصاً کیفی چڑیا کوٹی کا سرورؔ کو نہ صرف کا شاگرد کہنا قرین از قیاس بھی ہے سرورؔ کا ایک شعر ہے

بلبلے شیراز کو ہے رشک ناسخؔ کا سرورؔ
اصفہاں اس نے کیے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سرورؔ بالفرض ناسخ کے شاگرد نہ بھی تھے تو ان کی استعداد اور صلاحیتوں کے معترف ضرور تھے

"فسانہ عبرت" کی تاریخی و ثقافتی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس میں مصنف نے اس عہد کی تمام تقریبات تفریح و، ثقافتی مظاہروں، میلوں ٹھیلوں، بازاروں، رتجگوں، ناچ گانے کی محفل، شاہی جلوس اور شادی بیاہ کی رسوم کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ سرورؔ چونکہ مقفع و مسجع عبارت لکھا کرتے تھے ان کے اس اسلوب کے باعث فسانہ عجائب نے شہرت پائی، مبالغے کا عنصر بھی ایسے طرز تحریر میں غالب ہوا کرتا ہے۔ سید مسعود حسن رضوی نے اسے از سر نو ترتیب و تدوین کے بعد ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ یہ کتاب اب تقریبا ناپید ہے ۔

"فسانہ عبرت" کی اشاعت کے بعد لکھنؤ کی اخبار "قومی آواز" میں یہ تحریر شائع ہوئی:

> "فسانہ عبرت" اپنے وقت کی انشاء پردازی کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہوئے تاریخ اردو کا اہم ٹکڑا بھی ہے جس میں نصیر الدین حیدر بادشاہ، بادشاہِ اودھ کے آغاز سے لے کر اب تک وہ حالات درج ہیں جن کو لکھنے والے نے بچشم خود دیکھا یہ تحریر ان تاریخی صداقتوں کی حامل ہے جن کی تلاش تاریخ اودھ کے مطبوعہ ذخیرے میں کرنا فعلِ عبث ہے۔ فسانہ عبرت کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں اس عہد کی شاہی تفریحوں، تقریبوں اور ثقافتی مظاہروں اور نمائشوں کو خاص طور پر جگہ دی گئی ہے[۱۰]

اسی طرح یکم اگست ۱۹۵۸ء کے "صدق جدید لکھنو" کے شمارے میں لکھا گیا کہ "فسانہ عبرت" اودھ کے آخری بادشاہوں کے اس میں حالات ہیں لیکن اب تاریخ سے کہیں بڑھ کر ادب و انشاء کی کتابوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔

لکھنو کے گلی کوچوں اور بازاروں کا احوال جب ہم رجب علی بیگ کے لفظوں کے آئینے میں دیکھتے ہیں تو مناظر کی رنگینی طرز بیان کی رنگینی سے باہم دو آتشہ ہو جاتی ہے ثقافت خیال کے پردوں پر اُبھر آتی ہے اور چشمِ تصوّر میں وہ چوک اور بازار سج جاتے ہیں خوانچہ فروشوں کی صدائیں سنائی دینے لگتی ہیں جیسے:

> " کہیں قابکیں اور کھانچے ہیں، کہیں ٹھاٹھر اور ڈھانچے ہیں، کہیں بربری بکریاں بکتی ہیں، ایک او بوک ہے خریداروں کی باہم نوک جھوک ہے۔ کسی جگہ سن رسیدہ عورتیں برقع پوش کُرتی، ازاربند، گڑیاں لیے موجود کسی کے روبرو آستین کٹوری، ہتھیلی مسی سے کبود، ایک طرف میوہ فروشوں کی صدا، کہیں سقوں کے کٹورے کا کھنکنا، گرمی کی فصل میں فالودے والے غُل مچاتے ہیں، بے فکرے برف

کی قلفیاں کھاتے کھلاتے ہیں، کسی جگہ کورے گھڑوں میں فرید کی گھانس، گرد اس
کے مفلسوں کی ٹھنڈی سانس، گڑا بانس نٹ سر پر گھڑا لے کے چڑھا، کوئی سانپ
نیولے کو لڑانے کھڑا " (۱۱)

اس مندرجہ بالا پیراگراف میں مصنف نے بازار کا وہ نقشہ کھینچا ہے جہاں صرف ایک نوع یا ایک طبقے کی دلچسپی کا سامان نہیں فروخت ہو رہا دیہاتیوں کے بھیڑ بکریوں کی خرید و فروخت کے ساتھ ساتھ خواتین کے لباس، کرتی، گڑیا، ازار بند، مسی تک بکنے کو رکھی ہے میوہ فروش اپنی صدا لگا رہے ہیں اور میوہ فروشوں کی صدائیں بھی بہت دلچسپ ذو معنی اور فصیح ہوا کرتی تھیں۔

محمد باقر شمس نے "لکھنؤ کی زبان" میں ایسے نچلی سطح کے عام عوام اور پھیری والوں کے اندر شاعرانہ ذوق کے کمال کی مثالیں پیش کی ہیں جیسا کہ کلفی بیچنے والا صدا لگاتا کہ "محبت میں پگھل رہی ہے"

گنڈیری والے کی صدا ہوتی "برفی کی ڈلیاں کون کھائے گا"

جامن والا آواز لگاتا "کالی گھٹا کے کالے پھلیندے"

گولر بیچنے والا کہتا "گولر کیا ہے شہد کی کُپیاں"

بیر بیچنے والے کی آواز آتی "پیوندی بیر ٹکے سیر"

اور پان بیچنے والے کا اندازِ صدا دیکھیے جو کہتا تھا "کرتی ہے سرخرو وہ گلوری ہے پان کی"

لکھنو کی زبان میں نفاست و نرمی کے باعث اور نزاکت کی وجہ سے زنانہ پن کا الزام بھی لگایا جاتا ہے مگر یہ تو دراصل تہذیب و شائستگی کی اعلی سطح تھی۔ دلی کی تہذیب و نزاکت پر بھی ارد گرد کے دیہاتی زنانہ پن کا الزام لگایا کرتے تھے ان کے خیال میں اکھڑ پن مردانگی کی علامت ہوتا ہے اور تہذیب اور شائستگی زنانہ پن سے قریب صفت کا نام ہے۔ اسے تہذیبی بلندی کہنا چاہیے نہ کہ زنانہ پن۔ محمد باقر شمس اپنی کتاب "لکھنؤ کی زبان" میں تہذیب کی تعریف یوں لکھتے ہیں:

"تہذیب کے معنی اگرچہ لغت میں خرمے کے درخت سے چھال کا ریشہ دور
کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں ناتراشیدگی اور بھدے پن کو دور کرنے کا
نام تہذیب ہے جس چیز سے جتنا بھونڈا پن دور ہوتا جائے گا وہ اتنی نازک
ہوتی چلی جائے گی اور جب وہ اعلی معیار پر پہنچ جاتی ہے تو معاشرے کی ہر چیز
میں نزاکت آجاتی ہے۔" (۱۲)

اپنے ذاتی تجربے کی ایک مثال بھی پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک بار ان کے ہاتھ میں ہندی اخبار دیکھ کر ایک بہت ہی صاحب علم، صاحب ذوق رئیس نے پوچھا "آپ اسے سمجھ لیتے ہیں؟" اور یہی استفسار اگر لکھنوی میں کیا جاتا تو یوں کیا جاتا "ماشا اللہ ہندی سے بھی آپ کو ذوق ہے" لکھنؤ کی زبان میں محمد باقر شمس لکھتے ہیں کہ لفظ ضرورتوں کے لیے ایجاد ہوتے ہیں اور کسی شہر کی زبان اس لیے وسیع ہوتی ہے کہ وہاں کی ضروریات بھی وسیع ہوتی ہے۔ جہاں زندگی محدودیت کا شکار ہوتی ہے وہاں زبان بھی محدود ہوتی ہے دلی اور لکھنؤ دو بڑے اور مرکزی شہر تھے اس لیے ان کی زبان و تہذیب بھی بڑی تھی لکھنؤ کے جاہل عوام تک ایسی زبان بولتے تھے کہ دوسری کسی جگہ کے رہنے والے مہذب و تعلیم یافتہ بھی نہ بول پاتے ہوں گے۔ پروفیسر اعجاز حسین "مختصر تاریخ ادب اردو میں "لکھنؤ کے مشہور شاعر اور انشاء پرداز حضرت ناصری کے حالات میں لکھتے ہیں تہذیب و شائستگی کے متعلق غالباً اتنا بتا دینا کافی ہو گا کہ آپ لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ (۱۳)

لکھنؤ کے رہنے والوں کی نازک مزاجی اور نفاست پسندی نہ صرف ادنیٰ طبقاتِ لکھنؤ بلکہ عام گھریلو خواتین میں بھی آچکا تھا۔ عورتوں کی زبان جسے بیگماتی زبان کہا جاتا تھا اس میں شاعرانہ نزاکت موجود تھی شعر ہے کہ

زبان کے خلد کی ہے عورت
اگر ہو لکھنؤ کے بوستاں کی

مولانا شرر نے لکھنو کے ایک کبڑیے کی مثال دے کر کہا تھا کہ جو لکھنؤ کے کسی چوک میں پونڈے بیچتے ہوئے صدا لگا رہا تھا کہ "ارے بھائی یہ کنکوے کون لوٹے گا" یعنی یہ پونڈے لگوں کے برابر ہیں اور ان سے کنکوے لوٹے جائیں گے۔ اس طرح شیخ جان محمد شاہد نے ایک بھنگی کا ذکر کیا تھا جن سے ان کی ملاقات زمانے غدر میں قیصر باغ میں ہوئی تھی جس نے کہا تھا کہ "جان کی خیر مناؤ اور ادھر نہ جاؤ گورے کمک کو آچکے ھولاک اور جنرل اٹرم آہی چاہیے ہیں اور کیا کہوں۔

لاکھوں میں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا
گیتی ہلے گی جب عمر سعد آئے گا

"فسانہ عبرت " میں پہلا باب حکمرانِ اودھ سلطان نصیر الدین حیدر جو ۱۸۲۰ء میں بادشاہ ہوئے ان کی بابت ہے ان کے زمانے کو لکھنؤ کا عہد شباب بھی کہا جاتا ہے رجب علی بیگ سرور نے ان کے دور میں پیش آنے والی چند تقریبات کا احوال بھی لکھا ہے۔ ان کے دور حکومت کو لکھنو کا عہدِ شباب کہا جاتا ہے" تاریخ

اودھ "میں حکیم نجم الغنی نے لکھا ہے کہ ان کی لونڈیوں کا لباس بھی اس حد تک قیمتی ہوا کرتا تھا کہ مغل اعظم کی شہزادیوں یا ملکہ تک کو نصیب نہ ہوا ہو گا۔ اس دور میں یعنی ۱۸۲۰ء میں ان لونڈیوں کے ایک ایک دوپٹے کی قیمت چار ہزار تک ہوا کرتی تھی یہ کہاریاں کہلاتی تھی جن کا کام بادشاہ یا ملکہ کے تخت کو اٹھا کر لے جانا ہوتا تھا یوں لگتا تھا جیسے حسین و جمیل پریاں تختِ سلیمان اٹھائے لے جارہی ہوں۔ بادشاہ کے ہاں پانچ انگریز مصاحب بھی دربار میں ملازم تھے ان میں سے ایک مصاحب نے واپس انگلستان جا کر ایک کتاب لکھی جس کا نام "Life of an eastern king" تھا جس کا اردو ترجمہ "شبابِ اودھ" کے نام سے کیا گیا اس کتاب میں اہل لکھنؤ کی زندگی اور دربار کے حالات کے ساتھ ساتھ شاہی عوامی مشاغل اور کھیل تماشوں کا بھی ذکر ہے زنانہ پلٹون اور کہاریوں کے علاوہ بیگمات شاہی کے لباس کا بھی تفصیلی بیان موجود ہے محمد باقر شمس" شبابِ لکھنؤ میں لکھتے ہیں:

> "حرم شاہی کے فوادر میں جو چیز یورپ کو عجیب معلوم ہو گی وہاں کی زنانہ فوج ہے میں نے خود ان مرد نما سپاہیوں کو زنان ڈیوڑھی میں دیکھا ہے مجھے عرصہ تک ان کے عورت ہونے کی خبر نہ تھی ان کو پست قد مرد سمجھتا تھا کہ برِ صغیر پاک و ہندی افسر شاہی فوج کا آتا اور قواعد سکھاتا عورتیں پوری طرح بندوق تانے آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے، ادھر اُدھر گھومنے بندوق بھرنے نشانہ باندھنے سنگین چڑھانے کا کام اسی ترتیب و قواعد کے ساتھ کرتی تھی جیسے بارکوں میں ہوتے ہیں۔"(۱۴)

لکھنؤ کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ برہان الملک کے دور تک لکھنؤ میں ایک بھی شیعہ نہ تھا اور شجاع الدولہ کی بیگم "بہو بیگم" کہلاتی تھی انہوں نے خزانہ جمع کیا تھا اور اس کا نام "جونرا بھونرا" رکھا تھا۔ شجاع الدولہ کی وفات کے بعد انہوں نے اپنا خزانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس جمع کروایا جس کے سود سے اپنے ملازمین کی پشت در پشت تنخواہیں بھی مقرر کروائیں انہوں نے ایک عربی مدرسہ بھی قائم کروایا اور بہو بیگم نے اپنے مقبرے کے لیے دس لاکھ روپیہ دیا۔ مرنے کے بعد بچھتر لاکھ روپے نکلے جن سے مقبرہ تعمیر کیا گیا۔

لباس کے حوالے سے شاہی خواتین کے لباس کے شاہانہ ہونے کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور میں شاہی مغلانی یعنی درزن کی تنخواہ ہزار روپے ماہوار تھی فسانہ عبرت میں بادشاہ نصیر الدین حیدر کے عہد کا تذکرہ کرتے ہوئے رجب علی بیگ سرور لکھتے ہیں:" مغلانی ہزار پانچ سو ماہانہ کی نوکر تھی گوٹے لچکے کرن کی کترنیں اتنی پاتی تھیں کہ سونے چاندی کی اینٹیں گھڑواتی تھیں۔"(۱۵)

"لکھنو کی تہذیب" میں محمد باقر شمس نے نسائی زبان و محاورہ کی بابت لکھتے ہیں کہ لکھنوی تہذیب میں ہر طبقے کی خواتین کے زبان و محاورات مختلف اور مخصوص ہوا کرتے تھے عورتیں اعضائے بدن کا نام تک اصطلاحات میں لیا کرتی تھیں۔ طبیب یا حکیم کے ہاں بھی مختلف اعضاء کے لیے اصل لفظ کے بجائے مخصوص نسائی الفاظ کی وضع کردہ اصطلاح بولی جاتی تھی جیسے رحم یا بچہ دانی کو ٹھیکری کہا جاتا تھا جو رحم میں ورم بولنا ہوتا تو دایہ حکیم صاحب کو بتاتی کہ: "ٹھیکری میں ورم ہے" یوں گفتگو کرتیں کہ جب کہنا ہوتا کہ "کھانا کھا رہے ہیں" تو کہا کرتیں کہ "دستر خوان پر ہیں" اور جب یہ بتانا ہوتا کہ "وہ نہا رہے ہیں" تو کہتیں "وہ حمام میں ہیں کیوں کہ کہ غسل کا لفظ صرف مُردوں کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ مزید لکھتے ہیں کہ سانپ کو "زمیں والا" یا "گھر والا" کہتیں۔ لکھنوی عورتوں کے مخصوص محاورے ہیں اور بہت بلیغ بھی ہوتے ہیں:

> اسی طرح بندر کو "ڈولی والا" کہتی دھوبن کا نام لینے کے بجائے اس کو "اجلی" کا لقب دیا گیا تھا اور اسی طرح مختلف کوسنے اور بد دعائیں ایسے دیتیں جیسے حلوہ کھائے یعنی مُردے کو روئے یہ حلوہ کھانے کا مطلب ہوتا تھا کہ اپنے کسی عزیز مُردے کو رونے پیٹنے کے معاملے میں وہ "ہے ہے کرے" کا جملہ استعمال کرتی تھیں۔ "ہم کو پیٹے ہمارا حلوہ کھائے یعنی ہم کو ہے ہے کرے جو ہم سے چھپائے اسی طرح مزاج عالی، مزاج گرامی، مزاج اقدس، عورتیں نہیں کہتی تھی بلکہ کہتی تھی "مزاج اچھا ہے" [۱۶]

واجد علی شاہ اختر چونکہ شہنشاہانِ اودھ میں سے آخری بادشاہ تھے ان کے عہد میں ان کی صاحبزادی اور صاحبزادوں کی شادی کا سارا حال، آنکھوں دیکھا احوال رجب علی بیگ سرورؔ نے مکمل جزئیات کے ساتھ بیان کیا ہے یہ شادی ۱۲۶۶ ہجری میں قرار پائی تھی۔

دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ کی ریاست میں دکھاوے اور نمود و نمائش کی ثقافت کا عروج تھا کہ مصنف لکھتے ہیں کہ مہندی کے دن چراغاں کا وہ عالم تھا کہ گویا آسمان کو زمیں نے مات دے دی ہو اور ماہ و انجم حیران رہ گئے۔ تیل کی نہریں جاری کی گئیں اور وہ غریب غربا جن کے ہاں مدت سے چراغ نہیں جلے تھے وہ گھڑے بھر بھر لے گئے۔ مہندی اور ساچق کی رسم قدیم دور سے آج تک جاری ہے اگرچہ آج کی جدید طرز حیات میں اس کے طور اطوار میں تبدیلی آچکی ہے مگر دلہن کے ہاں بری کا سامان جوڑا، مہندی کی تمام چیزیں لے کر جانا اور اسی طرح اور دیگر سامان بھی لے جانے کی رسم دیہی علاقوں میں آج بھی موجود ہے۔ رجب علی بیگ سرورؔ نے ساچق کے دن کا احوال تفصیل سے بیان کیا اور لکھا ہے کہ اس دن شہر کے گرد و نواح سے بھی

اس قدر مزدور بلائے گئے کہ دیگر کاروبارِ حیات ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ مزدوروں نے سامانِ ساچق کی طشتریاں اور چوگھڑے اٹھا رکھے تھے۔ یہ رسومات خواتین کے دم سے ہی زندہ تھیں۔ خواتین نے ہر رسم کی اختراع اور پھر اس کے بعد میں چھوٹی چھوٹی چیزیں شامل کر دی تھی۔ نمود و نمائش کا دور دورہ تھا پُر تکلف سماجی زندگی ان کا خاصہ تھا مہندی کی رسم خالصتاً زنانہ رسم ہے۔

ثقافت ہمیشہ آسودہ حال اور ترقی یافتہ معاشروں میں بنتی ہے اور ترتیب پاتی ہے اس کا معیار کبھی نچلے طبقے کی طرزِ معاشرت پر نہیں رکھا جاتا۔ ایسے معاشرے کے نچلے طبقے کی عوام ضروریات زندگی کے بھنور میں قید رہ کر ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی فکر میں رہتے ہیں ان کے ہاں رسم و رواج بھی پابندیوں کے سوا اور جبر کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتے وہ مجبوراً رسم و رواج بھی نبھاتے ہیں۔

"فسانہ عبرت" کا عہد نصیر الدین حیدر سے لے کر واجد علی شاہ کے عہد تک مشتمل ہے۔ اس کتاب میں رجب علی بیگ سرورؔ نے لکھنو کی ثقافتی زندگی کا ایک تاریخی جائزہ پیش کیا ہے۔ جہاں ہمیں نسائی زندگی کے رنگ بھی اپنی جھلک دکھلاتے ہیں اور نسائی تہذیب کے وہ پُر تکلف حوالے ان کے شب و روز کے معمولات، خصوصاً ان کی رسومات اور مشاغل کا پتا چلتا ہے۔ چونکہ اس کتاب کے پانچوں ابواب کا موضوع شاہی خاندان کی شخصیات ہیں اس لیے ہمیں عام عورت کی زندگی کی بابت کم آگاہی ملتی ہے۔ مگر شہر کی مجموعی سرگرمیاں ایک طائرانہ جائزہ ضرور فراہم کرتی ہیں۔ جہاں ہم نسائی ثقافت کے رنگ سہولت سے دیکھ سکتے ہیں۔

ب) تاریخی و ثقافتی اردو نثر میں نسائی زبان و محاورہ (۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء)

i ۔ خطوطِ واجد علی شاہ: واجد علی شاہ اخترؔ

واجد علی شاہ نے فورٹ ولیم کالج میں نظر بندی کے ۲۶ ماہ کے دوران جو خطوط کی بیگمات کے نام لکھے ان میں چند خطوط منظوم خطوط بھی ہیں۔ انہوں نے ایام اسیری کو خط و کتابت اور اپنے مختلف شعری اور نثری نگارشات کو مرتب کرنے میں گزارا ان سب خطوط کے مجموعوں میں ان کی بیگمات کے ناموں کے ساتھ تاریخ لکھا ہے جیسے: تاریخ مذہب، تاریخِ ممتاز، تاریخِ نور، تاریخِ مشغلہ، تاریخِ خاص، تاریخ دہر، تاریخ جمشید، تاریخِ بدر اور تاریخِ غزالہ وغیرہ:

تاریخ جمشیدی: اس میں بیالیس فارسی اور اردو خطوط شامل ہیں جو ۱۲۷۳ تا ۱۲۷۵ میں لکھے گئے۔ تاریخ ممتاز کا خوبصورت نسخہ جسے واجد علی شاہ نے خود مرتب کروایا تھا برٹش میوزیم میں رکھا ہے۔ یہ خطوط ۱۸۷۵ء تا ۱۸۷۶ء کے دوران لکھے گئے اس کے بعد ڈاکٹر محمد باقر نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اسے مرتب کر کے چھپوایا۔

"عشق نامہ "فارسی قلمی نسخہ ہے جس میں سلطانِ عالم نے اپنی عمر کے پہلے ۲۶ سال تک کے عشق محبت کے حالات بیان کیے ہیں" عشق نامہ "۱۲۸ عشق کی داستانوں سے مزین ہے اسی عشق نامہ کو" پری خانہ "کے نام سے تحسین سہروردی نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔" انہوں نے اپنی زندگی کا کوئی گوشہ نہیں چھپایا اچھا یا برا سیاہ یا سفید روشن یا تاریک جو کچھ دیکھا جو کچھ کہا جو دل میں آیا اس کو بغیر کسی جھجک اور تامل کے بیان کر دیا "(۱۷)

تاریخ نور: یہ باون خطوط ہیں جن میں نورزمان بیگم کے دو خطوط ایسے بھی ہیں جن سے اس وقت کے سیاسی حالات کی خبر ملتی ہے اور لکھنؤ کے اجڑنے کا نوحہ واضح سنائی دیتا ہے وہ لکھتی ہیں کہ صرف چند گھوڑے اور سولہ ہاتھی جانور خانے میں بچے ہیں جن کو جلد نیلام کیا جائے گا۔ وہ چاہتی ہیں کہ واجد علی شاہ حسام الدولہ بہادر کو لکھے کہ وہ ہاتھی گھوڑے خرید کر نور بیگم کو سونپ دیں تا کہ وہ اپنے سر تاج کی نشانی کو پیار و محبت سے پال سکیں۔ اس کسمپرسی میں انہیں گھر بار سب کچھ بیچ کر ان کی خوراک کا بندوبست کرنا پڑے۔ ان کے ایک خط میں ان کے الفاظ پڑھ کر سخت دکھ ہوتا ہے کہ گردشِ زمانہ نے ان سے سب کچھ چھین کر محتاج بنا دیا ۔نورالزمان بیگم کے الفاظ یہ ہیں" گھر بھی لٹا مکان بھی کھدا دربدر ہوئے آنکھوں سے دیکھا جو کچھ نہ دیکھا تھا۔ زندگی باقی تھی جان بچ رہی ان دنوں تنگدستی بہت ہے واسطے دانہ بریاں کے محتاج ہوں قرض خواہوں کا جان پر تقاضا ہے، حسرت اور تنگدستی بہت زیادہ ہے ہماری جلد خبر لیجئے۔ یہ خطوط اورینٹل لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں۔

تاریخ فراق: تاریخ فراق کا ایک قلمی نسخہ بھی پٹنہ اورینٹل کالج میں محفوظ ہے جو ۱۲۷۵ء کا لکھا ہوا ہے اس میں بیگم دہر نواب نوروزی بیگم عرف جانی بیگم جو نور تخلص کیا کرتی تھیں اپنی چند غزلیں بھی اصلاح کو بھیجی تھیں۔

تاریخ بدر عالم: چوبیس خطوط پر مشتمل بیگم بدر عالم جان کے خطوط ہیں جو بدر عالم کے نام سے شاعری بھی کرتی تھی یہ نسخہ حیدرآباد دکن کے کتب خانے میں رکھا ہے۔

تاریخ غزالہ: اس نسخے کی ایک کاپی سید مسعود حسن رضوی کے ذاتی کتب خانے میں بھی موجود ہے جس میں اکیس خطوط شامل ہیں کہ ۱۲۷۶ھ میں مرتب کر کے شائع کیا گیا تھا۔

تاریخ مذہب: اس میں نواب شیدا بیگم کے نام خطوط ہیں جس کے حاشیے سونے کے پانی سے بنائے گئے تھے۔

گلدستہ محبت: گلدستہ محبت بائیس خطوط جو فریدوں بیگم کے نام لکھے گئے تھے اس نسخے کے کاتب حسیب الدین احمد بردوانی تھے یہ ۱۲۷۶ھ میں مرتب ہوا اور اس کا نسخہ بھی پٹنہ یونیورسٹی میں موجود ہے۔

افسر التواریخ : بیگم نواب جمشید بیگم کے خطوط ہیں جو انہوں نے واجد علی شاہ کو لکھے تھے اس کو ۱۲۷۵ء میں مرتب کیا گیا اس نسخے میں بیگم جمشید نے اپنے شاعر بھائی سے غزلیں بھی لکھوا کر بادشاہ کو روانہ کیں تاکہ ان کی کیفیاتِ قلبی کا کچھ بیان ہو سکے۔ ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ اکثر بیگمات اپنے خطوط لکھوانے کے لیے کسی اچھے انشاء پرداز سے خدمات حاصل کیا کرتی تھیں تاکہ بادشاہ کے اعلیٰ ادبی ذوق کے موافق اور ان کے شایانِ شان الفاظ میں احوال بیان ہو۔ بادشاہ نے انہیں بیس یا تیس روپے ماہوار پر ملازم رکھ لیا تھا تاکہ بیگمات کو سہولتیں خاطر رہے۔

تاریخ مشغلہ: یہ نواب آبادی جان بیگم کے نام خطوط کا واحد مجموعہ ہے جو اس وقت دستیاب ہے باقی کے مجموعے بعد میں شائع نہ ہو سکے اور ناپید ہیں۔

عبدالحلیم شررؔ جب اپنے منشی نانا جان کی جگہ ان کی علالت کے دنوں میں ملازمت کر رہے تھے تب انہیں شاہی خطوط کو محفوظ کرنے کا فریضہ سرانجام دینا ہوتا تھا انہیں یہ خطوط پڑھنے کا موقع ملتا رہا جن کی رومان پرور رومان بھری تحاریر اور انشاپردازی نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی یہ حدود خصوصاً زمانے کی یادگار ہیں جب واجد علی شاہ کو فورٹ ولیم کالج میں نظر بند کیا گیا تھا۔

سید مسعود حسن رضوی لکھتے ہیں:

> " نظر بند یا قید کا یہ طوالانی زمانہ انہوں نے لکھنے پڑھنے میں گزارا۔ دو معروف مثنویاں بھی اسی زمانے کی تصنیف ہیں ان کے بہت سے خطوط اور غزلیں جو

نظر بندی کے زمانے میں کہی گئی تھی ۔۔۔انہوں نے زیادہ تر وقت اپنے
دورافتادہ بیگمات سے خط و کتابت کرنے اور خطوط کے مجموعے مرتب کرنے
میں صرف کیا۔"(۱۸)

واجد علی شاہ اختر نے ایک میں اپنے حسن و ملال اور تنہائی اور پیغامات سے دوری کو یوں نظم کیا ہے

ملا مجھ کو یا رب تو اولاد سے
چھڑا پھر مجھے قیدِ بے داد سے

حزنِ اختر کے مقدمے میں عبد الحلیم شرؔر نے لکھا ان کے الفاظ یہ ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ بادشاہ عورتوں کے عشق میں دیوانہ ہو رہے تھے اور بعض
حسینوں سے اس درجہ محبت تھی کہ قید میں جب ان کے وسائل سے محروم
تھے تو ہر وقت انہیں یاد کیا کرتے اور بار بار ان سے یادگارِ محبت کے طور پر
ان کی خاص خاص چیزیں مانگ بھیجا کرتے بعض فرمائش پوری کر دیتی تو خوش
ہو جاتے اور بعض ناز آفرینی اور شوخ ادائیں کے انداز سے نہ بھیجتی تو شکایت
کرتے ۔ دلدار محل سے ان کی مسی مانگی انہوں نے بھیج دی، اختر محل سے
ان کی زلفوں کے بال منگوائے انہوں نے بھیج دیئے جن کو ہمیشہ سرہانے
نظر کے سامنے رکھتے اور بار بار سونگھتے۔"(۱۹)

تاریخ اودھ کی روایات و ثقافت میں نسائی زندگی، زبان اور سماجی حیثیت کو جاننے کے لیے اس عہد کی ادبی تصنیفات سے جہاں ہمیں نسائی اردو زبان میں محاورہ کے شواہد ملتے ہیں وہاں اس کے پہلو بہ پہلو ثقافتی تناظرات کے در بھی وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ماقبل ۱۸۵۷ء چونکہ کوئی تسلی بخش قابل اعتماد ایسا وسیلہ نہیں ملتا جو بلاواسطہ نسائی قلم تک رسائی کر سکے ۔ مہ لقاچند ابائی کا ایک دیوان تھا اور پھر چند رسائل میں خواتین کی تحریریں جو سامنے آنا شروع ہو چکی تھی ان میں اکثریت ان کی تھی جو اپنا اصل نام چھپاتی تھی اور کسی مردانہ نام سے لکھا کرتی تھی یا کسی فرضی مردانہ نام سے کام لیتی تھیں جن سے واضح نہیں ہو سکتا تھا کہ مصنف مرد ہے یا عورت دوسری بڑی وجہ ان کو شعوری کوشش سے اپنی تحریر کو ایسا رنگ دینا پڑتا تھا کہ وہ پتہ نہ چلے کسی خاتون نے لکھی ہے عورت کی زندگی جس قسم کے حالات سے دوچار ہوتی ہے اس کی سماجی حیثیت اور مقام و مرتبہ اور افراد معاشرہ کے رائے اس کی ذاتی جذباتی و محسوساتی دنیا اور تربیت کے رنگ جن جن طریقوں سے اظہار

بخشتی ہے ان میں سے بڑا ذریعہ قلم بھی اگر اسے میسر نہ ہو تو وقتی طور پر اسی دستکاری، خانہ داری کے معاملات میں خود کو صرف کر دیتی ہے یا مختلف رسوم ورواج میں اختراع کرتی رہتی تھی اپنے لباس اور زیورات کی دنیا میں جدت طرازیاں کیا کرتی تھی۔ واجد علی شاہ نے پری خانہ میں جن خواتین کا ذکر کیا ہے جو بچپن تا چھبیس سالہ زندگی تک اور ان کے کسی نہ کسی طرح قریب رہی تھیں اور ان سے عشق و عاشقی کے معاملات رہے۔

واجد علی شاہ کی ایک تصنیف "عشق نامہ، جو" محل خانہ شاہی" کے نام سے بھی شائع ہوئی اس فارسی قلمی نسخے کا بامحاورہ اردو ترجمہ مرزا فدا علی خنجر نے کیا اور اس کا مقدمہ لکھا۔ اس نسخے کے سرورق پر رقم ہے کہ "یہ نسخہ رنگین طبیعت والوں کے لئے تیر و نشتر سے کم نہیں اگر آپ کو اس نوع کے عشق کے اصلی جذبات دیکھنا ہوں تو اس کو ضرور پڑھیے "[۲۰]

ان کی تفصیلات پڑھنے سے ۱۸۵۷ء سے قبل کی عورتوں کی زندگی ان کی عادات و اطوار، ان کے زیب وزینت کے انداز اور ان کی گفتگو سے اخذ کئے جانے والے الفاظ و محاورات سے اس عہد کے نسائی اردو زبان و محاورہ کی صورتحال واضح ہوتی ہے اور ثقافتی و تاریخی حالات وواقعات بھی کہیں کہیں جھلکتے ہیں۔

واجد علی شاہ کی محلات و بیگمات کے نام خطوط کی مجموعی تعداد نو ہے مگر ان میں سے صرف ایک دو تک ہی رسائی ممکن ہے کچھ برٹش میوزیم میں ہیں کچھ آسٹریا کے قومی کتب خانوں کے ریکارڈ میں موجود ہیں۔ ان کی کل تصنیفات کی درست تعداد جاننا تو مشکل ہے مگر اس نے اپنی ایک "بنی" نامی کتاب میں ۴۶ کتب کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی یہ کتاب ۱۸۵۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ تمام تر تلاش و تحقیق کے باوجود ان کے چار مجموعوں کا قلمی نسخہ کہیں نہیں ملتا جو خطوط پر مبنی تھے جن کے نام تاریخی خاص، تاریخی مذہب، تاریخ اور تاریخِ مشغلہ ہیں۔ بیگمات کے خطوط جن مجموعہ میں شامل تھے۔ ان میں سے ایک کا نام "افسر التواریخ" اور دوسر" مخزن الاسرار سلطانی (رقعاتِ بیگمات) ہے جسے محمد امتیاز علی خان نجیب فرخ آبادی نے مرتب کر کے ۱۹۰۲ء میں شائع کیا۔ اس میں بیسیوں محلات و بیگمات کے وہ خطوط ہیں ہیں جن کا بنام واجد علی شاہ اور خطوط واجد علی شاہ کے بنام بیگمات ہیں۔ اور انتظام اللہ شہابی اکبر آبادی نے ان کا ایک مجموعہ ترتیب دیا جسے دلی سے شائع کیا گیا تھا اور اس میں ساٹھ خطوط واجد علی شاہ کے چودہ خطوط بادشاہ کے استاد کے تھے چار عدد خطوط بیگمات نے ایک دوسرے کو لکھے تھے یوں اس کی کل تعداد اٹھتر بنتی ہے

"تاریخِ مشغلہ" واجد علی شاہ کے اردو خطوط کے مجموعے کا نام ہے جو انہوں نے نواب آبادی جان بیگم کے نام لکھے تھے کیونکہ واجد علی شاہ بادشاہ کم اور فنکار زیادہ تھے لہذا ان کے مزاج کی رنگینی اور متنوع

جہات کے ادب و موسیقی میں بے شمار پہلو ایسے ہیں جو سامنے آتے ہیں۔ زیر بحث مجموعہ کو محمد اکرام چغتائی نے شائع کروایا اور پیش لفظ میں لکھتے ہیں کہ اودھ کے تمام سابقہ حکمرانوں کے اندر جو خواص اور مشاغل موجود تھے وہ تمام واجد علی شاہ کی ذات میں جمع ہوگئے تھے یہ مجموعہ اس لئے دستیاب نہیں کہ اس کو آسٹریا کے قومی کتب خانے میں دیکھا گیا ہے اور اس برِ صغیر پاک و ہند میں دوسری کاپی دستیاب نہیں ہوسکی آسٹریا کے کتب خانے میں یہ قلمی نسخہ مخطوطات میں ایک خاص کوڈ نمبر پر لکھا ہے۔

CODEX VINDOBONNENSIS PA LATINUS

محمد اکرام چغتائی لکھتے ہیں کہ یہ نسخہ عمدہ خطِ نستعلیق میں لکھا گیا ہے اور خوبصورت حاشیے بنائے گئے۔ کل خطوط چوبیس ہیں جو تمام نواب آبادی جان کے نام ہے۔ چھے فصلیں مہینوں کے نام کے تحت عنوان کی گئی ہیں۔ ۱۲۷۲ ہجری میں پہلا اور ۱۲۷۶ ہجری کے محرم الحرام تک آخری خط لکھا گیا۔ نواب آبادی جان بیگم واجد علی شاہ کے پری خانہ میں شامل ہونے سے پیشتر ایک طوائف تھی اور بادشاہ کے رہس میں اس نے رادھا کا کردار بھی ادا کیا تھا جس کے باعث کئی خطوط میں وہ اسے رادھا بھی کہہ کر پکارتے ہیں یہ بھی شواہد ملے ہیں کہ اس کا اصل نام کچن بائی کیا تھا جو تائب ہو کر بادشاہ کے حرم میں داخل ہوئی تھی جب بادشاہ اسیر ہوئے تو کچھ بیگمات کلکتہ چلی گئیں اور کچھ ادھر ادھر مختلف علاقوں میں جا چھپیں اور کچھ نے وہیں لکھنؤ میں رہ کر ہی حالات کے بدل جانے کا انتظار کیا۔ جب حالات اس قدر دگرگوں ہوئے کے نانِ جویں تک کی محتاجی آ گئی تو ان میں سے جو طوائفیں تھی وہ اپنے پہلے پیشے کی طرف ہی پلٹ گئیں۔ واجد علی شاہ کو جب معلوم ہوا تو سخت دل گیر ہوا کرتے تھے۔ نواب آبادی جان بیگم نے بھی یہی کیا مگر کچھ عرصے بعد تائب ہونے کی خواہش کا اظہار کیا جس پر واجد علی شاہ نے کشادہ دلی سے انہیں مشروط تائب نامہ بمہ دستخط گواہان کے شاملِ حرم ہونے کی صورت سے آگاہ کیا مگر اس سے پہلے لکھا کہ

> "باعفت اور عصمت میرے نام پر اگر بیٹھا منظور ہے اور باقی ایام میں حیات بہ حلال گزارنا ہو تو خیر ساری رام کہانی تمہارے عشق کی سچی اور جو فقط دل لگی اور چھیڑنا اور طبیعت آزمانا منظور ہے تو مجھ سے کروڑ ہا بندگانِ خدائے تعالیٰ اور موجود ہیں اور روز پیدا ہوئے جاتے ہیں اور روز دنیا سے اٹھتے جاتے ہیں۔"[۲۱]

نواب آبادی جان بیگم رقص و موسیقی میں خوب تربیت یافتہ تھی اور حسن و ادا میں بھی کمال حاصل تھا۔ شعر و شاعری کا شوق بھی فرماتی تھیں کبھی نثر میں خط لکھتیں اور کبھی کبھار شعر موزوں کرتی

تھیں۔ مجالس عزا منعقد کروانے کی شوقین تھی مگر اس مجلس میں مرد میں شریک ہوا کرتے تھے واجد علی شاہ نے ایک خط میں انھیں کہا کہ صرف زنانہ مجلس کروائے۔ (چار ذیحجہ ۱۲۷۲ھ) بادشاہ کے فورٹ ولیم سے رہائی پانے اور مٹیابرج منتقل ہونے کے بعد لکھنؤ سے آبادی بیگم ان سے بے تابانہ ملنے کو جاتی ہے اور اپنی کیفیات کا اظہار اس طرح کرتی ہے "[۲۲] ایک عورت جب اپنے محبوب سے ملتی ہے تو اس وقت اس کے جذبات و محسوسات کیسے ہوتے ہیں ان کیفیات کے اظہار کے لیے یہ خط ایک مثال ہے۔ نسائی جذبات اپنے ایک ایک لفظ میں کیف و نشاط کے خمار سے بوجھل ہیں۔ عبارت مقفع و مسجع ہے نثر رواں اور پُر از معنی ہے۔ تشبیہات و استعارات کا استعمال بخوبی کیا گیا ہے،۔ شیر و ہرن، ہجر و وصال، ہشیاری و مدہوشی اور گل و بلبل کی طرح کی تراکیب کا برمحل استعمال ہے جو اس چند سطری اقتباس سے جھلک رہا ہے شُستہ و رفتہ کلام ہے ان خطوں کے باہمی تبادلے کو "تودونامے" جاتا تھا۔

> "جھپٹ کر اپنے گل سے مثلِ بلبل ہم آغوش ہوئی۔ بادہء عیش و سرور سے عین ہشیاری میں مدہوش ہوئی، کیا کہوں کیسے مزے ہمکناری کے لُوٹے، دامنِ دل سے داغ ہائے ہجر و فراق شست و شوئے وصل سے چھُوٹے، خوب جی بھر کے پیار کیا، نقد دل ہزار جان سے نثار کیا، تادیر سینہ بہ سینہ لب بہ لب رہے صایم کی طرح مائلِ رطب رہے۔ بارِ فراق سر سے اتار کر پھول کی مانند ہلکا بدن ہو گیا۔ شرابِ وصل سے سرشار ہو کر شیر کی مانند اس طرع ڈکاری کہ نشہ فراق ہرن ہو گیا اس کا مزہ عمر بھر فراموش نہ ہو گا ایسی بلبل شیدا نہ ہو گی ایسا محبوب گلپوش نہ ہو گا"[۲۳]

چونکہ یہ تمام خطوط کلکتہ میں ایامِ نظر بندی میں لکھے گئے تھے لہذا ان میں جابجا اپنی تباہی و بربادی **کا رونا** ملتا ہے۔ گردش زمانہ کے ستائے ہوئے بادشاہ کی بے بسی نظر آتی ہے جو سخت پریشان ہجر کا مارا اداسی و تنہائی کا شکار ہے خط میں اپنی بیگم کو لکھتا ہے کہ نامحرم سے پردے کا اہتمام رکھنا کوئی اجنبی نامحرم تمہاری صورت نہ دیکھنے پائے۔ خطوط میں لکھنویت کا خاصہ یعنی پر تکلف اور مقفع و مسجع زبان ہے اور کہیں رواں، سہل نثر نگاری کا نمونہ بن جاتی ہے اکثر جگہوں پر طویل قافیہ پیمائی سے رجب علی بیگ سرور کے اسلوب کا گماں گزرتا ہے مثلا: "لسان الخاقان، غزل خوان، مشغلہ السلطان نواب آبادی بیگم جان صاحبہ بلبلِ گلزارِ محبت اے طوطیءچمنستان موالفت، سر حلقہ شاہدان پاکبازے مالدار قدر انداز، اے میری عاشقہ اے محبوبہ صادقہ۔"[۲۴]

اپنے ایک خط میں جو جان عالم نے ۱۶ شوال ۱۲۷۵ہجری کو لکھا تھاانتہائی دل گرفتہ ہو کر اپنے مالی مسائل کا ذکر کرتے ہیں انگریز سرکار کی طرف سے محض چار لاکھ سالانہ دورانِ قید وصول پانے کا بیان کرتے ہیں کہ وہ بہت جلدی ختم ہو جاتے ہیں بلکہ ریوڑیوں کی طرح بٹ جاتے ہیں۔اور "رہس منزل" کی تعمیر کے لیے دس ہزار کے مطالبے پر شکوہ کناں ہیں ان کے خطوط میں کہیں کہیں اشک پرونا،ہِل ہِل جانا، آنکھ بھر آنا، غم کا پہاڑ کاٹنا، جل جل بھُس ہو جانا، بلائیں لینا جیسے نسائی محاورات سے کام لیا گیا ہے۔اور فارسی الفاظ وتراکیب سے مزین شاعرانہ اسلوب گہرے نقش چھوڑتا ہے۔چونکہ شاہی محلات کی اکثر محلات و بیگمات پڑھنا لکھنا جانتی تھیں اور کئی ایک خود شعر بھی کہتی تھیں،رواں نثر بھی لکھتی تھیں تو ان کا مذاق بہت شائستہ تھا۔کئی ایک نے خط لکھنے کو مکتوب نگار تنخواہ دار رکھے ہوئے تھے۔

چونکہ زیورات عورت کی فطری کمزوری ہیں اور عورت بھی اگر لکھنو کے شاہی ماحول کی ہو اور اس پہ مصداق اگر نواب آبادی جان کی طرح اس کا پس منظر بھی طوائف کا ہو جس کا پیشہ ہی سجنا سنورنا تھا۔پھر وہ رہس کی رادھا بھی رہ چکی تھی۔ اس کچن بائی کے لیے زیورات کتنی اہمیت رکھتے ہونگے۔ واجد علی شاہ اپنے خطوط میں ایک جگہ پانچ مرصع انگوٹھیاں بطور تحفہ بھیجنے کا ذکر کرتے ہیں اور ایک جگہ بجلیوں کا ایک جوڑا خرید بھیجنے کا ذکر کرتے ہیں۔

اپنے ایک خط میں محبوبہ سے عکسی تصویر بنا کر بیجنے کی فرمائش کرتے ہیں جو ایک روایتی عاشق کا اندازِ فرمائش ہے مگر ساتھ ہی اپنے تہذیبی رکھ رکھاؤ کے باعث قیمت ادا کرنے کا بھی لکھتے ہیں تاکہ تصویر بنوا بھیجنے میں کوئی تامل یا دشواری نہ ہو۔واجد علی شاہ کے قلم نے اردو زبان کو کئی غزلیں، مثنویاں، مراثی اور رہس کے لئے منظوم کلام اور خود نوشت کے علاوہ خطوط کا اثاثہ بخشا ہے ان کی ایک تصنیف "بنی" ہے جس میں آپ بیتی بھی ہے، داستان بھی ہے افسانہ بھی، حکایات بھی ہیں اور عملی زندگی کے حقائق بھی، تاثراتی حیات بھی ہیں اور رومانوی جذبات بھی،اس میں نفسیاتی گہرا مشاہدہ بھی نظر آتا ہے اور ایک حساس فنکار کا عکس بھی جھلکتا ہے۔رہس کو پڑھیں تو ہمیں آج کے تھیٹر کا ہدایتکار ملے گا اور "پری خانہ عشق" کے صفحات میں جذبات میں ڈوبا حسن و عشق کا متلاشی عاشق نظر آئے گا۔سب سے اہم بات یہ کہ ان کی تصانیف میں لکھنؤ کی زبان اور معاشرت کے حقیقی عکس کا مشاہدہ سہولت سے کیا جا سکتا ہے۔واجد علی شاہ بطور آخری فرمانروائے اودھ میں جو بھی خامیاں موجود تھیں یا جو بھی حالات درپیش رہے ان میں اس کے کردار کی بابت بحث کرنا اس موضوع سے متعلقہ نہیں مگر اس کی تحریروں سے جو تاریخی، ثقافتی، علمی و ادبی شخصیت کی کردار نگاری کا نمونہ ہمارے

سامنے آتا ہے اس بابت رئیس احمد جعفری "واجد علی شاہ اور ان کا عہد" میں لکھتے ہیں کہ "وہ آرٹسٹ اور فنکار بھی تھے اور مصنف اور مؤلف بھی، وہ شگفتہ طبع اور بذلہ سنج بھی تھے اور جودتِ فکر و نظر کے سرمایہ دار بھی، وہ نثار بھی تھے اور شاعر بھی، وہ ماہر موسیقی بھی تھے۔"(۲۵)

رئیس احمد جعفری نے لکھا ہے کہ واجد علی شاہ کے توسط سے ہندی الفاظ و محاورات کے مستند طریقہ استعمال کو توثیق اور کشادگی عطا ہوئی ان کے کلام میں ہمیں زبان کے استعمال کی بہترین مہارت کلام میں تاثیر اور تراکیب میں جمال پسندی کا اہتمام نظر آتا ہے جب ان کو کلکتہ کے لئے لے جایا جارہا تھا تو انہوں نے اس سفر میں یہ اشعار کہے ہیں:

زمانہ تھا کہ پسا کرتے تھے گوہر پاؤں کے نیچے
پر اب ہے دھوپ سر پر اور کنکر پاؤں کے نیچے

ان کے بیگمات کے نام مکتوبات میں تو ہمیں معاملاتِ قلبی کا احوال ملتا ہے مگر ان کی "دفعاتِ قانون اختری" کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگا بہت بڑی کوتاہی شمار ہوگا کہ جن کے توسط سے ہمیں خواتینِ لکھنؤ بلکہ بیگمات و محلات کے واسطے نافذ العمل دفعات کا علم ہوتا ہے کہ ان کو کس کس طرح سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی جو کہ واجد علی شاہ کے حرم میں سیکڑوں بیگمات تھیں۔ بھارت کے ہر علاقے سے تعلق رکھنے والی طوائفیں جو اپنا پیشہ چھوڑ کر آئی تھیں۔ کہارنیں، فوجی تربیت لینے والی، موسیقی میں ماہر، شاعری کرنے والی، بیوہ، مطلقہ، عمر میں بہت کم سن بھی اور واجد علی شاہ سے بڑی بھی، ہندو سے مسلمان ہو کر شامل حرم ہونے والی بھی اور حبشن بی، شیریں، فضہ جیسی بھی، مذہب شیعہ اور سنی دونوں مسالک سے وابستہ عورتیں بھی موجود تھیں۔ "بنی" میں ان سب کے لئے چند صفحات کا ہدایت نامہ موجود تھا جس میں سے چند کا ذکر یوں ہے کہ

۱۔ کسی نامحرم مرد کو نظر نہ چھوئے۔
۲۔ کسی نامحرم سے بات کرنا پڑے تو نظر جھکا کر کی جائے۔
۳۔ کسی نامحرم کو پان کی گلوری دینا جائز نہیں۔
۴۔ کسی مرد کو حقہ پیش کرنے کی اجازت نہیں۔
۵۔ کسی نامحرم کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں لینی دینے والا زمیں پر رکھ جائے تو اٹھالو۔
۶۔ کسی نامحرم کا صفاتی نام لینے کے بجائے اس کے فرقے یا پیشے سے پکارو جیسے کبوتر باز داروغہ باغبان ماہی پرور وغیرہ۔ بیگمات واجد علی شاہ کے لیے ضروری دفعات بہت دلچسپ تھیں جیسے:

۱-ہمیشہ خوشبو لگائے رکھنا۔

۲-ہاتھ سے اور منہ سے کوئی بدبو نہ آئے۔

۳۔پاؤں ہمیشہ آئینے کی طرح صاف رہیں۔

۴-ہمیشہ ہاتھوں پر مہندی آنکھوں میں کاجل بال رنگے خوشبودار رہیں۔

۵-کنواریاں مسی نہ ملیں، جب تک حکم نہ ہو۔

۶-طلب کرنے پر بلا تاخیر اور بے حجاب حاضر ہوں(۲۶)

"پری خانہ" کا قلمی نسخہ فارسی زبان میں لکھا گیا تھا اور اس کا اردو ترجمہ تحسین سہروردی نے کیا، نجم الغنی خان رامپوری نے "تاریخِ اودھ" کی پانچویں جلد میں اس تصنیف کا تفصیلی ذکر بھی کیا جو واجد کی مثنویوں میں سے انھیں ملا۔ پری خانہ میں واجد علی شاہ نے اپنے عشق و محبت کی داستانیں یادداشتوں کی صورت میں رقم کی ہیں جن میں پہلی عورت رحیمن کی عمر ۴۵ سال تھی اور واجد علی شاہ آٹھ برس کے تھے جب وہ شرارتا چھیڑ چھاڑ کیا کرتی تھی۔ پھر دوسری عورت آنکھ میں سفید تل والی امیرن شوخ رنگ لباس و آرائش میں رہتی تھی، تیسری کی عمر بائیس برس، گھنگھریالے بال، ہاتھوں پہ مہندی، ہونٹوں پر مسی، سڈول بدن اور خوشبوؤں میں بسی سینے پرونے میں ماہر خاتون تھی جو واجد علی شاہ کی نظروں میں جچی۔ موتی خان شاعرہ بھی تھی غزل اور مثنوی لکھا کرتی تھی پسند آئی۔ ننھی بیگم عمر ۱۸ برس سید انشاءاللہ خان کی نواسی ذاکرہ بھی تھی۔ چنی بیگم ایک خوبرو طوائف تھی جو پیشہ چھوڑ کر داخلِ حرم ہوئی اور اس کو دلربا پری کا نام دیا گیا تھا۔ سرفرازی جب آئی تھی تو گیارہ برس کی تھی جوان ہونے پر انکو بیگم کا عہدہ ملا۔ عجائب خانم، حاجی خانم، سلیمان محل، شیریں حبشن، فضہ حبشن، آرام سلطان، مصطفی بیگم اور بہت سے نام ہے جن سے واجد علی شاہ کو معاملات محبت رہے ہر کسی سے اس شدت سے محبت ہو جاتی کہ اس کے لئے رات کی نیند اڑ جاتی دن بھر آنکھیں متلاشی رہتی حیرت ہوتی ہے کہ ہر بار نیا عشق پہلے سے زیادہ زوردار ہوتا تھا ہر ہجر ایسا جانگسل ہوتا کہ بادشاہ سلامت آنسوؤں سے رویا کرتے اور تو اور ثبوت عشق کے لئے محبوبہ کی انگوٹھی گرم کر کے اپنی ران کو جلا لیتے اور ثبوت محبت کے طور پر دکھایا کرتے تھے۔

الغرض ان سب معاشقوں کی تفصیل بتانا مقصود نہیں صرف اس پس منظر کا ذکر کرنا مقصود تھا کہ جس کے تحت ہمیں اس عہدِ واجد کے لکھنو کی عورتوں کے مشاغل، عادات و اطوار، سجنے سنورنے کی روایات، اظہار محبت کے معروف طریقے، خاطر داریاں، ادائیں، گفتار، سماجی ماحول اور زبان سے آشنائی حاصل ہو۔

پری خانہ کی پریوں کے کردار وہ نسائی کردار ہیں جو اس عہد کی ثقافتی زندگی کی جھلک پیش کرتے ہیں۔ جن کے تجزیاتی مطالعے سے ہمارے سامنے لکھنؤ کی عورت مجسم ہو کر آجاتی ہے اور پھر یہ واجد علی شاہ کا قلم تھا جس نے ان کرداروں کو ان کے حقیقی زندگی کے رنگوں سے مزین کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ان خواتین کا لباس کس قسم کا ہوا کرتا تھا؟ انکا طرز گفتار کیا تھا؟ عادات واطوار کے امتیازات کیا کیا تھے؟ کونسے فنون میں ماہر تھیں کون کس چیز میں طاق تھی کس کو رقص و سرور سے دلچسپی تھی کون اچھی شاعرہ یا نثار تھی کس کو سلائی کڑھائی کا سلیقہ تھا اس وقت حسن کے عمومی معیارات کیا تھے؟ پردے کا رواج کس حد تک تھا الغرض انسانی زندگی کے بہت سے پہلو سامنے آجاتے ہیں شادی بیاہ سے لیکر محرم میں سوز خوانی، نوحہ خوانی، تعزیہ نکالنے، صدقہ و خیرات اور تحائف دینے کی رسومات سے لے کر شادی بیاہ مہندی مانجھے کی تفصیلات تک طشتریوں سجانے اور بطور تحفہ بھیجنے کے واقعات تک بلکہ محبت جتانے کو خودکشی کے واقعات بھی اس پری خانہ کے توسط سے اردو زبان و تاریخ کے قاری تک پہنچ جاتے ہیں۔

واجد علی شاہ جو ڈرامہ نگار بھی تھے نثار بھی تھے تو ان کے خطوط میں کئی ضرب الامثال اور محاوراتِ اردو پڑھنے کو ملتے ہیں جیسے دودھ کا جلا چھاچ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے، دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کیا رکھنا، چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات، دوگانہ کی رسم جس کا ذکر ریختی کے باب میں تفصیل ہو چکا ہے۔ واجد علی شان نے ایک مغلانی جس کا نام بنو صاحب اور عمر ۲۳ برس تھی۔ اسے اپنی "دوگانہ" کا بھی کالقب دیا تھا جو دونوں میں گہری دوستی کا تعلق رہا اور دل کی باتیں کہہ سن لیتے تھے وہ باعصمت اور شادی شدہ مغلانی تھی۔ سوزاک کے مرض میں مبتلا ہونے پر جب تمام بیگمات نے نواب کو تنہا چھوڑ دیا تو ان کا عورت کی ذات سے وفا کا یقین ختم ہو گیا کہتے ہیں "اگر کوئی عورت مر جاتی تو میں یہی کہتا کہ شاید قبر میں بھی کوئی فریب کرنے گئی ہوگی جب تک اس مرنے والی کا جنازہ نہ ہو جاتا ہے اس کا یقین نہ آتا۔"(۲۷) یہاں ہمیں عورت کی فطرت کا مشاہدہ واجد علی شاہ کے واقعات سے بخوبی ہوتا ہے کہ میں ان کی آپس کی رقابتیں بھی چلتی رہتی تھی مزاج کے اختلاف بھی تھے اور مشاغل بھی مختلف تھے کچھ محض پیسے کے لالچ میں یہاں آئیں اور چند ایک تو بقول واجد علی شاہ اسے خواب میں دیکھ کر اس پر فدا ہو گئیں اور گھر بار چھوڑ کر یہاں آن پڑیں۔ زنانہ حرم میں زنانہ فوج کی تربیت یافتہ خواتین کا دستہ بھی موجود رہتا تھا جس کی نگران بھی محل ہوتی تھی یہ ایک ایسی دنیا تھی جس میں رنگِ ثقافت، نسائی حیات و جذبات کی عکس بندی کرتا ہے اور ہم لکھنوی خواتین کے زندگی کا جائزہ لے سکتے ہیں جو شاہی گھرانے سے کم از کم کسی نہ کسی صورت میں وابستہ رہیں۔

کسی بھی علاقے یا زبان کی تہذیب اور ثقافتی پس منظر کو سمجھنے کے لیے کسی ایک عہد کا مطالعہ کافی نہیں ہوتا تہذیب ہزاروں سالہ تاریخ میں بنتی اور بگڑتی ہیں برِ صغیر پاک و ہندی رسوم و رواج، زبان اور تہذیب کے

پیچھے یہ ہزاروں برس پر محیط تاریخی سفر اثرانداز ہوتا چلا آیا ہے مذاہب اور وطن تو بدلے جاسکتے ہیں مگر ان کو بدل کر بھی ہم تہذیبی اثرات سے مکمل طور پر آزاد نہیں ہوسکتے کروڑوں انسان اپنا مذہب بدلتے رہے ہیں اور نئے مذہب میں داخل ہوکر بھی اپنی تہذیبی روایات سے یکسر باہر نہیں جاسکے اسلام عرب کے ریگستان سے نکل کر ساری دنیا میں پھیلا مگر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اسلام افریقہ سے یورپ تک ایشیا سے امریکہ تک جہاں جہاں پہنچا وہاں کے قبائل یا اقوام آج بھی اپنے اپنے مخصوص تمدنی تہذیبی اثرات سے یکسر خود کو نہیں نکال سکے اسلام کی خلافت کا سیاسی پس منظر جب بادشاہت میں تبدیل ہوا تو تمام روایات بھی تبدیل ہوتی چلی گئی خلافت راشدہ سے درباران بنو امیہ و بنو عباس تک کا سفر کسی کی نظر سے پوشیدہ نہیں لہٰذا زبان بھی انھی مخصوص تہذیبی و تمدنی حالات کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہی ہے اور اپنے اندر وہ تمام ثقافتی و سماجی حوالے محفوظ کرتی چلی جاتی ہے جو اس تہذیب میں موجود ہوتے ہیں۔

اسی تسلسل میں جب ہم دلی اور لکھنؤ کی نسائی زبان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس نسائی زبان کے الفاظ وتراکیب سے لے کر ضرب الامثال تک اور روزمرہ محاورات سے لے کر نسائی فکر و مزاج میں ڈوبے مخصوص الفاظ لوریاں، پہلیاں، سہاگ گھوڑیاں اور گیتوں تک ایک مخصوص ثقافتی و تاریخی رنگ ملتا ہے۔ یہاں کی خواتین کا پردے میں رہنا بھی ان کی خالص اور مخصوص زنانہ اصطلاحاتِ زبان دانی کو متاثر کرتا رہا۔ سماجی زندگی کے انداز و اطوار بھی اس زبان کی چاشنی کو بڑھاتے چلے گئے۔ کم تعلیم یافتہ ہونے کے باعث بہت سی توہمات نے بھی کئی رسوم کو جنم دیا جن پر صدیوں سے عمل ہوتا چلا آرہا ہے مگر ان کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے مثلاً آبخورے سے سر پر پانی ڈالنے سے بال خورہ یعنی بال چر اور بال جھڑنے کی بیماری ہو جاتی ہے، جھاڑو کسی کو چھو جائے تو سوکھے کا مرض لاحق ہو جاتا ہے، رات کو کنگھی کرنے سے گھر میں پریشانی آتی ہے، ہاتھوں کی انگلیاں چٹخانے سے نحوست پھیلتی ہیں، پھکنی کسی کو مارو گے تو وہ موٹا ہو جائے گا، جس مکان کی کڑیاں یعنی لکڑی کے شہتیر چر چراتے ہوں وہ منحوس ہے، جوتے پہ جوتا آجائے تو سفر درپیش ہو گا، جو بچہ پاؤں کے بل پیدا ہو وہ کسی کی کمر پر لات مارے تو اس کی چک دور ہو جائے گی وغیرہ وغیرہ اسی طرح بہت سی رسومات کا پس منظر بھی بے بنیاد ہے مگر ان سب کے پیچھے وہ تاریخی پس منظر اور تہذیبی ماحول نظر آتا ہے جس میں یہ خواتین زندگی گزارا کرتی تھی چار دیواری کے اندر کی محدود زندگی جس میں ہر لڑکی کو غیر مرد کے سائے سے بھی دور رکھا جاتا تھا حتیٰ کہ رشتہ دیکھنے کو آنے والی مشاطہ یا خواتین سے بھی چھپا کر رکھا جاتا تھا۔

مشاطہ یا وہ خاتون جو اس نیت سے لڑکی دیکھنے آتی وہ کسی نہ کسی حجن، بُزارن یا درزن وغیرہ کے روپ میں آکر جائزہ لینے کی کوشش کرتی تھی۔ بڑی بوڑھیوں کی کڑی نگرانی میں زنان خانہ کی لڑکیاں قیدی ہوتیں، شادی ہو جانے کے بعد گھر سے ڈولی اور سسرال سے جنازہ یعنی ڈولا باہر نکلتا تھا۔ سفر و حضر کی ضرورت در پیش ہوتی تو کہاروں سے پردہ ہوتا تھا ڈولی بھی ڈیوڑھیوں میں رکھی جاتی تھی وہیں سے اٹھائی جاتی۔ خواتین کی پیدائش سے لے کر ساری زندگی کا وقت تادم مرگ عموماً انہیں چار دیواریوں میں گزرتا تھا جہاں انہوں نے اپنا الگ جہان آباد کر رکھا ہوتا بے شمار رسوم و رواج اور تقریبات کے پیچھے بھی یہی ماحول کار فرما نظر آتا ہے باہر کی دنیا باہر کی زندگی میں ان کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا اس لیے گھریلو زندگیوں میں انہوں نے بے شمار رنگ جمع کر لیے تھے۔

سید احمد دہلوی نے رسومِ دہلی لکھ کر نہ صرف دہلی کی خواتین کی زندگی کے معمولات پر روشنی ڈالی بلکہ بے شمار وہ نسائی الفاظ و محاورات بھی ہم سے متعارف کروا گئے جو اردو زبان کا اثاثہ ہیں۔ بلاشبہ ہم ان مرد لکھاریوں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے لسانی سطح پر اس زبان کو ہم تک پہنچایا اور محفوظ کیا ان میں اردو زبان و ادب کے وہ تمام انیسویں صدی کے اہل قلم شامل ہیں جنھوں نے داستان سے ناول تک اور ناٹک سے ریختی تک ان الفاظ و محاورات، ضرب الامثال اور کہاوتوں کو شاملِ تحریر کیا نسائی شعور کی تہذیبی جہات کو متعارف کروایا معمولات حیات کو محفوظ کیا۔ آج ہم پیچھے نظر ڈالیں تو ایک بڑا ذخیرہ اس نسائی زبان کا ہمارے پاس موجود ہے اس نسائی زبان کے ذخیرے کو محفوظ کرنے والوں میں سے ایک نام سید احمد دہلوی کا بھی ہے جن کا سب سے بڑا حوالہ "فرہنگِ آصفیہ" ہے جس کا ذکر لسانی تناظرات میں تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔

ii ۔ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گزشتہ لکھنؤ: عبدالحلیم شررؔ

"مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گزشتہ لکھنؤ" از عبدالحلیم شررؔ کو اردو ادب کی ثقافتی تاریخ کا پہلا نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ عبدالحلیم شررؔ نے جو کتابیں لکھیں جن میں سوانح عمریاں، تاریخی ناول، خیالی ناول، نظم و ڈرامہ اور تاریخ کے علاوہ متفرق موضوعات پر مضامین اور تراجم شامل ہیں مگر ان کے ناول "فردوسِ بریں" یا پھر مذکورہ کتاب "گزشتہ لکھنو" کو زیادہ یاد رکھا گیا۔

خاکی قزلباش نے شررؔ کے ناولوں پر تحقیق کرتے ہوئے ان کی تعداد تینتیس بتائی ہے۔ رام بابو سکسینہ نے A History of Urdu Literature میں اکتیس ناولوں کے نام رقم کیے ہیں اس کے علاوہ شررؔ نے

"دلگداز" کے نام سے رسالہ نکالا اور پھر "دلگداز" میں ان کے تاریخی ناول قسط وار چھپنا شروع ہو گئے جس کے باعث وہ برِ صغیر پاک و ہند کے خواص و عام میں مقبولیت اختیار کر گئے۔انہوں نے "اودھ پنچ" اور "مہذب" میں لکھا اور اس کے علاوہ یکے بعد دیگرے ماہنامہ" دل افروز "ماہنامہ "الفرقان "ماہنامہ "مورخ "اور ہفت روزہ "ظریف" بھی جاری کئے۔ان کی زندگی کے چھیالیس سال علم وادب کی خدمت میں گزرے گزشتہ لکھنوان کے قلم کا وہ شاہکار ہے جس نے لکھنوی تہذیب کو تاریخ کا حصہ بنانے میں اور اس تہذیب کے تمام رنگوں کو ان کی انفرادیت کے ساتھ الگ الگ محفوظ کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔انھوں نے یہ ثقافتی تاریخ کچھ اس انداز سے رقم کی کہ ایک ایک پیراگراف دلچسپی سے پُر ہے اور قاری کے سامنے جیتا جاگتا خوشبو اور رنگوں میں ڈوبا لکھنؤ زندہ ہو جاتا ہے۔مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گذشتہ لکھنؤ کو رقم کرنے میں عبدالحلیم شررؔ کی ذاتی زندگی اور مشاہدے کو دخل نہ ہوتا اور مٹیا برج کے شہزادوں کے ساتھ نہ کھیلے ہوتے تو شاید تحریر میں یہ تاثیر اور دلچسپی کے عناصر پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔لکھنو برِ صغیر پاک و ہند کا ایک شہر نہیں رہا ایک خاص تہذیب کا مرکز بنا اور اس تہذیبی کا مرکز بننے سے پیشتر اس کا شہرہ ایسا نہ تھا۔

۱۷۹۷ء میں نواب آصف الدولہ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے اور ان کے اخلاق باختہ شہزادے نواب وزیر علی خان نے میں ان کی مسند سنبھالی چار ماہ کی مختصر مدت میں ناقص کردار اور بے ہودہ حرکات کے باعث معذول ہوئے۔نواب آصف الدولہ وہ نواب تھے جنھیں فوج کشی جنگ و جدل سے خاص دلچسپی نہ تھی وہ عیش و عشرت میں گرفتار ہوئے اور اس گزشتہ لکھنو کی رنگا رنگ ثقافت اور عیش پرستی کے عہد کا آغاز ہوا جس نے تمام اہل لکھنؤ کو اپنے رنگ میں رنگ لیا اس نے جنگی بہادری اور شجاعت کا رعب ڈالنے کے بجائے اپنے معاصرین ریاستی درباروں خصوصا نظام حیدرآباد اور میسور پر اپنے دربار کی شان و شوکت کروفر اور دکھاوے کی روایت کو جنم دیا شررؔ لکھتے ہیں:

"اپنے بیٹے وزیر علی خان کی شادی میں انہوں نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا تزک و احتشام تاریخ ارض کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا برات کے جلوس میں بارہ سو ہاتھی تھے دولہا جو شاہی خلعت پہنے تھا اس میں بیس لاکھ کے جواہرات ٹنگے ہوئے تھے محفل کے لیے وہ عظیم الشان اور پر تکلف خیمے لگوائے گئے جن میں ہر ایک چالیس فٹ چوڑا اور بارہ سو فٹ لمبا اور چالیس فٹ بلند تھا اور ایسا عمدہ نفیس قیمتی کپڑا لگایا گیا تھا کہ ان دنوں اس کی تیاری میں سلطنت کے دس لاکھ روپے صرف ہو گئے "(۲۸)

گورنر جنرل بہادر نے ان کی جگہ ان کے سوتیلے بھائی نواب سعادت علی خان کو تخت پر بٹھایا۔

۱۸۱۴ء میں ان کی وفات کے بعد غازی الدین حیدر نے مسند حکومت سنبھالا وہ ایک فضول خرچ، آرام پسند اور عیش پرست نواب تھے ان کے پورے کے خاندان کا مذہب شیعہ تھا اور یہی وہ نواب تھے جن کے دور میں نئی نئی مذہبی رسوم کا آغاز ہوا اور تمام لکھنؤ کی شیعیت کی عجیب و غریب رسومات نے دنیا کو حیران کر دیا اس نے لکھنؤ میں روزہ نجف اشرف کی نقل بنوائی اسی کے دور میں امام اثر کی چھٹی کی رسم ادا ہوتی اور زچہ خانہ مرتب کیے گئے۔ سیدوں کی خوبصورت بیٹیوں کو "اچھوتیاں" کہہ کر آئمہ اثنا عشر یعنی بارہ اماموں کی بیبیاں قرار دیا جاتا۔

۱۸۲۷ء میں نصیر الدین حیدر نے مسند شاہی سنبھالا جو عورتوں کا سالباس پہنتا عورتوں جیسی باتیں کرتا، زچہ خانہ میں حاملہ عورت بن کے بیٹھتا تھا اور فرضی آہ و کراہ سے وضع حمل کی تکلیف ظاہر کرکے بچہ جنتا پھر اس کی زچگی کی تمام تر رسومات ادا کی جاتیں۔ ۱۸۳۷ء میں اسے زہر دے کر ہلاک کیا گیا اور چونکہ یہ لاولد تھا لہذا نصیر الدولہ ولد محمد علی خان جو مرحوم سعادت علی خان کے بیٹے تھے تخت نشیں ہوئے یہ مذہبی اور علمی رجحان رکھتے تھے اس کے بعد امجد علی شاہ کا عہد حکومت شروع ہوا جو ثقہ مولوی سمجھے جاتے تھے ان کے صاحبزادے ۱۸۴۸ء میں واجد علی شاہ نے تخت سنبھالا یہی واجد علی شاہ ہیں جن کے دور کو مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دیا جاتا ہے اور تمام تر لکھنوی تہذیب کا آخری بھڑکتا ہوا شعلہ انھیں کا عہد حکومت تھا شرؔر نے ان کو مرثیہ کا آخری بند قرار دیا ہے۔ وہ لکھنؤ کے بانکے تھے انہوں نے عیش و عشرت کی داستان میں وہ ابواب رقم کئے جو ان سے پیشتر نہیں تھے۔ ان میں صرف ایک شاعری کو شریفانہ مذاق کی دلیل کہا جاسکتا ہے علاوہ ازیں ان کا عہد رقص و موسیقی آوارگی دکھاوے اور بے فکری کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے ۱۸۵۶ء میں انہیں انگریز سرکار کے حکم پر تخت چھوڑنا پڑا اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد کلکتہ سے چند میل کے فاصلے پر مٹیابرج انگریز حکومت کی ماہوار تنخواہ کی تجویز کو قبول کرتے ہوئے جاکر آباد کیا مٹیابرج میں انہوں نے اپنی زندگی کے شب و روز یوں گزارے کہ لکھنو پیچھے رہ گیا اور مٹیابرج جنت ارضی کا نمونہ پیش کرنے لگا۔ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ گزشتہ لکھنو کے لسانی و ثقافتی پہلوؤں پر گفتگو کرنے سے پیشتر یہ ضروری تھا کہ اس شہر کی مختصر تاریخ کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے تاکہ اس کے تاریخی و ثقافتی حیثیت کو واضح کیا جاسکے کیونکہ لکھنؤ برِ صغیر پاک و ہند کا وہ تہذیبی مرکز تھا جس سے اردو ادب کی تاریخ اور بنیاد و ارتقاء کا گہرا رشتہ ہے یہاں کی فضاؤں میں مثنوی بدر منیر، گلزار نسیم، طلسمِ الفت، بہارِ عشق اور زہر عشق جیسی مثنویاں تصنیف ہوئیں

اندر سبھا جیسے ڈرامے لکھے اور پیش کئے گئے مرثیہ گوئی نے انیس و دبیر جیسے گوہر یگانہ اردو زبان کو دیے ہزل گوئی میں اولین نام جعفر زٹلی کا ابھرا، ریختی کی روایت نے یہیں سے جنم لیا اور فسانہ عجائب جیسی یادگار تصنیف اسی ماحول کی عطا ہے۔ ضلع جگت، طبی اور یونانی حکمت نے بھی یہیں عروج پایا۔ "اودھ پنچ" اخبار اور " دلگداز " نے یہی آغاز و ارتقا کی منازل طے کیں۔ یہ ایک شہر سے ایک دبستان کی حیثیت اختیار کر گیا اور اردو زبان وادب کے علاوہ برِ صغیر پاک وہند میں خاص ثقافتی نمونے کی حیثیت سے تا دیر یاد رکھا جائے گا۔

گزشتہ لکھنو کا انگریزی ترجمہ E.S. HARCOURT اور فاخر حسین نے کیا جو لندن سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا اس کے پیش لفظ میں انہوں نے لکھا

> “Lakhnow' the last phase of an Oriental culture can be said to be a fulfillment of its author's life aim . The work has long been recognised by indo-islamic scholars as a primary source of great Value' a unique document' both alive and authentic in every detail ' of an important Indian culture at its Zenith. And in many a Muslim household in the Indian subcontinent today this work may be found, read, and studied by the older and the younger generation as a reminder of and an introduction to their past "[۲۹]

آج ہم "فسانہ ءعجائب" یا "گزشتہ لکھنؤ" کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس ماحول کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں اس کی ثقافت کی رنگارنگی اور اس کے رسم و رواج اور ادب و آدابِ معاشرت کی ایک الگ آباد دنیا سے ملاقات ہوتی ہے۔ مولانا عبد الحلیم شررؔ کو مٹیا برج میں رہنے کا اتفاق ہوا اور اوائل عمری میں وہاں اپنے والد محترم کے ساتھ رہنے کے باعث ان کے ذہن پر اس ماحول کے نقش ایسے ثبت ہوئے کہ پھر تاحیات نہ مٹ سکے۔ شررؔ کے والد اور نانا دونوں کی ملازمت وہاں تھی۔ شررؔ کی کوئی باقاعدہ ابتدائی تعلیم کا سلسلہ نہ بن سکا اور گھر میں والدہ سے قرآن پڑھتے تھے مگر سال بھر میں پہلے پارے سے آگے نہ بڑھ پائے لہذا والد صاحب نے انہیں اپنے ساتھ لے جانے کا قصد کیا اور بچپن ہی میں مٹیا برج کی صحبتیں میسر آئیں۔ وہ اپنے اس قیام کے دنوں کی یادیں تازہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں شہزادوں کی صحبت اور شب و روز ان کی محفل میں رہنے سے مجھے اپنی زبان کی اصلاح میں بڑی مدد ملی۔ ان کا کہنا تھا کہ اتنا ہی نہ تھا کہ میں صرف باہر ہی سے مل کر چلا آتا بلکہ محل کی خواص اور محل دارنیاں بار بار آ کے ملتیں، گھنٹوں پاس بیٹھ کے باتیں کرتیں اور ان کے انداز گفتگو اور الفاظ دونوں کو سنتا اور لطف اٹھاتا میرے ہم سن، دوست شہزادے جلال بہادر کی والدہ نواب صدر محل نہایت

شائستہ اور تعلیم یافتہ بیگم تھی شعر و سخن میں اس وقت کے نامی شاعر گلشن الدولہ بہار کی شاگرد تھی ان کا دیوان مرتب ہو کر چھپ گیا تھا جس کے اشعار بہت سے لوگوں کی زبان پر تھے۔

"وہ اپنے بیٹے کا دوست سمجھ کر میرے حال پر شفقتِ مادرانہ فرماتیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ محمد جلال کی طبیعت کچھ ناساز ہوتی تو مجھے بے تکلف بلوا لیتی انکی محل دار جو ایک شوخ اور رنگین مزاج بوڑھی عورت تھی روز میرا نکاح ٹھہرایا کرتی اور میرا اگرچہ دل چاہتا تھا مگر والد کے خوف سے ہمیشہ ٹال دیا کرتا لیکن ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ ان باتوں کا میرے مذاق اور زبان پر کیسا کیا اثر پڑا ہوگا"(۳۰)

عبدالحلیم شررؔ مٹیابرج میں اپنے نانا منشی قمرالدین کی جگہ منشی السلطان کے دفتر میں بخشی گری کی محرری پر بھی فائز رہے، وہاں انہیں ان تمام خطوط کو پڑھنے کا موقع ملتا تھا جو شاہی ریکارڈ میں رکھے جاتے اور بادشاہ کے نام عالیات بیگمات اور محلات کی طرف سے آیا کرتے تھے۔ گزشتہ لکھنؤ کو تحریر کرتے وقت وہ نوعمری اور الوائل جوانی کے ذاتی مشاہدات ان کے پیش نظر تھے اور انہوں نے ثقافتی تاریخ مرتب کرتے ہوئے وہ سارے رنگ اس تصنیف میں شامل کر دیے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں: "اخبار کی وابستگی سے مولانا کو اپنے جوہر طبع دکھانے کے لئے وسیع میدان نصیب ہوا ان کے مضامین زیادہ تر علمی تخلیقی اور فلسفیانہ ہوتے تھے اسلوب نگارش میں اچھوتا پن ہوتا"۔(۳۱)

"گزشتہ لکھنو کی تدوین و ترتیب بھی کئی نامور اہل قلم جن میں رشید حسن خان جیسے نام شامل ہیں ان کے ہاتھوں ہو چکی ہیں عبدالحلیم شررؔ نے اس کتاب کو چوون ابواب میں تقسیم کیا اور ان ابواب کے عنوانات نہیں دیے بلکہ ان کے اسے ۵۴ تک نمبر دیے ہیں. اس کے علاوہ انہوں نے جہاں جہاں ضرورت پڑی تو تاریخ و سنین لکھنے کی وہاں اس نے سن محمدی درج کیا ہے جو مقبول نہ ہو سکا کتاب کے اولین ابواب میں اودھ، حیدرآباد اور لکھنؤ کی تاریخ رقم کی ہے یہ ایک اجمالی خاکہ ہیں جس کو لکھنوی تہذیب کے پس منظر میں بیان کرنا ضروری تھا لکھنؤ کا نام لچھمن، مچھلی بھون یا مچھلی باون قلعہ کے نام سے پڑا. یا اودھ اجودھیا سے نکلا یہ امکانات اور نظریات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ مچھلی بھون دراصل عہد اکبری میں صوبیدار عبدالرحیم کا تعمیر کردہ قلعہ تھا جس کے محرابوں اور ستونوں کے بیچ ۵۲ مچھلیوں کی اشکال بنی تھیں۔ یہاں پر بسنے والی اقوام اور ان کے مختلف پیشوں کی بابت بیان ہے کہ مختلف ادوار میں تعمیر ہونے والی عمارات، باغات، امام باڑے، قلعے اور کوٹھیوں کا ذکر ہے مسلم اور ہندو آبادیوں میں شہریوں و دیہی انداز تعمیر اور یہاں کے معروف بازاروں کا بھی

ذکر کیا گیا ہے۔ ہر حکمران نواب اور سلطان کے اندازِ حکومت اور مزاج کے فرق کو بھی بڑی خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔

لکھنوی عوام کے مشاغل جانوروں کی لڑائیاں میلے ٹھیلے اور محافل کی تفصیلات درج ہیں۔ بارہویں باب سے اردو ادب کے معروف شعراء جن میں دہلی سے لکھنؤ آکر آباد ہونے والے شعراء میر سوز، سودا، میر تقی میر کا ذکر ہے انہی کے ہم عصر دیگر اہم شعراء جو گرد و نواح سے یہاں آکر آباد ہوئے ان کا ذکر ہے اور حسرت، مصطفی، قتیل، رنگین، آتش، ناسک، شوق، دیا شنکر نسیم، امیر جلال نسیم دہلوی کو بھی شامل تحریر کیا گیا اور اس کی مثنوی اور ڈرامے کے عروج کو تفصیلا بیان کیا گیا۔ واسوخت اور ریختی کی اصناف کا بھی جائزہ لیا گیا اور "اودھ پنچ" جو لکھنؤ کی پہچان بنا اور شہرت حاصل کی اس میں "فسانہ آزاد" کی اشاعت کا حوالہ ہے خوش نویسی کے رجحانات بھی لکھنو میں بہت تھے اور جسمانی کھیلوں کے باب سترہ میں مختلف مقبول فنون حرب جن میں:

پھینکتی: جس میں کھلاڑی بایاں بازو بایاں پاؤں زمیں پر جمائے رکھتا ہے اور چاروں طرف پینترے بدل بدل کر لکڑی چلاتا ہے۔

بانک: جس میں بیٹھ کر چھری یا خنجر سے دونوں حریف ایک دوسرے پر وار کرتے ہیں

بنوٹ: حریف کا ہتھیار گرا دینا ایک رومال میں سکہ باندھ کر ایسی جگہ چن کر مارنا کے درد و اضطراب بے چین کر کے رکھ دے اور پٹہ بازی اور بانا بازی کا مختصر مگر دلچسپ احوال بیان ہے۔ مرغ، بٹیر، تیتر سے لے کر ہاتھی، کتے، شیر، چیتے، گینڈے، بارہ سنگھے مینڈھے تک لڑائے جاتے تھے۔ کبوتر بازی اور پتنگ بازی کے بڑے پیمانے پر مقابلہ جات ہونے کی تفصیلات ہیں آلات موسیقی میں ڈھول تاشے، نوبت، ترہی قرنا فوجی، بگل اور ڈنکے بجانے کے بعد تقریبا نصف کتاب یعنی اٹھائیسویں باب سے کھانے پینے کا بیان اس قدر دلچسپ واقعات کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے کہ قاری حیرت میں ڈوب جاتا ہے آج وہ کھانے وہ رکاب دار تو موجود نہیں مگر ان کو شررؔ نے ہمیشہ کے لئے تاریخ میں محفوظ کر دیا بلا شبہ یہ ایک بہت بڑی صنعت اور بہت عظیم فن تھا جس میں انوکھے تجربات کیے جاتے اور لذتِ دہن کا سبب بنتے تھے۔ تین ابواب میں یہی ذکر ہے اور تیسویں باب سے لباسِ مرد و زن مسلم و ہندو دیہی و شہری خواص و عام کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ اس کے بعد زیورات کا باب ہے اور اڑتیسویں باب میں آداب و اخلاق کا ذکر ہے پھر طرز تعمیر اور بعد ازاں شادی و غمی کی تقریبات اور مروجہ رسوم کا اجمالی خاکہ بیان کیا گیا ہے پھر میلاد اور محرم کی محافل سوز خوانی، مرثیہ خوانی، امام باڑوں اور

مجالس کے ابواب ہیں اور آخری چار باب تک متفرق لکھنوی آداب، پان، حقہ، سواریوں ڈولی، بیل گاڑی اور مختلف ظروف کے ذکر پر اختتام ہے

یہ مختصر خلاصہ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ گزشتہ لکھنو کا پیش کیا گیا اب اس میں مصنف کے اسلوب الفاظ کے چناؤ اور انتخاب کا ذکر کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ شرر جو ایک ڈرامہ نگار اور ناول نگار بھی تھے شاعر اور تاریخ نویس بھی تھے سوانح نگاری بھی کی مگر اس ثقافتی تاریخ کو لکھتے ہوئے انہوں نے تاریخ نویسی اور سوانح نویسی کے اصولوں کو زیادہ پیش نظر رکھا اور تصنیف کو غیر افسانوی بننے سے بچانے کے لیے کسی اضافی جملے کا سہارا نہیں لیا نہ ہی اس بیان میں ان کے کسی خاص مذہبی اور سماجی رجحان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے سوائے ایک جگہ جہاں خواتین کے لباس کا ذکر ہے اور اس میں ساڑھی کے حوالے سے مصنف صرف تھوڑے سے جذباتی ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں لکھنؤ کے مسلم اور ہندو خواتین بھی اب ساڑھی پہننا شروع کر چکی ہیں اور جواز یہ ہے کہ اس میں سادگی ہے جبکہ یہ غلط ہے اور برملا کہتے ہیں کہ میں اس کے سخت خلاف ہوں کہ اپنی وضع نہیں چھوڑنی چاہیے۔

مصنف نے اس تاریخی دستاویز کو لکھتے ہوئے خاص خیال رکھا ہے کہ ان کا بیانیہ انداز خالصتاً تاریخی حالات وواقعات تک محدود رہے۔ یہ کتاب نہ تو کوئی ناول تھا نہ داستان کہ جس میں ادبی زبان و محاورہ یا چاشنی سے تحریر کو دلچسپ بنایا جاتا۔ اس لیے ہمیں اس میں نسائی زبان و محاورات تو کُجا ادبی تحریر کا شائبہ تک نہیں گذرتا، مگر اس کے باوجود لکھنو کی ثقافتی زندگی کسی افسانوی تحریر یا داستان سے کم دلچسپ نہیں۔

iii۔رسومِ دہلی: سید احمد دہلوی

سید احمد دہلوی نے "رسوم دہلی" میں تمہید کے طور پر لکھا ہے کہ دہلوی ثقافت ہندو مسلم تہذیب کا امتزاج ہے بلکہ مسلمانوں کے ہاں بھی جو رسومات پیدائش سے موت تک ادا کی جاتی ہیں وہ برِ صغیر پاک و ہندی تہذیب کی پروردہ اور صدیوں سے قائم ہندوانہ رسومات ہی کی ایک شکل ہے بہت سی رسوم جوں کی توں موجود ہیں اور بہت سی تھوڑے بہت ردوبدل یا نام کی تبدیلی کے ساتھ اپنائی گئی ہیں۔

دہلی اور لکھنو چونکہ دو قدیم برِ صغیر پاک وہندی ثقافت وادبی سرگرمیوں کے دبستان شمار کیے جاتے ہیں اور دونوں شہروں کی تہذیبی سرگرمیوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ و ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اس لئے ان دو اہم شہروں کا تذکرہ ثقافتی سطح پر بھی تخصیص سے کیا جاتا ہے اور شہری زندگی اس عہد کے

تمام تر عروج کی مثال ہوا کرتی ہے یہاں تمام سیاسی، سماجی، ادبی سرگرمیاں پروان چڑھتی ہیں۔ "تاریخ کی تلاش" میں ڈاکٹر مبارک علی شہری آبادیوں کی تاریخ اور ان کی ثقافت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسانی تاریخ میں ہمیشہ سے دیہی زندگی شہری زندگی سے متصادم رہی ہے کیونکہ شہروں میں وسائل کی کھپت اور کاروبار زیادہ ہونے کے باعث تمام سیاسی و ثقافتی سرگرمیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں اور اہم تبدیلیاں بھی وہیں پر آتی ہیں وہ جرمن مورخ کی کتاب "زوال مغرب" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وسوالڈ شپینگر کے مطابق:

> "دنیا کی تاریخ دراصل شہروں کی تاریخ ہے جب بھی کوئی تہذیب ترقی کرتی ہوئی اپنے کمال کو پہنچتی ہے تو اس کے شہر تہذیب و ثقافت اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن جاتے ہیں خصوصیت سے کیپیٹل یا مرکزی شہر جہاں سیاست، مذہب، فائن آرٹ اور سائنس اخلاقی توازن کے ساتھ ابھرتی ہے۔ اس عمل میں سب سے بڑا معجزہ ایک شہر کی روح کی پیدائش ہوتا ہے شہر اور گاؤں میں جو چیز تفریق کرتی ہے وہ ان کا سائز نہیں بلکہ روح ہے۔"(۳۲)

جہاں ہم "گزشتہ لکھنؤ" کی صورت میں مشرقی تمدن کی تاریخ کی یادگار کا بخوبی مشاہدہ کرسکتے ہیں وہاں دہلی کے برِ صغیر پاک و ہندی دارالحکومت ہونے کے باعث بننے والی خواتین کی نجی زندگیوں ان سے وابستہ رسومات عقائد مشاغل و معلومات کو "رسومِ دہلی" کے صفحات میں مجسم دیکھ سکتے ہیں اور نسائی زبان و محاورہ کے اس مخصوص ذائقے سے بھی روشناس ہوسکتے ہیں جو اس تہذیب کا حصہ رہا ہے۔ شان الحق حقی نے سید احمد دہلوی کی اس کاوش کی بابت لکھا ہے۔

> "رسومِ دہلی کوئی ادبی تصنیف نہیں نہ مؤلفِ "فرہنگ آصفیہ" ادیب تھے۔ اس کی اہمیت لغوی، تاریخی اور سماجی ہے ہماری سماجی زندگی میں ہمارے دیکھتے دیکھتے بڑا انقلاب آچکا ہے زندگی ہر دور میں رسموں کی پابند ہوتی ہے یہ رسم بدلتی بھی رہتی ہیں اور یہ تبدیلیاں تاریخ و اجتماعات کے لیے بڑے معنی رکھتی ہیں جو باتیں کل تک جانی بوجھی اور دیکھی بھالی تھیں اب افسانہ ہو گئیں۔ کل تک اس افسانے کے سنانے والے بھی ڈھونڈے نہ مل سکیں گے یہ ہند اسلامی تہذیب کا ایک باب ہے جس کا مطالعہ ان لوگوں کے لئے شرط ہے جو اپنی تہذیبی سماجی تاریخ سے دلچسپی رکھتے ہوں"(۳۳)

"رسوم دہلی"، محض دہلی کی رسومات پر مبنی کتاب نہیں بلکہ اس میں ہمیں ایسے ایسے الفاظ واصطلاحات اور نادرونایاب محاورات و روزمرہ کے نمونے بھی ملتے ہیں جو اب ناپید ہیں اور اشیاء کے اسماء کی ایک پوری فہرست مرتب کی جاسکتی ہے جن کا وجود اور ذکر اب معدوم ہو چکا ہے۔ سید یوسف بخاری دہلوی نے بہت خوبصورت مقالہ سید احمد دہلوی کی بابت لکھا ان کی اپنی تصنیف "یہ دلی ہے "مشہور زمانہ کتاب ہے وہ اپنے مقالے میں رسوم دہلی کی بابت کہتے ہیں "رسوم دہلی "میں رسوم کے علاوہ سیکڑوں چیزوں اور اصطلاحات کا علم ہوتا ہے۔ "رسوم دہلی "میں کئی الفاظ ایسے ملتے ہیں جن کو "فرہنگ آصفیہ "اور "رسوم دہلی "میں نہ لکھتے تو قدیم وجدید فرہنگ ولغات کے چوڑے چکلے سینوں میں بھی یہ گنج معنی ڈھونڈے سے نہیں ملتے"(۳۴)

سید ضمیر حسن دہلوی نے بھی نسائی زبان کے محاورات و کہاوتوں کے باب میں کہا ہے کہ عورتوں نے اردو زبان میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اور عورتوں کے ہاں زبان اتنی سُرعت کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتی جتنا مردوں کے ہاں ہوتی ہے کیونکہ عورتوں کی معاشرتی زندگی گھروں تک محدود ہوتی ہے۔ سید ضمیر حسن دہلوی نے بھی اسی بارے میں اپنے مضمون "اردو ادب میں عورتوں کے محاورے اور زبان "میں لکھتے ہیں:

> "دہلی میں گاہ گاہ متروک الفاظ و محاورات کے ساتھ ساتھ جو قدیم لب ولہجہ کی گونج سنائی دیتی رہی اس کا سہرا مردوں سے زیادہ عورتوں کے سر ہے عورتیں زبان کے معاملے میں قدامت پسند ہوتی ہیں مردوں کے مقابلے میں ان کا ملنا جلنا باہر والوں سے کم ہوتا ہے نیز مختلف النوع اقوام اور بھانت بھانت کی زبان بولنے والوں سے بُعد کی وجہ سے ان کی زبان بگڑنے سے محفوظ رہتی ہے۔"(۳۵)

انھوں نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ آب حیات میں مولانا محمد حسین آزاد نے صفحہ ۱۹۷ پر رقم کیا ہے ایک اور جگہ اسی مضمون میں ذکر ہے کہ سودا کے ہاں کسی روز میر سوز تشریف لائے اور مطلع عرض کیا:

نہیں نکسے ہے میرے دل کی اپا ہے گا ہے
اے فلک بہرِ خدا رخصتے آہے گا ہے

یہ شعر سنتے ہی:

> "مرزا رفیع سودا نے کہا کہ میر صاحب بچپن میں میں نے پشور کی ڈومنیاں ہمارے ہاں آیا کرتی تھی ان سے یہ لفظ سنا تھا آج آپ سے سنا۔"(۳۶)

دہلی کی زبان ایک تہذیبی رنگ لیے تھی۔ جس رنگ کے اندر سیکڑوں رنگوں کی آمیزش تھی۔ عرش تیموری نے "قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں" میں ان رنگوں کو جمع کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ انھوں نے لکھا کہ زبان کے حوالے سے اہلِ دلی کے مرد وزن سب بہت زیادہ محتاط رہتے تھے۔ زبان ان کی شائستگی اور مہذب ہونے کا پتا دیتی تھی۔ دہلی میں رواج تھا کہ لوگ سیدھی بات کھلے لفظوں میں کرنا بد تہذیبی خیال کرتے تھے مثلا "جب شاہی وفات ہوتی تھی تو لوگ یہ نہ کہتے تھے کہ بادشاہ مر گیا بلکہ کہا جاتا تھا کہ "کُپا لُڑھک گیا"۔ (۳۷)

اسی طرح خواتین کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے کہ قلعے میں موجود خدمت گار خواتین کی بے شمار اقسام تھیں اور ان کے نام بھی بہت دلچسپ ہوتے تھے جیسے: چٹھی نویس، باریدار نیاں، سقنیاں (پانی پلانے والیاں)، اڑدا بیگنیاں (مردانی لباس میں چوکیداری والیاں) خیر صلا والیاں (ادھر ادھر کی خبریں لانے والیاں)، آچا (چھوکریوں کو تعلیم دینے والیاں) پہرے دار نیاں (رات کی پہرہ داری والی) باری کا خاصہ والیاں (امراء اور شہزادوں کا کھانا لے جانے والیاں)۔

الغرض یوں لگتا ہے جیسے یہ الگ ہی ایک جہان تھا جو دہلی کے نام سے آباد تھا۔ یہاں ایسے گہرے ثقافتی اثرات نمایاں تھے کہ جن کے ساتھ انسانی زندگی کے تمام حوالے منفرد ہوتے چلے گئے۔

محی الدین حسن، "دلّی کی بیگماتی زبان" میں لکھتے ہیں:

> "اگر ہم قلعے کی بیگماتی زبان کے محاورات ضرب الامثال اور عام بول چال کے الفاظ کا باریک بینی سے مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ان کے اعتقادات اور ریت رسم ایک محدود فضا میں پرورش پاتی ہیں اور دلی کیوں کہ شروع سے ہندو مسلم حکمرانوں کا پایہء تخت رہی ہے اور خود محمد جلال الدین اکبر نے بہت سے برِ صغیر پاک و ہندی عقائد و مراسم تیار کر لیے تھے اس نے عقد و مناکحت کا سلسلہ بھی راجپوتوں سے جاری کر دیا تھا چنانچہ اس کے دور میں برِ صغیر پاک و ہندی رسوم مسلمان خواتین میں عام رائج تھیں جس کی بڑی مثال "بی بی کی صحنک" جو عام طور پر دلی لکھنؤ میں رائج ہے اور ہر شادی بیاہ یا کسی بھی خوشی کے موقع پر پہلے حضرت بی بی فاطمہ کی نیاز کروائی جاتی ہے اس رسم کی ابتدا جودھابائی نے کی تھی تاکہ اس کا بیٹا جنگ میں فتح یاب ہو کر واپس آئے"(۳۸)

"دلی کی آخری شام" کے حرفِ آغاز میں مرغوب حیدر عابدی نے لکھا ہے کہ دلی کو اگر ہم برِ صغیر پاک وہند کا دل کہیں تو بے جانہ ہو گا کیونکہ یہ شہر اپنی بے نظیر تہذیب اور زبان وادب کی پرورش کے حوالے سے ہمیشہ مثالی رہا ہے۔ بلکہ انھوں نے اسکو علم وادب کی راجدھانی قرار دیا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں: "کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو ونما پاکر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔"(۳۹)

سید احمد دہلوی نے رسوم دہلی میں کل اڑسٹھ رسوم کا ذکر کیا ہے ان اڑسٹھ رسوم میں سے ایک بھی ایسی نہیں جس میں خواتین کی شمولیت نہ ہو۔ انسانی زندگی جس سماجی نظام کے زیر اثر گزر رہی ہو اسے وہاں پر رائج رسوم کو اپنانا پڑتا ہے یا ان میں کسی نہ کسی حد تک شمولیت اختیار کرنا پڑتی ہے۔ خلیق انجم نے رسومِ دہلی کے مقدمہ میں رسوم کو تین اقسام میں تقسیم کیا ہے ان کا کہنا ہے کہ کچھ رسوم مذہبی ہوتی ہیں کچھ سماجی اور کچھ کو ہم نفسیاتی رسوم قرار دے سکتے ہیں مذہبی رسوم میں نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ شامل ہیں جن کا مقصد سماجی برائیوں سے دور رہ کر ذہنی آسودگی پانا ہے سماجی رسوم کی نوعیت معاشرے میں اعلانات جیسی ہوتی ہے جیسے نکاح، سات پھیرے، رسمِ آمین، رسمِ بسم اللہ، پگڑی باندھنا یا دستار بندی، مونچھوں کا کونڈہ وغیرہ اور جہاں تک نفسیاتی رسوم کا تعلق ہے ان کے ذریعے نفسیاتی طور پر زندگی کی کسی بڑی تبدیلی یا تعلق کے لیے خود کو تیار کرنا یا اس مرحلے کو آسان بنانا ہے جیسے شادی بیاہ کی بہت سی رسومات مثلاً مٹھائی رکھنا، چوتھی کھیلنا، چار چالے کی رسم سے دولہا دولہن اور دو خاندانوں کا باہم میل جول بڑھتا ہے۔ اور تکلف ختم ہو جاتا ہے پیدائش کی رسم بھی زچہ کی فطری خوف کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں اور اسے زندگی کے اس نئے اور مشکل تجربے کے لیے ذہنی طور پر تیار کرتی ہیں موت کی رسموں کے ذریعے نفسیاتی سکون اور آسودگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

سید احمد دہلوی نے رسوم دہلی میں جن اڑسٹھ رسوم کا ذکر کیا ہے وہ دہلی شہر اور اس کے گردونواح میں ان کا ذاتی مشاہدہ تھا ان رسومات میں حمل ٹھہرنے سے لے کر ستوانسا، نوماسا، چاچا گیریاں، چھٹی، عقیقہ، زچہ کا تارے دیکھنا، روٹ کی رسم، سر دان نکالنے کرنے کی رسم، رتجگہ، چلے، لوری، مرنڈوں، دانت نکلنے کی رسم، دودھ بڑھانا، سالگرہ منانا، ختنہ کروانا، رسمِ بسم اللہ، گھوڑی چڑھانا ناک کان چھدوانے اور ہدیہ آمین تک کی رسمیں شامل ہیں۔

دوسرا اہم موضوع شادی بیاہ کی رسوم ہیں جن میں بات بڑھانا، رقعہ، منگنی، بیاہ مانگنا، مایوں بیٹھنا سہاگ گھوڑیاں، اُبٹنا، ساچق کا جوڑا، شربت پلانا، مہندی برات، صحنک، سہرا، مختلف ٹونے، جہیز دکھانا، منڈھا، رخصتی اور شادی کے بعد چوتھی کھیلنا، چار چالے پورے کرنا، چیکٹ اتروائی شامل ہیں۔

تیسرا بڑا موضوع عید اور شب برات جیسی مذہبی رسوم کے علاوہ موت سے متعلقہ رسوم ہیں جن میں میت کی تیاری، قبر کی تیاری تدفین کی رسومات، عہد نامہ اور بیان، فاتحہ خوانی اور تیجا یا قُل کا دن منانا، پھر جمعرات کرنا اور چالیسواں، برسی اور قبروں کی درستی وغیرہ شامل ہیں یوں دہلی اور اس کے قرب وجوار میں ہی نہیں بلکہ برِ صغیر پاک وہند کے طول وعرض میں اگر دیکھا جائے تو آج بھی ان میں سے زیادہ تر رسوم موجود ہیں اور آج بھی ان پر عمل ہوتا ہے۔ خود سید احمد دہلوی کا کہنا ہے کہ اگرچہ اس میں بے شمار رسوم کا تعلق کسی نہ کسی سطح پر ہندوانہ تاریخ وثقافت سے جا کر ملتا ہے مگر ان کا کہنا ہے کہ انہوں نے جو ماحول میں دیکھا اور سنا اسے بلا کم وکاست بیان کر دیا۔

سب سے پہلے بچے کی پیدائش سے قبل یعنی دورانِ حمل کی رسوم ستوانسا اور نوماسہ کے نام سے منائی جاتی ہیں جو صرف خواتین سے ہی متعلقہ ہیں جنہیں ہم گود بھرائی کی رسوم کہہ سکتے ہیں اس رسم کو حمل کے پانچویں ساتویں یا نومہینے میں منایا جاتا ہے یہ رسم ہندوؤں سے لی گئی ہے وقتِ سہ پہر دوجیا عورت یعنی دلہن کو نہلا دُھلا کر رنگین لباس اور لال اوڑھنی سے سجا کر چوکی پر بٹھاتے ہیں اور اس کی گود میں سہاگنیں اور حاملہ عورت کی بہنیں سات میوے اور نیگ کے پیسے ڈالتی ہیں۔ اس رسم کے بعد ناریل توڑا جاتا ہے اگر گری سفید نکلے تو اس سے اُجلا پھل یعنی بیٹا پیدا ہونے کا شگون لیا جاتا ہے ناریل کے بالوں کے سبب بچے کو بھی جھنڈولا کہا جاتا ہے اور گیتوں میں یہ نام اکثر جچا گیریوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس رسم میں دلہن کے میکے سے کنگھی، مسی، تیل کی نقرئی پیالی، عطر پھول چاندنی کی نہرنی اور سات رنگ کے میوہ جات، پنجیری کا سامان یا پنجیری بنانے کے لیے پیسے بھیجے جاتے ہیں لال اوڑھنی بھی میکے سے آتی ہے۔ یہ تمام رسوم گھر، خاندان یا تعلق داری کی عورتیں کرتی ہیں بچہ پیدا ہونے کے بعد کی رسوم کی بھی طویل فہرست ہے پیدائش کے بعد نال گاڑنے کے بھی ٹونے ٹوٹکے ہیں نال کی ٹھیکری میں سکے ڈالنا، ہلدی کالی مرچ وغیرہ ڈالنا کبھی نال گھر سے باہر گاڑھنا، کبھی گھر کے اندر گاڑنا۔

نال گاڑنا، ایک معروف محاورہ بھی ہے جس جگہ سے فطری انسیت یا پیار ہو اس شخص کو کہتے ہیں کہ تیرا نال تو یہاں نہیں گڑا۔ نال کے ٹھیکرے میں حسب توفیق قریبی خواتین سکہ چاندی اور پان وغیرہ بھی

ڈالتی ہیں۔ نال والی ٹھیکری میں ڈالنے والے سکے دائی کا انعام ہوتے ہیں اور یہاں ایک اور قدیم روایت ٹھیکری کی مانگ ہونا محاورے کی صورت میں سامنے آتی ہے جس کا مطلب ہے پیدائش کے وقت ہی نومولود کی نسبت طے کر دی جاتی ہے جو قریبی رشتہ دار خاتون پھوپھی، ممانی، خالہ وغیرہ یا قریبی عزیزہ نال کے ٹھیکرے میں کوئی سکہ ڈالتے ہوئے کہہ دے کہ یہ بچہ یا بچی میرے بیٹے یا بیٹی کی مانگ ہے تو اس کا مان رکھا جاتا ہے تیسرے دن نومولود کی پھوپھی چھاتی دھلائی کی رسم ادا کرتی ہے اور اس کا نیگ وصول کرتی ہیں اس دن کے لیے کی گیت بھی گائے جاتے ہیں جیسے:

بیرن بھیا میں تیری ماں جائی

چھاتی دلائی کٹوری لونگی تو لٹ بلائیں روپیہ

پاؤں دھلن کو چیری لونگی تو خصم چڑھن کو گھوڑا

مفہوم: اے میرے بھائی میں تیری ماں کی بیٹی ہوں چھاتی دلائی کے نیگ کی صورت چاندی کی کٹوریاں لونگی اور لٹ دلائی کا روپیہ اپنی خدمت کے لئے لونڈی اور اپنے شوہر کے لیے گھوڑا لونگی۔ بچہ کی پیدائش کے بعد اس رات زچہ کا رتجگہ ہوتا ہے اور زچہ کو سونے نہیں دیا جاتا اس رات جو لوک گیت گائے جاتے ہیں ان کو جچا گیریاں کہتے ہیں ایک جچا گیری بطور مثال پیش ہے

میرے بابل کو لکھو سندیس جھنڈولا آج ہوا

بابل ہمارے راجہ کے چاکر بیرن بالے بھیس جھنڈولا آج ہوا

ایک اور جچا گیری یوں ہے

البیلے نے مجھے درد دیا سانولیا نے مجھے درد دیا

پائیلیا نے مجھے درد دیا

جائے کہو لڑکے کے باوا سے اونچی نوبت دھر اوٗرے

جائے کہو لڑکے کے ماموں سے ہنسلی کڑے گھڑ اوٗرے

اس طرح گاتے گاتے رات گزر جاتی ہے مگر ایک بات قابل غور ہے کہ ان گیتوں میں " سانولیا" یا "جھنڈولا" جیسے الفاظ اور روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ ہندوانی رسوم ہیں۔ کرشن جی کی پیدائش کی نسبت ایسے ہی گیت گائے جاتے ہیں۔ بلی کو چالیس دن تک گھر میں نہیں گھسنے دیا جاتا اور اسے نکٹی یعنی کٹے ناک والی کہا جاتا ہے اس کے بعد چھٹی کی رسم پر صرف عورتیں بلائی جاتی ہیں بھانڈے بھنڈیلے باجے گاجے لاتے ہیں

اور نیگ وصول کرتے ہیں میکے سے چھوچھک آتی ہے جس میں بچے کے لیے کڑے، گھنگرو، چاندی کے چٹے بٹے، جھنجھنے، سونے چاندی کے بنے دال چاول، کپڑے، لنگوٹ پوتڑے، دوہری، پنگھوڑا، مونگ کی دال اور چاول خالہ ماموں کی طرف سے کڑے ہنسلی وغیرہ دیے جاتے ہیں۔

چھٹی کی برسوں کی طرح عقیقہ کی رسم بھی دھوم دھام سے منائی جاتی ہے پھر تارے دیکھنا رسم میں زچہ کو چوکی پر کھڑا کر کے سات تارے گنوائے جاتے ہیں اس دوران دو عورتیں بچہ کے ارد گرد کھڑے ہو کر دو تلواروں کی کوس اس کے سر پر بناتی ہیں اسی دوران بچے کا باپ زچہ خانے میں جا کر پلنگ پر کھڑے ہو کر چھت میں تیر چلاتا ہے جسے " مرگ مارنا" کہتے ہیں اسی رات "چوبہ چکھانا" یعنی زچہ کو سات خوان چکھنے کو پیش کئے جاتے ہیں گیت گائے جاتے ہیں "بچہ بگیر" کی رسم بھی اسی رات سات عورتوں سے کروائی جاتی ہے ۔ سوا پانچ سیر آٹے کا روٹ بنا کر درمیان سے خالی کر دیا جاتا ہے تا کہ کنارے باقی رہیں اور دو متوازی تیروں اور تلواروں کے سہارے کھڑا کیا جاتا ہے جس میں سے بچے کو سات سہاگنیں گزارتی ہیں اور ایک دوسرے کو پکڑاتی جاتی ہیں ساتھ ساتھ بچہ بگیر کہتی جاتی ہیں یہ رسم برِ صغیر پاک وہندی نہیں ہے بلکہ ترکی ثقافت سے برِ صغیر پاک وہند میں آئی ہے۔ سر دان نکالنا بھی ایک رسم ہے جو بچے کے دانت آنے کے دنوں میں کی جاتی ہے یہ رسم بھی اہلِ قلعہ کی دین ہے. چلہ نہان کے گیت اور رسوم بھی اس سے سوا ہیں۔ مرنڈے بنانا، دانت نکانے دودھ بڑھانے، ختنہ کروانے اور سالگرہ وغیرہ کی رسوم کا بیان ہے رسم بسم اللہ چار سال کی عمر میں کی جاتی ہے۔ ھدیہ اور روزہ کشائی کی رسم بھی اس کے بعد اہتمام سے منائی جاتی ہے۔ مسیں بھیگنے کی رسموں کو مونچھوں کا کونڈا کہا جاتا ہے یہ وہ رسوم تھیں جو دلی کی تہذیبی زندگی میں صدیوں سے رائج تھیں بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ برِ صغیر پاک وہند کے طول و عرض میں رائج تھیں اور ان میں سے بیشتر آج بھی کسی نہ کسی صورت موجود ہیں۔

پاکستان وبھارت کے اکثر علاقوں میں آج بھی ان کو دہرایا جاتا ہے گود بھرائی کی رسم ٹھیکری کی مانگ زچگی کے پکوان `میکے والوں کی چھوچھک، چلے کے دنوں کے ساری احتیاطیں، زچہ و بچہ کے ساتھ ہمہ وقت چھری چاقو قینچی یا لوہے کی کوئی چیز بستر کے نیچے رکھنا تحفظ کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ چھٹی کا نہان اور جھنڈولے کی جھنڈ یعنی پہلے بال اتروانے کی رسم اور بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات کرنا یا اس کی قیمت کے پیسے صدقہ کرنا، دائی اور نائی کو نیگ دینا اور مبارکبادی کے پیسے دینا، خوشی کے موقع پر پھوپھی کو نیا جوڑا اور اگر حیثیت ہو تو سونے چاندی کا زیور تحفہ بجھوانا، زچہ کو پنجیری بنا کر کھلانا، ختنہ کرنے کی رسم کو مسلمانی کرنا کہنا اور اس رسم کو

دھوم دھام سے منانا۔ یہ تمام رسوم آج بھی رائج ہیں اگرچہ شہری زندگی میں اب ان قدیم روایات پر عمل کم ہو چکا ہے اور ان کی صورتیں بدل چکی ہیں مگر دیہی آبادیوں میں ان کا اہتمام کیا جاتا ہے اور خواتین بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں ہیں۔

جچا گیریاں تو اب نہیں گائی جاتیں، نہ زچہ کو جگراتا کروایا جاتا ہے کیونکہ اب کئی طرح کی دوائیں ایجاد ہو چکی ہیں مگر لوریاں آج بھی سننے کو ملتی ہیں۔

چندا ماموں دور کے بڑے پکائیں بور کے
آپ تو کھائیں تھالی میں ہم کو دیویں پیالی میں
پیالی گئی ٹوٹ چندا ماموں گئے روٹھ
پیالی آئی اور چندا ماموں آئے دوڑ

برِ صغیر پاک و ہندی ثقافت میں خواتین کی اکثریت گھر اور گھر داری کی زندگی گزارتی تھی اسی چار دیواری کے اندر کی محدود زندگی میں انہوں نے نئی نئی دلچسپیاں تلاش لی تھیں، ہر طرح کے واقعات کو باقاعدہ طور پر منانے کا کوئی نہ کوئی بہانہ نکال لیا کرتی تھیں یوں ایک الگ نسائی معاشرت گھروں کے اندر موجود تھی تقریبات، پکوان اور گیت رنگ بھرتے تھے چھٹی کی رسم کا بیان سید احمد دہلوی کی زبانی سنیے:

"تیسرے پہر میکے سے چھوچھک آتی ہے۔ امیروں کے ہاں باجے گاجے سے متوسط لوگوں کے ہاں ظاہری سوبھا اور صوفیانہ ٹپ ٹاپ یا صرف روشن چوکی سے۔ چھٹی میں سونے، خواہ روپے کی ہنسلی، کڑے، بچے کے گھنگھرو، چاندی کے چٹے بٹے، چسنیاں، جھنجھنے، سونے کی بنی دال چاندی کے بنے ہوئے چاول، کرتے ٹوپیاں، پوتڑیں دوہریں، سوزنیاں کشتیوں میں سجی ہوئی، چھوٹے چھوٹے برتنوں کے خوان چنُے ہوئے، گھی کے ہنڈے، مرغوں کی کھانچیاں، عقیقہ کے بکرے ان پر گوٹے کناری کی جھولیں پڑی ہوئیں، سینگوں پر چاندی کی سنگوٹھیاں چڑھی ہوئی، اگر میکے والے نواب یا شہزادے ہوئے تو ہاتھیوں پر چاندی کا پنگھوڑا اور کہاروں کے کندھوں پر ہنڈولا، سروں پر بچے کی پلنگڑی، مونگ چاول کی بوریاں بھی ہوتی ہیں۔"(۴۰)

جہاں بچہ پیدا ہونے کی اتنی رسمیں ہوں گی وہاں شادی کی رسوم کا کیا شمار،ان رسوم کی شروعات عین شادی کے دنوں سے نہیں ہوتی بلکہ رشتے کرنے کا رواج بعض خاندانوں میں نہ صرف پیدائش کے فوراً بعد بلکہ پیدائش سے قبل بھی موجود تھا جسے "پیٹوں کا بچ" کہا جاتا تھا یعنی حمل ٹھہرنے کے ساتھ ہی یہ اقرار و پیماں ہو جاتے تھے کہ ہونے والے بچے یا بچی کا رشتہ ہمارے فلاں بیٹے یا بیٹی سے سمجھا جائے گا اسی طرز پر ٹھیکرے کی مانگ کا ذکر بھی آ چکا ہے اور ان پیدائشی یا قبل از پیدائش رشتوں کو نبھایا بھی جاتا تھا۔ منگیتر کو "منسوبہ" بھی کہتے تھے۔ بیٹوں اور بیٹیوں سے رضامندی لے کر رشتے طے کرنے کا رواج بعد از بلوغت بھی نہیں تھا والدین ہی جہاں چاہتے تھے نسبت طے کر دیا کرتے تھے اور بچوں کو یہ رشتہ نبھانا پڑتے تھے۔ اسی حوالے سے کہاوت مشہور ہے کہ بیاہتا چھوڑے، منگیتر نہ چھوڑے۔ بیاہتا چھوڑے، منگیتر نہ چھوڑے۔ گڈی گڈے یا گڈے گڑیا کی شادیاں کرنا بھی دہلوی تہذیب کا خاصہ رہا ہے سید احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ ہندو مسلم دونوں طرح کے خاندانوں میں گڑیا کی شادی کا رواج موجود تھا چند شادیوں کا احوال بھی انہوں نے بیان کیا جس میں باقاعدہ اصلی دولہا دلہن کی طرح گڑیا اور گڈے کی شادیوں پر تمام رسومات ادا کی گئیں اور لاکھوں روپے کے اخراجات بارات، ولیمے اور دیگر رسوم پر لٹائے گئے بلکہ باقاعدہ دعوت نامے بھی چھپوائے گئے جہیز بھی گڑیا کو دیا گیا۔

رشتہ مانگنے کے لیے بات آنا، بات چلانا، بات ڈالنا اور رقعہ ڈالنا جیسے محاورات استعمال ہوتے تھے۔ منگنی اور مٹھائی دھرنے کی رسم کے بعد جب تک شادی نہ ہو جاتی تھی اس نسبت کو ہر عید تہوار پر خصوصیت سے یاد رکھا جاتا تھا اور ہر رمضان میں روزہ کشائی کا سامان نوروز، دیوالی، محرم، بکرا عید، شب برات `سانونی الغرض ہر اہم دن کے لیے دولہا دلہن کے گھروں سے ایک دوسرے کے لیے تحائف کا جانا معمول تھا۔ کسی سوگ کی وجہ سے اگر منگنی کرنے میں کوئی رکاوٹ ہوتی تو امام ضامن کا روپیہ دائیں بازو پر جا کر باندھ آنے کو بھی منگنی ہی سمجھا جاتا تھا یہ روایات عورتوں کے دم سے ہی زندہ تھیں۔ خوانوں میں تورے بھیجنے کا بھی رواج تھا اور "تورہ" ترکی زبان کا لفظ ہے جو ترکوں کے ساتھ برصغیر میں آیا ترکی زبان میں اس کے معنی حصہ کے ہیں مگر برِ صغیر پاک و ہند میں کچھ خاص کھانے کے مجموعے کو "تورا" کہا جاتا ہے۔

سید احمد دہلوی نے شادی بیاہ کی رسوم کی نہ صرف مکمل جزئیات کے ساتھ منظر نگاری کی ہے بلکہ ان تمام رسوم سے متعلقہ اشیاء لباس زیورات اور کھانوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اُبٹنا اور مایوں بٹھانے کی مکمل تفصیلات کے ساتھ مایوں کے سارے سامان کی فہرست بھی رقم ہے کیونکہ وہ ایک لغت نویس تھے اس لیے ہر لفظ کے

اصل مادہ تک پہنچنے کی جستجو ان کے خمیر میں شامل تھی۔مائیوں بٹھانا ان کے مطابق "مانجھے بٹھانا" سے نکلا ہے اور مانجھا پنجابی میں چارپائی کو کہا جاتا ہے۔دلہن کو مایوں بٹھانے کا مطلب گھر کے کے ایک مخصوص کونے میں چارپائی پر بٹھا دیا جانا اور جتنے دن جو عموماطاق تعداد میں مقرر ہوتے ہیں مایوں کی رسم رہتی تو لڑکی کو کسی مرد کے، حتیٰ کہ محرم مردوں کے سامنے بھی آنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔اسے مانجھے یعنی پلنگ پر مہمانوں کی طرع بٹھا دیا جاتا تھا اس دوران تیرہ، گیارہ، نو، سات، پانچ یا تین دن تک سہاگ گھوڑیاں گائی جاتی تھیں اور اُبٹنا لگایا جاتا تھا جس سے روپ نکھرتا اور پینڈیاں بنا کر کھلائی جاتیں۔پینڈنیاں ایک طرح کے لڈو کا نام تھا مایوں کے دنوں میں دلہن کی رشتہ دار خواتین بہنیں، سہیلیاں، پاس پڑوس کی عورتیں سب سہاگ گھوڑیاں گایا کرتی تھی سید احمد دہلوی نے چند سہاگ گھوڑیاں نمونے کے طور پر شامل کیں جو نسائی جذبات و الفاظ کی غمازی کرتی ہیں۔

اُبٹنا کھیلنے کی رسم قلعہ والوں کے ہاں موجود تھی پھر "ساچق چڑھنا" کی رسم ہے جو دولہا کی طرف سے بری کے طور پر بھیجی جاتی ہے بری کا لفظ بھی بَر یعنی رشتہ، لڑکا یا دولہا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جبکہ ساچق، ترکی زبان کا لفظ ہے اور ہم اب ساچق کے معنی میں "حنا بندی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں جس میں لے جائی جانے والی اشیاء کی فہرست کافی طویل ہے مگر خاص اشیاء جیسے سہاگ پُڑا اور نُقل، قُرص، میوہ جاتی خوان کلاوے، ٹھلیاں، کھانڈ، کپڑے جو برات اور چوتھی کے دن کے لیے مخصوص ہوتے اور زیورات بھیجے جاتے ہیں شادیانے گائے جاتے ہیں جو ڈومنیاں گاتی ہیں اور پھر شربت پلائی کی رسم کے بعد سٹھنیاں گائی جاتی ہیں یہ خالصتا برِ صغیر پاک و ہندی رسم ہے جس میں ذو معنی طنزیہ اور فحش الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔جیسا کہ مہیشور دیال نے "عالم میں انتخاب—دہلی" میں چند سیٹھنیاں رقم کی ہیں مثلا:

"چندا سا دولہا لایا بارات، پھلواری سی بن گئی دن رات

گھوڑے دلہا آیا سوار، دلہا کا ابا گدھا سوار

دلہن کی امی بڑی سیانی، ہاتھی پہ چڑھ آئی مستانی"(۴۱)

نسائی زبان کی وسعت مردوں سے زیادہ ہے مثلا مرد کمبخت، توبہ ہے، اجی سنیے جیسے الفاظ نہیں بولتے۔بیگم شائستہ سہروردی اکرام اللہ "دلی کی خواتین کی کہاوتیں اور محاورے" میں لکھتی ہیں۔:

"بیویوں کے خفگی کے الفاظ بھی بندھے ٹکے تھے۔کمبخت، نامراد، ناشدنی، جہنم میں جاؤ، چولھے میں جاؤ، میری نظر سے دور ہو جاؤ، جہاں

سینگ سمائے چلی جاؤ، بیبیاں تو بیبیاں اس زمانے کی مامائیں، مغلانیاں بھی
فقرے کسنے میں مہارت رکھتی تھیں۔ امائیں زیادہ تر سخت الفاظ استعمال
کرتی تھی جیسے جھاڑو پھری۔"(۴۲)

"رسومِ دہلی" گرچہ ایک ثقافتی و تاریخی کتاب ہے مگر لسانی سطح پر پرکھا جائے تو ایک مکمل لغت مرتب کی جاسکتی ہے جس میں نسائی زبان کے حوالے سے ایک فہرست رشتہ داریاں، تعلق داریاں، کھانے، زیورات، رسومات کے نام، برتن لباس، پیشے رشتے سامانِ جہیز وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں ایک مختصر فہرست ان الفاظ و محاورات اور اصطلاحات کی بیان کی جاتی ہے جو "رسومِ دہلی" میں سید احمد دہلوی نے اپنی تحریر میں مختلف ابواب کے ذیل میں برتی ہے۔

پکوانوں کے حوالے سے نسائی الفاظ کا جائزہ لیا جائے تو درج ذیل کا تعلق صرف اور صرف نسائی زبان سے ہے جیسے:

سٹھورا: زچگی کے دوران دیا جانے والا حلوہ جو سونٹھ، گوند، میوہ، سوجی یا آٹا ملا کے بنتا ہے

سڈھوڑا: ستوانسے کی رسم پہ بننے والی سات ترکاریاں جو دلہن کے میکے سے بھیجی جاتی ہیں

ست کولے: سات لقمے

روٹ: بڑی روٹی

کھچڑی: ثابت مونگ کی دال اور چاول ملا کر پکائی جاتی ہے۔ نرم غذا

چکتیاں: بڑی بڑی ٹکیاں

چراغی: نذرانے کا حلوہ یا کوئی میٹھا پکوان

چڑھاوا: نذرانے کے لیے بنایا گیا پکوان

تورا: ترکی زبان کا لفظ، مخصوص کھانوں پر مشتمل ایک خاصہ

بہوڑہ: برات کے ساتھ دلہن والوں کی طرف سے بھیجا گیا کھانا

پنجیری یا کیوکا: جننے کا سامان جس میں زچہ کے لیے چھوہارے، گوندھ، سونٹھ، کمر کس، سونف، اجوائن، کھوپرا، ناریل، بادام وغیرہ ڈالتے ہیں

کاڑھا: جڑی بوٹیوں پر مشتمل قہوہ۔

اچھوانی: پتلا شیرہ نما حلوہ۔

زیورات جو کسی بھی تہذیب میں عورت کی زندگی کا اہم جزو رہے ہیں "رسومِ دہلی میں ان کی ایک فہرست بھی موجود ہے جیسے: جھومر، ٹیکا، دھگدی، چمپاکلی، جگنی، کرن پھول، جھمکے، گجرے، بازوبند، کارچوبی بٹوہ، ہنسلی،، پازیب، پہنچیاں، نوگریاں، چوہے دتیاں، علی بند، شمشیر بند، دست بند، چھلے، انگوٹھیاں، پنج انگلہ، چوڑیاں، کڑے، نتھ، کنگن، چھلے، زنجیر دار چٹکی چھلے، بانک، لچھے، جھانجن، کڑے، توڑے، پائل، پازیب۔ بلاق، نکسیر، ناک کی کیل، نتھلی، نتھ، لونگ، کوکا۔ توڑا، گلوبند، ستلڑا، پنج لڑا، جگنی، کنٹھی، ہنسلی، مالا، زنجیر بالی، جھمکے، بالے، پتے بالیاں، گھر

جہاں نسائی لباس اور جوتوں کے نام کا تذکرہ آئے وہاں "رسومِ دہلی" میں ہمیں بیسیوں نام مل جاتے ہیں۔ اسماء وضمائر، پیشے، تعلقات وغیرہ کے نقطہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ

مشاطہ، ڈومنی، دیورانی، جیٹھانی، حلال خوری، جوگنی، جھنڈولا، جینیجی، پاتر، رنڈی، بیسوا، قحبہ، انگہ (دایہ کا شوہر) ٹُرت کا بچہ (جلدی پیدا ہونے والا بچہ) اوپر والیاں (چڑیلیں) چھوچھو (بچے کے پوتڑے دھونے والی) ددا، بھانڈ بھنڈیلے، شاہ ٹیم ٹپا، کنچنیاں، ڈومنیاں، چونے والیاں، چماریاں، کہاریاں، مغلانیاں، دوگانہ سہیلی جیسے اسماء وضمائر ملتے ہیں

"رسومِ دہلی" بھی "گزشتہ لکھنو کی طرح ایک تاریخی دستاویز ہے مگر اس کے باوجود اس میں نسائی الفاظ و محاورات کثیر مقدار میں مل جاتے ہیں جو سید احمد دہلوی کے نسائی زبان و محاورہ میں دلچسپی اور مہارت کی دلیل ہیں۔ کیونکہ ان کی تمام تصنیفات میں سے نصف سے زائد نسائی زبان و تربیت پر مشتمل ہیں۔ "رسومِ دہلی" میں موجود چند نسائی زبان و محاورہ کی مثالیں درج ذیل ہیں۔

بلائیں لینا، آبادی چلنا، باڑ روکنا یعنی بہنوں کا دوپٹہ تاننا، بٹھار کھنا، پلنگ کو لات مارنا، پرا باندھنا، پاؤں پھیرنے جانا، چالے کھیلنا، دن لگنا، دو جی سے ہونا، ڈولا کسنا، ڈہکانا (ترسانا) ڈھول چھابنا، رخصتانا، قبر جھانکنا، کاجل پاڑنا، گت بنانا، گڑیا سنوارنا، منہ میں گھنگھنیاں ڈالنا، لپ بنوانا، مسلمانی کرنا، ہاتھ پاؤں سے چھوٹنا، مٹی دینا، روٹی کرنا، بات چلانا، کھٹے میٹھے کو جی چاہنا، پاؤں بھاری ہونا، امید سے ہونا، درد لگنا، قصابہ پہننا، نال رگڑنا، روپ درشن کروانا، چیکٹ اتروائی، سہاگہ چھوانا (سالی کا دولہے کا کان پکڑ کر نیگ لینا، اخیر دان کرنا (بہنوئی کا کفن دفن کرنا)، مروج پسوانا (دولہا سے خوشبو دار اشیاء مانگ بھرنے کو پسوانا، جھیلی دینا، نال گاڑنا، نال کٹائی، چھاتی دھلائی وغیرہ۔

رسومِ دہلی ایک ایسی ثقافتی دستاویز ہے جس میں دہلوی خواتین کی زندگی کے شب و روز اور معمولات کو، ان کی زبان و محاورات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ بلاشبہ یہ فرہنگِ آصفیہ کے بعد سید احمد دہلوی کی معروف ترین کاوش شمار ہوتی ہے۔ اگرچہ ان کی نسائی زبان اور زندگی کے حوالے سے کئی قابلِ قدر تصنیفات موجود ہیں۔ انھوں نے لغات النساء، فسانہ راحت اور رس کھان مرقع تکمیل الکلام، مرقع زبان دلی، تحریر النساء، انشائے ہادی النساء، ناری کتھا، کئی پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دوہے، بھجن، سیٹھنیاں اور گیتوں کو نسائی زبان کے یادگار اثاثوں کی صورت میں رقم کیا۔

رسومِ دہلی میں دہلی کی خواتین کی ثقافتی زندگی کی مکمل جھلک اپنی لسانیاتی حوالوں کی نشاندہی کرتی ہے۔ چونکہ یہ ایک ثقافتی تاریخ پر مبنی تحریر ہے اس لیے اس میں لفظیاتی مباحث نکالنا ممکن نہیں تھا مگر اس کے باوجود ان تمام رسوم جن کا تذکرہ سید احمد دہلوی نے کیا ہے وہ ان سے وابستہ الفاظ و محاورات، نسائی طرزِ فکر، لباس زیورات، توہم و عقائد، گیت، بولیاں، پہیلیاں، سٹھنیاں، لوریوں کے ایک وسیع جہاں کی طرف دریچہ ضرور وا کرتے ہیں جس کے دوسری جانب ہر ایک رسم سے وابستہ بیسیوں نسائی الفاظ و محاورات ہماری نگاہِ تحقیق و تجسس کے منتظر ہیں۔ کسی بھی ایک رسم کو اٹھالیں اس کے تفصیلات ہمیں بیسیوں الفاظ ایسے ملتے ہیں جو نسائی زبان کے الفاظ کہلاتے ہیں اور جن سے عورت کی زندگی، اس کی طرزِ فکر، اس کے معمولات، اس کی کمزوریوں اور کج رویوں، اوہام و عقائد، اس کی معاشرتی ذمہ داریوں، حیثیت و مقام اور مشاغل کا پتہ چلتا ہے۔

غلام مصطفیٰ خاں نے "ثقافتی اردو" میں عورتوں کی زبان کے عنوان سے اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ بیرونی اثرات کے باعث مردوں کی زبان میں تیزی سے تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں مگر عورتیں اپنے محدود سماجی روابط کے باعث ایک مدت تک اپنی زبان کو تبدیل نہیں ہونے دیتیں اور یہ بھی کہ عورتوں کے ہاں بہت سے الفاظ و محاورات ایسے ہوتے ہیں جو صرف عورتوں تک ہی محدود رہتے ہیں۔(۴۳)

۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء کے عہد میں خواتین کے قلم سے کوئی قابلِ ذکر تحریر ایسی نہیں ملتی جس سے نسائی زبان و محاورہ کا خود نسائی قلم سے جائزہ لیا جاسکے مگر ایک گمنام ہندو عورت کی ۱۸۸۲ء میں شائع ہونے والی کتاب (جو نسائی زبان و فکر کی اولین دستاویز کہی جاسکتی ہے) کے ذکر کے بنا نسائی زبان و ثقافت کا ذکر شاید ادھورا رہے گا ۔اس کتاب کا نام "سیمنتنی اُپدیش: ایک گمنام ہندو عورت" ہے

ڈاکٹر دھرم ویر، ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے برِصغیر پاک و ہند کے چند مایا ناز مصنف و محقق کے طور پر جانے جاتے ہیں اور ہندی ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں ان کے ذاتی کام اور تصانیف سے قطع نظر ایک ایسی کتاب ان کی تحقیقی کاوشوں کا حوالہ بنی جو نسائی ادب اور تانیثیت کے حوالے سے ایک زریں دستاویز

کی حیثیت اختیار کر گئی۔ یہ کتاب ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی تھی اور انہیں میرٹھ کی پرانی کتابوں بلکہ ردی کے ڈھیر سے ہاتھ لگی یہ کسی ہندو عورت کی تصنیف تھی جس کا نام باوجود کوشش کے معلوم نہ ہو سکا اس کتاب کا رسم الخط دیوناگری تھا اور اسے کافی تحقیق و تدوین کے بعد ۱۹۸۸ء میں وانی پبلیکیشنز کے تعاون سے دوبارہ چھاپا گیا نسائی قلم اور نسائی زبان اور نسائی فکر و تجربات پر مبنی یہ ۱۱۱ صفحات پر مشتمل کتاب جناب نورالاسلام نے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کروائی انہوں نے اس کتاب کا نام اس میں "سمینتنی اُپدیش "رکھا اور مصنفہ کا نام معلوم نہ ہونے کے باعث ایک گمنام ہندو عورت درج کیا۔ سمینتنی، سنسکرت میں عورت کو کہتے ہیں اور اس کتاب کے خطابانہ انداز تحریر کے باعث اسے "سمینتنی اُپدیش "کا عنوان قرار دیا گیا کیونکہ یہ کتاب مجوزہ تحقیقی عہد سے تعلق رکھتی ہے اور خوش قسمتی سے کسی عورت کے قلم سے تحریر ہوئی اور اس کا موضوع بھی عورت اور اس کے عہد کے رسم و رواج ہے۔

اس میں مجوزہ عہد کی عورت کی زندگی کے معمولات، طرز فکر و حیات، مشاغل اور رسوم کا بیان ہے۔ اس لیے اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ حمد سے آغاز ہوئی ہوتی ہوئی ۲۳ ابواب اور عنوانات پر مشتمل ایک مختصر کتاب ہے جس میں برِ صغیر پاک و ہندی عورت کے لباس زیورات، مصائب، بیوگی کے مسائل، شوہر کی پوجا اور شوہر کی حیثیت اور مقام، عورت کی ذہنی پسماندگی قدیم روایات پر اندھا دھند اعتقاد اور جہالت کی بابت مصنفہ نے بہت جرات آموز اور بیباکانہ اظہار کیا ہے۔ زمانہ جاہلیت سے جاری بے جا اور غیر منصفانہ رسوم پر کڑی تنقید کی گئی ہے غلط قسم کے تصورات عقائد اور توہمات پر بڑے کھلے لفظوں میں بحث کی گئی ہے زیور کے باب میں مصنفہ نے عورتوں کے تین درجات بھی مقرر کیے اور مختصر مکالموں کی صورت میں زیور کے موضوع پر بات چیت رقم کی جیسے یہ دلچسپ مکالمہ دیکھیے:

سوال: باجی آپ کا ہار تو بہت عمدہ ہے

جواب: یہ ہار تو بڑی تکلیفوں سے بنا ہے اس کے پیچھے کئی دفعہ مار کھائی مارے مار کے تین دن تک بیمار رہی، تب اس ہار کی صورت دیکھی۔

سوال: یہ باجرے کی گھڑت چھلے کہاں سے مارے؟

جواب: وہ چھلے تو بڑے چھل بل سے بنے ہیں۔ گھر کا خرچ تو تم جانتی ہی ہو کبھی کوڑی نہیں بچتی بلکہ ہر مہینہ میں دو چار کا قرضہ رہتا ہے میں نے ایک مہینہ تنگی کر کے گھر میں گھی نہ آنے دیا۔ ان کے روپوں سے یہ چھلے بنوائے۔

ایک اور جگہ ایک عورت دوسری سے کچھ یوں سوال کرتی ہے۔

"اجی تمہارے سسرال والوں نے کچھ گہنا نہیں بنایا شاید تمہارا خاوند تمیں کچھ پیار نہیں کرتا، تمہارا خاوند بڑا ہی نالائق ہے کیا ان کو دس بیس روپے قرض بھی نہیں ملتا چاہے بی بی کپڑا نہ ہو پر ہاتھ کان کا ڈھانکنا تو بہو بیٹی کو ضرور ہی چاہیے خالی کان تو بہت ہی برے لگتے ہیں۔ چار پیسے کی پیتل کی بالیوں ہی منگوالو ریتے گلے (یعنی خالی گلے) تو پانی پینا بھی دھرم نہیں، کالا پیلا ڈورا ہی گلے میں باندھ لو۔ (۴۴)

اس طرح کے سوالات کے جواب میں انتہائی جلی کٹی سناتے ہوئے دوسری عورت جن الفاظ میں اپنے مجروح جذبات کا احوال آنکھوں میں آنسو بھر کے نیچے دیکھتے ہوئے کہے گی کہ "رام رام ہم نے دنیا میں آکر کیا دیکھا ہے نہ تو تاتا کھایا نہ راتا پہنا ہمیں تو پر میشور نے جیسے دکھ جھیلنے کو پیدا کیا ہے اور جب سے ان کم بختوں کے گھر میں بیاہ گئے ہیں کبھی گہنے کپڑے میں آگ لگتی نہ دیکھی میں نے کئی دفعہ کہا کہ ایک دن گھر کا خرچ بند کر دو مجھے چار پیسے کی بالیاں منگا دو بھلا کہاں مجھے ٹکا سا جواب دیا کہ کپڑے بغیر آدمی جی سکتا ہے روٹی کے بنا نہیں جی سکتا اسی بات پر میں کتنی روئی اور کئی دن تک روٹی نہ کھائی اور اب تک میرا من کسی سے بات کرنے کو نہیں چاہتا ہماری قسمت کہاں جو گہنے کا منہ دیکھے ہم تو جلتے آئے ہیں اور جلتے ہی جائیں گے ایسے ہی کسی دن دم نکل جائے گا ہمارے نصیبوں میں گہنا کہاں۔ مصنفہ کا کہنا ہے کہ وہ جس تقریب میں بھی گئیں گہنے کا ذکر ضرور سنا۔

مندرجہ بالا مکالمات میں کس خوبی کے ساتھ نسائی زبان کو برتا ہے اور درج ذیل فقرات پر اگر آپ غور کریں تو دیکھیں گے کہ خالصتاً برِ صغیر پاک و ہندی عورت کی زبان اور محاورات اس میں نظر آئیں گے مثلاً:

بغیر زیور کے عورت کو خالی کان، خالی گلے والی کہنا۔ کالا پیلا ڈورا ہی گلے میں باندھ لو۔ چار پیسے کی بالیاں، منہ دیکھنا، ٹکا سا جواب دینا، گہنے جوڑے کا منہ دیکھنا، کم بخت کہنا، دم نکلنا، آگ لگنا، ریتے گلے تو پانی پینا بھی دھرم نہیں۔ ٹکا سا جواب دینا، رام رام کرنا، رام رام ہم نے دنیا میں آکر کیا دیکھا جب سے ان کم بختوں میں بیاہے گئے گہنے کپڑے میں آگ لگتی نہ دیکھی۔ ہماری اتنی قسمت کہاں کے گہنے کا منہ دیکھیں ایسے ہی کسی دن دم نکل جائے گا۔۔۔ وغیرہ

تمام فقرات میں ہمیں برِ صغیر پاک و ہندی عورت کی زبان، اس کا اسلوب، اس کا طرز فکر اور اس کے رسوم و رواج اور عقائد نظر آتے ہیں اور آپ دیکھیں کہ ان چار فقرات میں آگ لگنا، دم نکلنا، کمبخت، رام

رام، منہ دیکھنا جیسے الفاظ صرف عورتوں کا ہی خاصہ ہیں۔ مصنفہ نے سہاگ کی نشانی کے نام پر بہت سے زیورات کو غلامی کی علامت قرار دیا ہے۔ پنجاب کی عورت کا لمبا رسی نما پراندہ پہننا اور ناک میں نتھ سہاگ کے بجائے غلامی کا تاریخی نشان ہے۔ کانچ کی چوڑیاں جن سے گرمیوں میں بانہیں پھول جائیں۔ ماتھے کی بندی پاؤں کی انگلیوں کے بچھوے اور پاؤں کے انگوٹھے میں انبٹ نامی زیور وہ زیورات ہیں جو شادی سے تاحیات پہننے ہوتے ہیں چاہے کسی بیماری یا تنگی کے باعث کتنا ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔

اس کتاب میں جو ۱۸۸۲ء میں چھپی اس برِ صغیر پاک و ہندی دور کی اکثر رسومات اور قباحتوں کا بھی ذکر ہے اور زیورات کی مد میں جسم کے ہر حصے پر پہنے جانے والے زیور کی الگ تفصیل درج ہے جیسا کہ: چوک، چاق، چوٹا، چٹھیلا، چوٹی

بندی، بینا، تعویذ، جھومر، مورنی، چاند شیش، پھول، جھمکے، کرن پھول، ڈھیڈو، ڈنڈی، ماگھر، اور بالے، گلوبند، کنٹھا جگنی، چمپا کلی، مالا، ہار، پان ہار، پھول ہار، مولسری ہار، چندو سینی ہار، بدھی، ہمائل، گلوبند بازوبند، بانک، تاڑ، پونہچے، کنگن، جہانگیری پری بند وغیرہ اور انگلیوں کے لیے الگ سے آرسی، انگوٹھی، چھلے، مانک پور، اور پھول رتن، چونک، ہتھ پھول، پنج انگل۔ جبکہ پاؤں میں پہنے جانے والے زیورات میں سے پازیب، چھڑے، پایل، بانک، گجری، انوکھے وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے مصنفہ نے برِ صغیر پاک وہندی عورت کو بجا طور پر قیدی قرار دیا اور برملا کہا ہے کہ سہاگ کی نشانی کہہ کر عورت کے جسم کو جگہ جگہ سے چھدوانا اور ان کو بہت سے بوجھ سے لادنا ایک ظلم کے مترادف ہے۔ بعض عورتوں کے پاؤں کی انگلیوں میں زخم پڑ جاتے انگلی کاٹنے کی نوبت آجاتی مگر ان کو پاؤں کی انگلی سے زیور اتارنے کی اجازت نہ ہوتی کہ اس سے ان کے شوہر کی جان جانے کا خطرہ ہے یعنی نحوست سمجھا جاتا ہے۔

بیوہ عورت کے لیے "رانڈ" کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا جو آج بھی استعمال میں ہے۔ عورت کا بیوہ ہونا ایک حادثہ ہی سہی مگر اس سے بڑی بد نصیبی برِ صغیر پاک وہندی عورت کے ساتھ برتاؤ تھا جو آج بھی کافی حد تک باقی ہے۔ "سمینتنی اُپدیش" کی مصنفہ لکھتی ہیں کہ جب کوئی عورت بیوہ ہوتی ہے تو اس غم کے موقع پر اس کے ساتھ کچھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے کہ سن کر دل کانپ جائے۔ اُسی وقت دو چار نائنیں آچمٹتی ہیں۔ رشتے داروں میں سے کوئی نزدیک نہیں آتی بس بہت بری طرح سے اس کا زیور اتارتی ہیں اور کان، ناک، گلے، بازو، پاؤں میں سے سب کھینچ کر جھٹ پٹ اتار لیتی ہیں چاہے سات برس کی لڑکی ہو اور خاوند کا نام بھی نہ جانتی ہو اس وقت اس کا رحم نہیں کرتیں۔ پھر جب مُردے کو اٹھالے جاتے ہیں اس وقت پیچھے پیچھے دریا پر نہلانے کو

لے جاتی ہیں کہ سب عورتوں سے الگ پچاس قدم کے فاصلے پر دو نائن ساتھ چلتی ہیں اور ایک نائن آگے راستہ بچاتی جاتی ہے کہ کوئی دوسری خاوند والی اس کا سایہ نہ لے اس کا منہ نہ دیکھے ان کے خیال میں جو ان کا سایہ لے گی وہ بھی رانڈ ہو جائے گی۔

برِ صغیر پاک و ہندی عورت کی توہم پرستی پوری دنیا میں مشہور ہے جہالت اور فقدانِ علم کے باعث یہاں کی عورت بہت آسانی سے توہم پرستی کا شکار بن جاتی تھی جعلی پیروں فقیروں اور پنڈتوں کی باتوں میں آ جاتی تھی۔ مصنفہ اپنے اردگرد موجود مختلف معاشرتی مثالوں سے اس قباحت پر روشنی ڈالتے ہوئے اولاد کی خواہش کے بارے میں لکھتی ہے:

> "کسی نے کہا سانپ کو مار کے یا جیتے پر کسی طرح نہالو، تین سانپوں کو مروا کر چار پانچ دفعہ نہاتی ہیں، کسی نے کہا کسی بچے کے سر کے بال جلا کر پھانک لو، اولاد کی چاہت میں کسی سوئے ہوئے بچے کے بیدردی سے بال اکھاڑلاتی ہیں چاہے ان میں ان کی تندرستی میں فرق آئے مگر انہیں ضرور پھانکتی ہیں۔ کسی نے کہا کالے جیتے بھنورے کو کھالو، کسی نے کہا آک کا دودھ بتاشے میں رکھ کر کھالو، کسی نے کہا چوہے کی مینگنی دہی میں ملا کر کھالو۔"(۴۴)

یہ تمام حالات و واقعات ایک خاص نسائی شعور کی تربیت کرتے چلے آئے ہیں جو اس کے سماجی و ثقافتی تناظرات میں زبان پر اثرانداز ہوتا رہا اور اس کے گواہ وہ نسائی الفاظ و محاورات ہیں جو آج اردو زبان کا اثاثہ ہیں۔ جن میں ہم واضح طور پر ان محرکات کا جائزہ لے سکتے ہیں جو ان لفظیات کے پیچھے کار فرما رہے ہیں۔ زبان ہر دن اپنے اندر تبدیلیوں کو قبول کرتی ہے خاص طور پر اردو زبان کا مزاج خارجی عناصر، دوسری زبانوں اور علاقائی اثرات کے حوالے سے بہت وسیع المشربی ہے۔ اس زبان نے ہمیشہ ان لاتعداد تبدیلیوں کو کشادہ ظرفی سے قبول کیا ہے۔ ان تبدیلیوں کو اگر ہم تبدیلی کے بجائے اثرات کا نام بھی دینا چاہیں تو بجا ہو گا۔ کیونکہ یہ سب اثرات اس ارتقائی سفر میں شریک رہے ہیں۔ عورت جو انسانی معاشرت میں اپنے سماجی و ثقافتی حالات کی شریکِ سفر ہے اور طویل انسانی و لسانی تاریخ کی ہم سفر بھی تو اس کی اہمیت و افادیت سے انکار ممکن نہیں نہ ہی اس کی لسانی خدمات سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان کا بڑا حصہ بلکہ یہ کہنا بالکل بے جا نہ ہو گا کہ چاشنی و لطافت بھرا حصہ اسی نسائی زبان کی دین ہے۔

۱۸۰۰ء تا ۱۹۰۰ء تک کا عہد اردو زبان کے کم از کم افسانوی و غیر افسانوی نثری ادب کی تخلیقات کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اسی دور میں داستان کے بھاری بھر کم بو جھل قالب سے ناول کا جنم ہوا اور تاریخی و ثقافتی ادب کے ساتھ صحافتی ادب کی بھی جہات سامنے آئیں۔

لغات و قوائد کی تدوین و تحفیظِ زبان کے کام میں تیزی آئی۔ شعری سطح پر ہیئت و اسالیب کے ساتھ ساتھ موضوعاتی تبدیلیاں آنے لگیں اور وہ زبان جو پہلے شاید صدیوں سے محض بولی کے طور پر پختہ ہو چکی تھی اس نے زبان کا درجہ پا لیا تھا۔ "گذشتہ لکھنو" اور "رسومِ دہلی"، واجد علی شاہ کے خطوط اور "فسانہءعبرت" کی لسانی شہادتوں نے اس مٹتی ہوئی تہذیب و ثقافت کو اپنے اپنے انداز سے محفوظ کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ ان تمام مراحل میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے مصنفین کے قلم اردو زبان کے جس شعبے کو اپنایا کیا ان میں لسانی سطح پر نسائی زبان کا عمل دخل کس حد تک رہا۔ سبھی کتب جن کا اس باب میں بطور ثقافتی کتب کے تناظر میں ذکر کیا گیا ان میں نسائی زبان کو کیسے کیسے برتا گیا اور ان رسومات کے حوالے سے ہمیں جس ثقافتی پس منظر کا ادراک ہوتا ہے وہ کس کس انداز میں نسائی زبان کی تشکیل کرتے رہے جو ہمارے تصورات کو واضح کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

حوالہ جات

۱. انسائیکلوپیڈیا آف بریٹینیکا، جلد پنجم، ولیم بنیٹن، لندن، ۱۹۶۵ء

۲. سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال لاہور ۲۰۱۷ء، ص ۱۷

۳. سر سید احمد خان، مقالات سر سید، جلد ۶، لاہور ۱۹۶۲ء، ص ۳

۴. انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنس، جلد ۴، میکمن کمپنی نیویارک، ۱۹۵۰ء

۵. انوار ہاشمی، تہذیب کی کہانی، جاوید پریس میکلوڈ روڈ کراچی، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۱

۶. غلام رسول مہر، (مترجم) تاریخ عالم کا مطالعہ از ولیم ٹائن بی، گوشہ ادب کوئٹہ ۲۰۱۶ء، ص ۳۸

۷. تاراچند، ڈاکٹر، برِ صغیر پاک و ہندی ثقافت پر اسلامی اثرات، س ن، ص ۱

۸. چرنجی لال دہلوی، مخزن المحاورات، مطبع محب ہند فیض بازار دہلی، ۱۸۸۶ء، ص ۱۰

۹. ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر بر صغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۹۸

۱۰. قومی آواز، لکھنؤ، ۱۳ جنوری ۱۹۹۸ء

۱۱. رجب علی بیگ سرورؔ، فسانہ عبرت، (مرتبہ) سید مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر، دیال روڈ، لکھنو، ۱۹۷۵ء، ص ۴۶

۱۲. میر باقر شمس، لکھنؤ کی زبان، دار التصنیف رضویہ سوسائٹی، کراچی، ۱۹۳۸ء، ص ۱۵۸،

۱۳. میر باقر شمس، لکھنؤ کی زبان، ص ۳۳

۱۴. ایضاً، ص ۴۱۹

۱۵. رجب علی بیگ سرورؔ فسانہ عبرت، ص ۱۴

۱۶. محمد باقر شمس، لکھنو کی تہذیب، باب الاسلام پریس، کراچی، س ن، ص ۲۶۴

۱۷. واجد علی شاہ، حزن اختر، (مقدمہ)، عشق نامہ، جامع نگر نئی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱

۱۸. سید مسعود حسن رضوی ادیب، سلطان عالم واجد علی شاہ، سلسلہ دائرہ ادبیہ، لکھنو، س ن، ص ۲۱۳

۱۹. ایضاً، ص ۲۲-۲۳

۲۰. واجد علی شاہ، محل خانہ شاہی مترجم فدا علی خان، جے بی دریا برادران پریس، منشی رام کشن پرنٹرز، امین آباد لکھنو، ۱۹۱۱ء، ص ۱

۲۱. تاریخ، مشغلہ، ص ۳۸

۲۲. ایضاً، ص ۴۹

۲۳. ایضاً، ص

۲۴. ایضاً، ص۹۷

۲۵. رئیس احمد جعفری، واجد علی شاہ اور ان کا عہد، ص۷۱

۲۶. واجد علی شاہ، پری خانہ: خود نوشت داستانِ معاشقہ، (مترجمہ) تحسین سہروردی، دہلی پرنٹنگ پریس رام پور نئی دہلی، ۱۹۶۵ء، ص۱۷۵

۲۷. ایضاً، ص۱۷۵

۲۸. عبدالحلیم شررؔ، برِ صغیر پاک و ہند میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گزشتہ لکھنو، سنگ میل پبلیکیشنز لاہور ۲۰۰۶ء، ص۴۷

۲۹. E.S.Harcourt & Fakhir Hussain ,Intriduction Lakhnow, The past Phase of - an Oriental Culture , Paul Elek, 1975 , page 26

۳۰. عبدالحلیم شررؔ، دلگداز، شمارہ جون، ۱۹۳۳ء، ص۱۲۴

۳۱. مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر، عبدالحلیم شررؔ بحیثیت شاعر، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء، ص۳۵

۳۲. O SwaledSpengler,The Decline of the west ,(Abridged Edition George Anes Unwin, London, 1922,pp243-261

۳۳. شان الحق حقی، (پیش لفظ) رسومِ دہلی، سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، مرتبہ خلیق انجم، بک ٹاک لاہور، ۲۰۱۹ء، ص۸

۳۴. سید یوسف بخاری، (مقدمہ) رسومِ دہلی، سید احمد دہلوی، رسومِ دہلی، ص۳۶`

۳۵. سید ضمیر حسن دہلوی، اردو ادب کو خواتین کی دین، اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۴ء، ص۱۲۳

۳۶. سید ضمیر حسن دہلوی، مضمون، اردو ادب میں عورتوں کے محاورے اور زبان، مشمولہ: اردو ادب کو خواتین کی دین، اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۴ء، ص۱۳۲

۳۷. عرش تیموری، قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں، مکتبہ جہاں نما، اردو بازار جامع مسجد، دہلی، ۱۹۳۷ء، ص۹۷

۳۸. محی الدین حسن، دلّی کی بیگماتی زبان، دی عثمانینس امریکہ شگاگو، ۶۰۱۹۱۳، (امریکہ)، ۲۰۰۷ء، ص۱۸

۳۹. مرغوب حیدر عابدی، (مضمون)حرفِ آغاز، مشمولہ: دہلی کی آخری شام،مرزا فرحت اللہ بیگ، مرتبہ،صلاح الدین، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص۶
۴۰. سید احمد دہلوی، رسومِ دہلی، ص۷۵
۴۱. مہیشور دیال، عالم میں انتخاب-دِلی، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۱۵ء، ص۴۰۳
۴۲. شائستہ سہروردی، دلی کی خواتین کی کہاوتیں اور محاورے، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، پاکستان، س ن، ص ۲۵
۴۳. غلام مصطفیٰ خاں، ثقافتی اردو، ادارہء فروغِ قومی زباں، اسلام آباد، ۲۰۲۲، ص۴۷
۴۴. ایک گمنام ہندو عورت، سمیتنی اُپدیش، تحقیق و تدوین، دھرم ویر، ڈاکٹر، مترجمہ، نور الاسلام عکس پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۳۰

باب پنجم:

مجموعی جائزہ

زبان کرہ ارض پر موجود مخلوقات میں سے انسان کا نمایاں ترین امتیاز ہے انسانی فکر اور تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتی ہوئی زبان اپنے اندر تاریخی اور سماجیاتی ارتقا اور تبدیلیوں کو محفوظ کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ انسانی امتیاز ہمہ وقت تبدیلیوں کا شکار رہا ہے۔ زبان ساکت و جامد چیز نہیں ہوتی اس میں ہر عہد میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں اور اگر اس کو محدود اور محفوظ کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کی موت واقع ہو جاتی ہے جیسا کہ کی تاریخی زبانیں جو صدیوں پہلے موجود تھیں آج ان کو بولنے اور سمجھنے والے خال ہی ملتے ہیں۔ اردو ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان میں ایک نمایاں حصہ ایسا ضرور موجود رہا ہے جو نسائی لب و لہجے کی عکاسی کرتا ہے ایسے ہزار ہا الفاظ و محاورات اردو زبان میں بھی موجود ہیں جو نسائی فکر، نسائی تہذیب اور نسائی جذبات کے امین ہی نہیں بلکہ ان کا بنیادی محرک ایک عورت ہے اور اب وہ الفاظ و محاورات اردو زبان کا حصہ ہیں۔

عورت کی زبان مردوں کی زبان سے کیوں کر الگ ہوتی ہے یا کسی زبان میں نسائی زبان کا تفریقی پہلو کیوں کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے اس پر بات کرنے سے پیشتر یہ جاننا اتنا ہی ناگزیر ہے کہ اس کا پس منظر کیا رہا۔

زبان چونکہ اپنے بولنے والے کی ذہنی و جذباتی کیفیات کا اظہاریہ ہوتی ہے اس لیے اس فرد یا قوم کی اجتماعی طرز زندگی اس کی اقدار اور روایات، اس کے عقائد و رسومات، اس کے روزگار، جغرافیائی حالات، ماحول، نظام حکومت، سماجی حیثیت، باہمی رہن سہن اور روابط کی نوعیت، طبقاتی تقسیم الغرض مذہب سے معاشیات تک اور گھر سے معاشرے تک کا ہر پہلو اس میں سما جاتا ہے۔ ان میں ذاتی فکر اور جذبات و احساسات کا تنوع بھی شامل ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ تمام رجحانات و امکانات اور تبدیلیاں ادبی اور غیر ادبی متون کی صورت میں محفوظ ہوتی چلی جاتی ہیں۔

دنیا کی تمام زبانوں کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ہر زبان میں نسائی لب و لہجہ یا نسائی الفاظ و محاورات کے ایک الگ ذخیرے کی موجودگی توجہ کھینچ لیتی ہے۔ جس طرح عورت اور مرد کے مزاج اور معمولات میں فرق پایا جاتا ہے اسی طرح زندگی کے بے شمار تفریقی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ مرد اور عورت کی زبان کے تکنیکی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں کے ہاں الگ انداز فکر اور محسوسات

کے جہان آباد ہیں۔ دونوں کے مشاغل و معمولات میں فرق ہے اور دونوں کی سماجی حیثیت، مقام و اہمیت میں بھی واضح فرق ہے۔ دونوں کے مشاہدات اور اظہار کے فطری انداز ایک دوسرے سے جدا جدا ہیں۔ بظاہر ایک ہی زبان بولنے والے مرد و عورت کی نفسیات کا جہان ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔

زبان کے اس فرق کو ماہرینِ لسانیات نے "سماجی لسانیات" کا نام دیا ہے۔ جب ایک ہی زبان بولنے والے افراد میں لب و لہجے اور الفاظ کے چناؤ کا فرق عمر، جنس، پیشے، تعلیم وغیرہ کی وجہ سے ہو تو اسے سوشل ڈائلیکٹ کہتے ہیں اور اگر اس تفریق کے پیچھے علاقائی عوامل کارفرما ہوں تو اسے ریجنل ڈائیلیکٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ جیسے کراچی کے رہائشی کی زبان کا، پشاور کے رہائشی کی زبان میں فرق ضرور ہوگا حالانکہ دونوں اردو ہی بول رہے ہونگے۔ اسی طرح ایک اعلیٰ طبقے کی تعلیم یافتہ عورت اور ایک ان پڑھ نچلے طبقے کی عورت کی زبان بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوگی۔ جیسا کہ دہلی و لکھنو کی بیگمات و محلات اور عام گلی محلے کی خواتین کی زبان میں نمایاں فرق پایا جاتا تھا۔ ایک ہی شہر یا علاقے میں رہنے والی مختلف طبقات کی خواتین کی زبان بھی اس سماجی فرق کی گواہی دیتی ہے۔

ڈاکٹر رابن لیکاف کی لسانی تحقیقات بھی اس تفریق کی تائید کرتی ہیں اور ان تفریقات کو نسائی الفاظ اور نسائی لہجہ کا امتیاز قرار دیتی ہیں۔ وہ تمام چھوٹی بڑی زبانیں جو دنیا کے کسی بھی حصے میں بولی جاتی ہیں اور ان میں سے جو تحریری صورت میں اپنا ادبی مقام نہیں بھی رکھتیں ان میں بھی الگ سے نسائی زبان و محاورات کی تمیز کی جاسکتی ہے۔ تاریخی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ مادر سری نظام سے پدر سری نظام کے قیام اور فروغ و استحکام میں جہاں انسانی معاشرے کے مجموعی نظام اور فکر کو بدلا وہاں زبان پر اثرات مرتب ہونا ایک فطری امر تھا۔ انگریزی زبان بطور عالمی زبان کے دنیا بھر میں لکھی، بولی اور سمجھی جاتی ہے. اس زبان میں بھی نسائی زبان کے تفریقی پہلوؤں کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

خواتین مردوں کے مقابلے میں اسم صفت کا استعمال زیادہ کرتی ہیں۔ تلخ اور قطعیت والے الفاظ کم بولتی ہیں۔ وہ رنگوں اور ذائقوں کو مرد سے زیادہ تفصیلات سے بیان کرنے پر قادر ہوتی ہیں۔ ان کی گفتگو میں جذباتیت کے زیر اثر بولے جانے والے الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ وہ شرم و حجاب کے فطری تقاضوں کے تحت بہت سے موضوعات پر استعاراتی انداز سے گفتگو کرتی ہیں۔ بچوں کے ساتھ توتلی زبان میں بولنا عورتوں کا ہی خاصہ ہے۔ رشتہ داریوں اور تعلقات کے حوالے سے وہ مردوں کی نسبت زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ زمانہ قدیم سے ہی مردوں اور عورتوں کے مشاغل اور حلقے جدا جدا تھے ان کے الفاظ و

کلمات میں نمایاں فرق ہوتا تھا اگر کوئی مرد نسائی زبان کا کوئی لفظ ادا کرتا تو اس کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ بعض یورپی اقوام میں عورت کے لیے عبرانی زبان میں بات کرنے یا عبادت کرنے پر بھی پابندی عائد تھی اور وہ "یدش" نامی زبان بولتی تھیں جسے کم درجے کی جرمن زبان کہا جاتا تھا۔

ایک نظریہ علم الاسماء کے متعلق یہ بھی موجود ہے کہ عام روزمرہ استعمال کی زیادہ تر اشیاء کے نام عورتوں نے ہی رکھے عورت کی زبان میں محکومانہ اور معذرت خواہانہ کمزور الفاظ کی کثرت اس کے معاشرتی کم حیثیت ہونے اور کمزور ہونے پر دال ہے۔ عورت کی حیثیت املاک کی سی تھی اور شوہر کی وفات کے بعد اس کو ورثا میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

آسٹریا اور مغربی وکٹوریا میں مرد اور عورت کی زبان بالکل مختلف ہوتی ہے اور اس بات کا خاص اہتمام برتا جاتا ہے کہ شادی کے بعد بیوی اور شوہر الگ الگ زبان ہی بولے زبان ایک ہونے پر ان کی آپس میں شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کی زبان کو Folk speech کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اردو زبان میں بھی عورت کی زبان کا یہ فرق نمایاں ہے مگر ضروری نہیں کہ عورت کی زبان کو Folk speech کا درجہ دیا جائے کیونکہ اگر عورت پڑھی لکھی ہے اور ادنیٰ طبقے سے تعلق نہیں رکھتی تو اس کی زبان cultivated speech کے زمرے میں آئے گی۔ اردو زبان و محاورات اور ضرب الامثال کا بڑا ذخیرہ نسائی زبان کے طفیل اردو کا حصہ بنا اور تشبیہات و استعارات کے انداز رمز و ایما کی نزاکتیں بھی عورت کی زبان کا حوالہ ہیں۔ عورت میں زبان سیکھنے کی صلاحیت مرد کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے اور زبان کی قدامت بھی عورتوں کے معاملے میں زیادہ پائی جاتی ہے ان کی زبان میں تبدیلی بہت دیر سے آتی ہے کیونکہ ان کا بیرونی دنیا سے رابطہ مردوں کی نسبت بہت کم ہوتا ہے اس لیے ان کی زبان زیادہ خالص اور زیادہ قابل اعتبار ہے۔

اردو زبان میں رشتے ناتوں سے وابستہ سیکڑوں محاورات اور تراکیب عورت کی زبان سے ہی شامل ہوئے۔ بچوں سے پیار تو کہیں پیا کے انتظار کے قصے، کہیں سوتن سے جلاپے کا ذکر اور معاملات تک اردو زبان میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان لفظوں میں جلن، رقابت، جلاپا، چغلی، غیبت، محبت، طعنے تشنے، کوسنے جیسے جذبات کے زیر اثر کئی الفاظ کی ایک طویل فہرست اردو زبان کا حصہ بن چکی ہے۔ کہیں ڈھولک کے گیت ہیں تو کہیں مہندی، برسات کے گیت اور دیگر رسومات کے محاورے۔ لوریاں، بجھا گیریاں، پہیلیاں، سٹھنیاں، کہہ مکرنیاں، ساون کے گیت، جھولا جھولنے کے گیت اور گڑیا کی شادی کے گیت بھی شامل ہیں۔

اردو زبان کے دو بڑے دبستان ہیں دہلوی اور لکھنوی دونوں کا ثقافتی پس منظر ایک دوسرے سے الگ رہا ہے اس لیے ان کی زبان بھی اس حوالے سے کچھ تفریقی پہلو رکھتی ہے۔ عورت کے معمولات زندگی اور ذمہ داریاں اس کے زبان و محاورات کی تشکیل کرتے ہیں۔ اسی لیے "اماں میرے بابا کو بھیجوری کہ ساون آیا " جیسے گیت ایک خاص نسائی پس منظر رکھتے ہیں۔

برِ صغیر پاک و ہند کی عورت اور خاص طور پر ہندوانہ تہذیب و تاریخ کے زیر اثر پلنے والی "پتی ورتا" اور" ستی " جیسی روایات کی پروردہ رہی ہے۔ اسلام کے یہاں پھیلنے کے بعد بھی برِ صغیر پاک و ہندی عورت مسلمان ہو کر بھی اپنے خاص تہذیبی پس منظر کے اثرات کو زائل نہیں کر سکی اس کے نسائی لہجے میں اپنے آپ کو کمتر اور حقیر ہونے کا احساس بولنے لگتا ہے۔ توہم پرستی، تعویذ گنڈے، منتیں، چڑھاوے، ٹونے اور کئی طرح کے شگون نسائی زندگی اور زبان میں شامل ہوتے چلے آئے ہیں جن کا دل چسپ اظہار اردو زبان کا اثاثہ ہے۔

پتی ورتا کا تصور بہشتی زیور جیسی اسلامی کتب میں بھی ملتا ہے اور اکثر ہندوانہ رسوم تھوڑے بہت فرق کے ساتھ مسلمان برِ صغیر پاک و ہندی عورتوں کے ہاں بھی موجود ہیں۔

شادی بیاہ سے لے کر بچے کی پیدائش اور ماتم کی رسومات تک سے وابستہ سیکڑوں اردو الفاظ و تراکیب اور محاورات اسی نسائی تہذیب و فکر کے زیر اثر تخلیق کیے گئے۔ امور خانہ داری کے حوالے سے عورتوں نے سیکڑوں محاورات تخلیق کیے جو اب مردوں کی زبان میں بھی رائج ہیں یعنی اب ان کا حصہ ہیں جیسے دال گلنا، اُبالا سُبالا، آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہونا، منہ میں گھنگنیاں بھرنا، توے کی بوند، توے کا ہنسنا، دال دلیا، تھالی کا بینگن، چھاتی پر مونگ دلنا، آٹے کا پلیتھن، ایک چنا دو دال، گھر کی مرغی دال برابر، بڑی روٹی اٹھانا، لگائی بجھائی کرنا، ۔۔۔وغیرہ

شادی بیاہ اور ماتم کی رسومات کے حوالے سے بے شمار الفاظ و محاورات آج نسائی زبان کی اردو زبان کو دین تصور کیے جاتے ہیں جیسے: کھاٹ الٹانا، تیسرے کے پھول، چوڑیاں توڑنا، تیسرے کے پھول، دو کلمے پڑھوانا، سات سہاگن ہاتھ لگوانا، چوتھی کھیلنا، اُبٹنا ملنا، چار چالے پورے کرنا، مانجھے بٹھانا، سہاگ گھوڑیاں گانا، ساچق کا سامان، ہاتھ پیلے کرنا، چیکٹ اتروائی، رقعہ ڈالنا، گڑیا سجانا۔۔۔وغیرہ

جمع تفریق، گنتی اور پیمائش کے حوالے سے بھی عورت مروجہ پیمانوں کے بجائے اپنے ہی وضع کیے گئے الفاظ استعمال کرتی ہیں جیسے اٹھوارہ یا اٹھواری، پندرھواڑہ، تماہی، ششماہی، پرو پرار (پچھلے سے پچھلے سال) ڈیڑلڑوا(ڈیڑھ کلو) تن پائیا، ادھ پائیا، آدھے کا تیہا، نصف کا تہائی(یعنی چھٹا حصہ)، دھڑی (پنج

سیر ہ)دھون(نصف من)،چاند بھرنا(مہینہ پورا کرنا) اور ان کی گنتی بیس تک ہوتی تھی ۔چالیس کو دو بیسی،ساٹھ کو تین بیسی،سو کو پنچ بیسی کہا کرتیں۔

نسائی زبان کے کئی الفاظ و محاورات اردو زبان مین اسلامی عقائد اور قرآنی آیات کے مفاہیم پر مبنی نظر آتے ہیں جیسے :بسم اللہ کروانا،ڈھیل دینا، آنکھوں کا اندھاہونا،عقل کی اندھاہونا،آفت مول لینا،صم بکم ہونا، کان پھوٹنا، انگلیاں کانوں میں ٹھونسنا، کلیجہ پتھر ہونا، اوڑھنا بچھونا، چولی دامن کا ساتھ ہونا، جامہ پہنانا،۔۔۔وغیرہ

عربی اور فارسی زبان کی آمیزش سے ترکیب پانے والے کئی نسائی الفاظ نے اردو کے دامن کو وسیع کیااور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ و محاورات اردو کے ادبی متون میں بھی شامل ہوتے چلے گئے۔بے شمار فارسی کلیشے اور روزمرہ اصطلاحات مسلم حکمرانوں کی بیگمات کے ذریعے برصغیر کی خواتین میں عام ہوئیں۔امراء کے گھرانوں کی بیگمات تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور انھی کی وجہ سے یہاں پردے کارواج عام ہوا۔ خواتین حیرت یاکسی بری خبر کے موقع پر اللہ اللہ،اللہ ری،ہائے اللہ،اللہ کی مار ہو،اللہ نہ کرے،اف اللہ،ہائے اللہ، اللہ توبہ،اللہ پوچھے۔۔۔جیسے الفاظ بولتیں اسی طرح جب کسی کے حسن کی تعریف کرنی ہوتی تو کہتیں کہ "چندے آفتاب چندے ماہتاب"۔ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا جیسے الفاظ حیلہ بہانہ کرنے والی عورت کی بابت بولتیں جو فارسی میں "رقص کردن خود نداند صحن را گوید کج است" کی صورت میں موجود ہے۔اسی طرح "نہ روئے مرداں نہ روائے زنان" اس عورت کو کہتیں جس کی وضع قطع مردوں جیسی ہو، آج کل ایسی عورت کو "مائی منڈا" یا "ٹام بوائے" کہتی ہیں۔

ماہ لقا چندہ بائی کے ذکر کے بغیر نسائی زبان کا شعری سفر شروع نہیں کیا جاسکتا جسکے ذریعے پہلی بار برصغیر کی عورت اپنے نام اور اپنے قلم کے ذریعے اردو کے شعری سفر میں شامل ہوئی۔اس کے دیوان میں نسائی الفاظ اور تراکیب،عورت کے نفسیاتی مسائل، جنسی مسائل،خواہشات،محرومیوں اور رسوم و رواج کے علاوہ ترجیحات کو اظہار ملتاہے اگرچہ یہ اظہار ریختی کی صورت میں مرد کے قلم سے بھی سامنے آیا مگر ریختی ایک مخصوص طبقے کی عورت کی زبان تھی۔

جان صاحب،انشاء،رنگین، محسن خان نے طوائف کی زبان اور موضوعات کو اردو شاعری کا حصہ بنایا اور ایک نئی راہ نکالی اگرچہ امیر خسرو اور ہاشمی بیجاپوری کی شاعری میں نسائی جذبات و احساسات کی عکاسی کی روایت شامل رہی ہے

"سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں"

اور

"چھاپ تلک سب چھین لی رے مو سے نیناں لگائی کے"

" "خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ

جیسے گیتوں میں ایک عورت کی زبان سے جو فراق اور انتظار کے موضوعات پر قلم اٹھایا جا چکا تھا اور علی عادل شاہ ہی نہیں ملا وجی نے بھی اسی اس رنگ میں شعر کہے جیسے:

"سہیلی یار بچھڑا ہے مجھے وہ یار یاد آتا

بسر نہیں سکتی میں اک پل میانے سو سو بار یاد آتا"

یوں ہمیں اردو شاعری میں ریختی سے قبل بھی نسائی زبان کے آثار ملتے ہیں اور اردو زبان و ادب کے اولین سفر میں نسائی زبان کسی نہ کسی طور پر موجود رہی۔ ریختی سے نسائی زبان میں قابل قدر اضافہ ہوا کہ اردو میں وہ الفاظ و تراکیب تحریر کی صورت میں سامنے آئیں جو اس سے قبل محض زبانی طور پر موجود تھیں مگر کسی شعری اور نثری ادب کا حصہ نہیں بنی تھیں۔

عورت کے استعمال کی اشیاء اس کا لباس اور اس کے مختلف حصوں کے نام جیسے: انگیا کے مختلف حصوں کے نام انگیا کے گھاٹ، انگیا کی چڑیا، انگیا کی کلیاں، انگیا کا بنگلہ۔۔۔ وغیرہ۔ اسی طرح لونگ، نتھ، پراندہ، پشواز، کرتی، پاجامہ گھاگرا، تعویذ، کنگن، چوڑی، بالی، پازیب۔۔۔ وغیرہ جیسے سینکڑوں اسماء و الفاظ اردو زبان و ادب میں پہلی بار شامل ہوئے۔

عورتیں مردوں کے برخلاف صرف دوست کا لفظ استعمال نہیں کرتیں بلکہ عورت کی عورت سے دوستی کے کئی نام اور درجات ہوتے تھے اور ملازمائیں بھی اپنے اصل نام کی بجائے دیے گئے نام یا عہدے کے مطابق پکاری جاتی جیسے: سہیلیوں کے لیے گوئیاں، زناخی، الائچی، دوگانہ، خسیلا اور اُچھال چھکا، سکھی اور سہیلی وغیرہ۔

ملازماؤں کے الگ الگ نام تھے، مختلف پیشوں سے وابستہ خواتین کے مختلف نام اور اصطلاحات تھیں۔ جیسے نائن کو خاص تراش یا مشاطہ کہا جاتا تھا۔ چاند کو "اوپر والا" اور چڑیل کو "اوپر والی" کہا کرتی تھیں۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ الفاظ و محاورات کی ذیل میں ہزاروں الفاظ نسائی فکر اور نسائی اظہار کے باعث اردو زبان کا حصہ بنے اور جذباتیت کا عنصر عورتوں میں مرد کی نسبت کہیں زیادہ ہونے کے باعث سیکڑوں

محاورات ان کی کیفیات کے اظہار پر مبنی ہیں ہم ان کی درجہ بندی مختلف ذیلی عنوانات کے تحت بھی کر سکتے ہیں جیسے دتا تریہ کیفی نے اپنی کتاب " کیفیہ " میں محاورات کی ذیل میں کی جیسے سماجی محاورے حیوانی محاورے، موسمی محاورے، نباتی محاورے ا، عضائی محاورے، پوشاکی محاورے، صنعت و حرفت کے محاورے ، عددی محاورے وغیرہ۔

اب صرف خانہ داری کے محاورے کی صورت میں ان کی نسائی زبان کے تناظر میں دیکھا جائے تو بیسیوں محاورات عورت کی زندگی، مشاغل، معمولات اور اس کے سنگھار اور لباس کی مختلف اشیاء اور جذبات و احساسات کی مختلف اوقات میں مختلف کیفیات پر مبنی محاورات کی بھی طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے مثلا خانہ داری اور گھر داری کے امور سے متعلق عورتوں کے سیکڑوں محاورات الگ کیے جاسکتے ہیں جیسے:

آٹے کی چڑیا ہونا، پانچوں گھی میں ہونا، گھی کے چراغ جلانا، روٹی سینکنا، ایک چنا دو دال ہونا، دھنیے کی کھوپڑی میں پانی پلانا، پھیکا شلجم ہونا، گنی بوٹی نپا شوربہ ہونا، آگے کو گھاس نہ پیچھے کو پانی پوچھنا،۔۔۔ وغیرہ۔

اسی طرح رسومات کی مد میں ایک قیمتی موضوعاتی ذخیرہ نسائی زبان کی صورت میں موجود ہے اور وہ تمام رسومات عورت کی زندگی سے وابستہ ہیں۔ سیکڑوں محاورات اردو زبان و ادب میں عورت کی زبان کے اختراع کردہ اور استعمال کردہ محفوظ ہیں جن کو تخلیق کرنے اور رواج دینے والی عورتیں تھیں اور پھر وہ الفاظ و محاورات زبان زد عام ہو کر معاشرے کی عام روزمرہ زبان کا حصہ بنتے چلے گئے ان رسومات و واقعات پر مبنی الفاظ و محاورات اور اصطلاحات بہت زیادہ ہیں۔ ان میں برصغیر کی عورت کی مکمل تہذیبی تاریخ کا نقشہ موجود ہے اس کے طرز فکر و حیات اور سماجی مقام و مرتبے کا تعین بھی ملتا ہے اس کی معاشرتی زندگی کی پیچیدگیاں بھی، معمولات و مسائل اور حد بندیاں بھی اور اس کے عہد کے مسائل بھی واضح دیکھے جاسکتے ہیں۔ آج جو رسومات ختم ہو چکی ہیں اور ہم ان سے واقف نہیں ہیں ان کا مکمل پس منظر ایک چھوٹے سے دو حرفی محاورے میں مل جاتا ہے۔ جیسے: بی بی کی صحنک اٹھانا. ٹھیکری کی مانگ ہونا چوتھی کا پھیرا الگوانا، چیکٹ اتروانا، اُبٹنا کھیلنا، چوتھی کھیلنا، میٹھے کو ہاتھ لگوانا، صدقے کے ماش، تیل بیچنا، کونڈا پکانا، دہی کا ٹیکا لگانا، صدقے کی گڑیا بنانا ۔۔۔ وغیرہ۔

ایسے سیکڑوں محاورات جو عورت کی اختیار کردہ مخصوص رسومات کی یاد دلاتے ہیں اور ان سے کوئی نہ کوئی تاریخی و تہذیبی عقیدہ یا رسم وابستہ ہے جیسا کہ شیعہ فرقہ کی ایسی بیسیوں رسومات اور عقائد برصغیر میں متعارف ہو کر نسائی زندگی کا حصہ بن گئیں جن کا پہلے وجود نہ تھا وہ حیدر شاہ اور کے عہد میں ہی تخلیق ہوئیں۔

جس طرح "چیکٹ اتروانا" دلہن کی ماں کا بیٹی کی شادی کے بعد میلے کچیلے کپڑے اتروا کر نیا جوڑا پہننے کی رسم ہوا کرتی تھی جو اب موجود نہیں ہے۔ "گڑیا سجانا" کا محاورہ بیٹی بیاہنا کے معنوں میں بولا جاتا تھا، "بی بی کی صحنک "حضرت بی بی فاطمہ زہرا کے نام کی نیاز دلوانے کو کہا جاتا، صحنک برتن کو کہا جاتا ہے جس میں نیاز کا میٹھا تقسیم کیا جاتا ہے اور منت مانی جاتی ہے۔

باب دوم میں نسائی زبان کے امتیازی پہلو کے پیش نظر ان الفاظ و محاورات اور کہاوتوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ابتدائی اردو زبان کے لسانی ادبی اور ثقافتی تناظرات کے پس منظر کے ساتھ ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء کے منتخب لسانی متون کا حصہ بنے اور ان میں یہ دیکھنے کی کوشش کی گئی کہ اردو زبان جب اپنی ابتدائی لغات مرتب کر رہی تھی اور ماہرین ان کے اولین اندراج کی حساس اور نازک ذمہ داری اٹھارہے تھے تو انہوں نے ان نسائی الفاظ و محاورات کو کس حد تک اہمیت دی اور انہیں بطور نسائی زبان اردو ان کی مخصوص حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے لسانی کام کا حصہ بنایا۔ کیونکہ اس سے قبل اردو زبان کم و بیش بولی کی حیثیت رکھتی تھی جس کے لغات و قواعد مرتب کیے گئے تھے نہ اس میں داستان اور ناٹک اور شاعری کے علاوہ کوئی ادبی تخلیقات کا قابل ذکر مواد تحریری صورت میں موجود نہ تھا۔ لسانی حوالے سے کئے گئے کام کا جائزہ لیتے ہیں تو اردو کی پہلی قابل قدر لغت "فرہنگ آصفیہ" ایک ایسی مربوط اردو لغت کے طور پر سامنے آتی ہے کہ اس سے قبل اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور آج بھی اردو کی جامع ترین اور قابل اعتماد لغت کے طور پر اپنی شناخت رکھتی ہے۔

۱۸۵۷ء سے قبل کے اردو لسانی سطح کے کاموں میں چند قواعد کی کتب اور مستشرقین کا کام نظر آتا ہے ابتدائی سطح پر قواعد کی کتاب اور مخصوص اصطلاحات پر مبنی نصاب ناموں کی صورت میں "رازق باری"، "اللہ باری"، "قادر باری"، "خالق باری"، واسع باری"، نعمت باری" نامی تالیفات جو قواعدی اور نصابی ضرورت کے تحت مرتب کی گئی تھیں ان میں ایسی زبان و محاورات کی تخصیص و اندراج کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ یہ فارسی یا اردو زبان سیکھنے کے قواعد یا مترادفات وغیرہ پر مبنی تھیں۔ ان میں نسائی زبان و محاورات کی تخصیص و اندراج کا اہتمام نہیں کیا گیا تھا۔ ان نصاب ناموں میں امیر خسرو کے کام کو اردو اور فارسی کے ملاپ کا قابل ذکر نمونہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

"خالق باری" میں امیر خسرو نے جو پہیلیاں، گیت، کہہ مکرنیاں وغیرہ شامل کیں وہ نسائی انداز بیان کا بہترین نمونہ قرار دیئے جاسکتے ہیں۔

"چھاپ تلک سب چھین لی رے موسے نیناں ملائی کے"

"کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا آیا کتا کھا گیا تو بیٹھی ڈھول بجا"

"دھوپوں سے وہ پیدا ہووے چھاؤں سے مر جاوے، اے ری سکھی میں تجھ سے پوچھوں، ہوا لگے مر جائے"

"پیار سے منہ پر دیت ہے جان۔۔۔اے سکھی ساجن نہ سکھی پان"

ان جیسی خاص نسائی لب و لہجے کی پہیلیاں بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں۔

عبدالواسع ہانسوی کی تالیف "غرائب اللغات ۱۷۵۰ء" کو اردو زبان کی قدیم ترین لغت بھی کہا جاتا ہے جسے بعد ازاں سراج الدین علی خان آرزو نے "نوادر الالفاظ" کے نام سے تدوین کیا۔ ۱۷۹۲ء میں مرزا جان طپش دہلوی نے "البیان فی مصطلحات برِ صغیر پاک و ہند" کے نام سے ایک ۹۶ صفحات کی الفاظ و محاورات کی لغت مرتب کی جس کے لیے تشریح کے لیے پورے پورے اشعار شامل کیے گئے الفاظ و محاورات ردیف وار درج کیے گئے تھے۔

ان میں بالخصوص نسائی زبان کے ذیل میں تو نہیں لیکن بالعموم چند نسائی محاورات کو شامل کیا گیا۔

۱۸۰۲ء میں انشاء اور قتیل نے جب "دریائے لطافت" کو تصنیف کیا جس کو بعد ازاں ۱۸۴۸ء میں مرشد آباد سے شائع کیا گیا تو اس میں ہمیں نسائی زبان اپنے مخصوص برِ صغیر پاک و ہندی رنگ میں پوری جرات اور عین فطری رنگ کے ساتھ نظر آتی ہے۔ انشا اور رنگین نے چونکہ ریختی میں بھی نسائی زبان کا بھرپور استعمال کیا تھا اور روزمرہ کے استعمال میں انہیں مہارت حاصل تھی اس میں بھی مکالموں کی صورت میں بخوبی برتا گیا۔

۱۸۳۳ء میں مولوی محمد مہدی واصف کی "دلیل ساطع" بطور اردو ہندی لغت کے شائع ہوئی جس میں نسائی محاورات خاصی تعداد میں شامل کیے گئے تھے۔ "فرہنگِ آصفیہ" سید احمد دہلوی کی مرتب کردہ اردو کی معروف ترین لغات میں شمار ہوتی ہے۔ اس سے قبل سامنے آنے والی اکثر لغات معنی و مترادفات کے حوالے سے محض شعری حوالوں پر مشتمل تھیں۔ اور کچھ فقط نصاب ناموں کے طور پر مرتب کی گئی تھیں۔ "مخزن المحاورات" اور "مخزن الفوائد" محاورات پر مشتمل تھیں۔ "فرہنگ آصفیہ" میں اس کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور انگریزی زبان الفاظ جو اردو زبان و ادب کا حصہ بن چکے تھے ان کو بھی شامل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ زنانہ محاورات تو الفاظ کی تخصیص کا بھی خیال رکھیں ان پر صرف یہی احسان نہیں کیا بلکہ انہوں نے نسائی زندگی، نسائی زبان و رسومات اور تربیت کے لئے قابل قدر تالیفات چھوڑی ہیں جن میں "

روز مرہ دہلی"، "ناری کتھا"، "انشائے ہادی النسا"، "فسانہ راحت"، "قصہ مہر افروز"، "لڑکیوں کی پہلی کتاب، "اخلاق النساء"، "تسخیرِ شوہر" اور "رسوم دہلی" شامل ہیں۔

یہ تمام تالیفات انہوں نے خواتین کی زبان و اخلاق کی تربیت کے لیے مرتب کی تھیں انہوں نے خواتین کی خط و کتابت کی تربیت کے لئے بہت خوبصورت اور زنانہ خالص زبان میں خطوط لکھے۔

"تزئین کلام" میں آٹھ ہزار ضرب المثال جمع کر دیئے۔ "روز مرہ دلی" میں محاورات اور روز مرہ اکھٹے کر کے محفوظ کر دیے۔ ہندو عورتوں کی روز مرہ گفتگو مکالمے پر مشتمل ایک کتاب لکھی اور زنانہ خط و کتابت اور گھر داری کے امور بابت نہایت دل نشیں انداز میں "تحریر النسا"، "فسانہ ءراحت" اور "قصہ دل افروز" میں موضوعات چنے۔

"رس بکھان" میں پہلیاں، کہہ مکرنیاں، نسبتی، دوہے، بھجن، گیت کی صورت میں نسائی زبان کو محفوظ کیا گیا۔ سید احمد دہلوی خود فرہنگ آصفیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ انہوں نے عورتوں کے عام روز مرہ الفاظ و محاورات کے ساتھ ان کی دعائیں، ان کے کوسنے، بچوں کے ساتھ کھیلنے یا بولنے کی آوازیں، لوریاں، پہیلیاں، کہاوتیں، روایتیں اور عام روز مرہ گفتگو کے تمام الفاظ کو بالخصوص شامل لغت کیا جیسے:

ہپو (یعنی بہت بوڑھی پوپلی عورت)، کم بخت، کم نصیب، طلاقن، شیطاح، شفتل، کٹنی، قطامہ، جمالو، تماشا خانم، پخنی پچوڑی، بچھل پائی، پکی پیٹھی، تتیا مرچ، اُچھال چھکا، بس بھری، پھاپھے کٹنی، وغیرہ جیسے اندازِ تخاطب عورتوں نے ہی متعارف کروائے۔

"انشائے ہادی النسا" سید احمد دہلوی کی قابل قدر تصنیف ہے جس میں انہوں نے مثالی خطوط نسائی زبان میں لکھ کر عورتوں کی تربیت کی کوشش کی تا کہ وہ اپنے انداز میں اپنے معمولات زندگی کو خط و کتابت میں لا سکیں اور خطوط غالب کی اشاعت کے بعد اردو زبان کو جو عام روز مرہ زبان کو تصنع و بناوٹ کے دبازتوں سے نکالنے کی ابتدا ہو چکی تھی اس میں نسائی لب و لہجے نے بھی اپنا حصہ شامل کیا۔

یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے جس میں بڑی بوڑھیوں کے نام خطوط کے ذریعے لوریاں اور بچوں کی تربیت کی بابت اصلاح موجود ہے میاں بیوی کے خطوط اور سہیلیوں کے نام خطوط ہیں۔ گھر کے ملازموں کے علاوہ چند کاروباری امور بابت خطوط بھی شامل ہیں۔ خط کے پیرائے میں خانہ داری کے اُمور بچوں کو کھلانے کے انداز بھی رقم ہیں۔

امیر حمد مینائی کی "امیر الغات "۱۸۹۲ء میں شائع ہوئی جلد اول "الف ممدودہ "اور جلد دوم "الف مقصورہ "کی صورت میں لکھنوی زبان کے مخصوص انداز کا اثاثہ ہے اس میں لکھنوی تہذیب میں بننے والی خواتین کے عام بول چال کے الفاظ استعارات ومحاورات ،مقولے ، رسوم و رواج " بولیاں ٹھولیاں ، مترادفات، لڑائی جھگڑے اور طعنے تشنے بد دعائیں کو سنے تک موجود ہیں۔

اس لغت میں امیر مینائی نے انسانی زندگی سے متعلقہ مختلف رسومات قسم کھانے کا انداز اور پیشہ ور عورتوں کی اصطلاحیں ،رسومات ،خواتین کے ٹوٹکے ،مختلف دعائیہ الفاظ ،عورتوں کی مختلف رسومات وعقائد کا بھی تذکرہ موجود ہے۔خواتین قسم کھاتیں تو کہتیں "آنکھوں کو پاؤں "،"بھتہ کھاؤں "،"میرا منہ دیکھے ،دعا دینی ہو تو کہتیں "کوکھ ٹھنڈی ہو", کوستے وقت کہتیں "نگوڑے،موئے،"۔۔۔وغیرہ۔

ان کی روزمرہ گفتگو میں آنکھوں کی سوئیاں رہ جانا، آٹے کا چراغ اندر رکھوں تو چوہا کھائے باہر رکھوں تو کوا لے جائے، آپڑوسن مجھ سی ہو، آدمی نہ آدم زاد، آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی، آگ لگائے نہ جلے، ادھار کھائے بیٹھے۔۔۔ جیسے الفاظ بولتی تھیں ۔ رسوم وعقائد کے حوالے سے آسا کے نام کا چلا اٹھانا، آئینہ الٹا کرنا،امام ضامن کا روپیہ ،مولا علی کی قسم ،پاک بی بی کی قسم ،آل کا انڈا اور آتی پاتی جیسے کھیل کے علاوہ عجیب اصطلاحات جیسا کہ ادوائن کا توتا (یعنی ٹانگیں کھول کر چلنے والا) بولا کرتی تھیں۔

"مخزن المحاورات "۱۸۸۸ء میں دہلی سے شائع ہونے والا قابل قدر مجموعہ محاورات کہلایا جا سکتا ہے جسے منشی چرنجی لال نے جو سید احمد دہلوی کی طرح ڈاکٹر فیلن کے تربیت یافتگان میں شامل تھے اس مجموعے میں نسائی زندگی کے ادبی اور گھریلو مختلف پہلوؤں سے وابستہ عبادات وعقائد سے منسلک شادی بیاہ اور موت مرگ کی رسومات وعقائد کے ساتھ ساتھ ثقافتی اور پیشہ ورانہ اصطلاحات کو شامل کرتے ہوئے نسائی زبان کے پہلو کو بھی کسی قدر اس مجموعے میں شامل رکھا۔عام بول چال کے الفاظ اور نسائی لوک گیت اور مختلف بولیوں کے علاوہ فقیروں کی صدائیں سبزی ٹھیلے والوں کی آوازیں، بھجن، گیت پہیلیوں اور بولیوں ٹھولیوں کو بھی شامل کیا۔نسائی نفسیاتی اور سماجی محاورات کی جمع آوری میں کوسنوں کی شمولیت کو یہ بھی نہیں بھولے۔

نسائی زبان کے ادبی تناظرات کے حوالے سے ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء کے دوران ممتاز اردو ناول نگاروں کے منتخب ناولوں میں نسائی زبان کی صورت حال پر مبنی ہے اس میں اول ۱۸۵۷ء سے قبل کئی معروف داستانوں "سب رس "اور "فسانہ عجائب "میں نسائی زبان کے استعمال کے علاوہ "رانی کیتکی "کی کہانی کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس میں برِ صغیر پاک وہندی تہذیب کے قریب تر رہتے ہوئے عام روزمرہ بول چال اور تراکیب و

افعال کے ساتھ ساتھ محاورات کا استعمال کیا گیا اس میں ابتدائی اردو میں مقامی الفاظ و تراکیب کا رنگ ملتا ہے اور کھٹائی میں پڑ جانا جیسے محاورات کے ساتھ کی نسائی الفاظ و مرکبات کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ مختلف نسائی رسوم کا بھی ذکر ہے۔

"سب رس" کے مصنف وجہی نے آسان اور سادہ زبان میں انشاء پردازی دکھائی اور ہمیں "سب رس" میں وہ الفاظ و محاورات نظر آتے ہیں جو آج بھی اردو زبان میں رائج ہیں اور بولے لکھے جاتے ہیں جیسے خالہ جی کا گھر، شان نہ گمان، کہاں گنگا تیلی کہاں راجہ بھوج، دیکھا دیکھی، چھائیں مائیں کرنا، دودھ کا جلا چھاج بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔۔۔وغیرہ۔ ان سے ہمیں اردو زبان میں نسائی تاریخ اور طرز حیات کی روایات کا بھی پتا چلتا ہے کہ کس عہد میں عورتوں نے کون کون سی رسومات اختیار کر رکھی تھیں، ان کے انفرادی اور اجتماعی اظہاریے کا رنگ کیسا تھا؟ محاورات اور ضرب الامثال کا برتاؤ کس قدر تھا؟ مقامی تہذیب کا رنگ کیا تھا؟ مذہبی رسومات کیسے ادا کرتی تھیں؟

جیسے عورتیں ہم قافیہ الفاظ و مرکبات اور مہمل الفاظ کا استعمال مردوں سے زیادہ کرتی ہیں اس بات کا پتا بھی انہیں نسائی کرداروں کی گفتگو اور مکالمے سے چلتا ہے جیسے مانگا تانگا، روکھا سوکھا، کپڑا اوپڑا، سیدھا سادہ، اُبالا سُبالا، ننگا منگا، چھینک پھانک، دے دلا وغیرہ۔

میر امن دہلوی کی معروف تصنیف باغ و بہار میں سادہ روزمرہ نسائی زبان ملتی ہے نسائی کرداروں کے برجستہ جملے، محاورے اور کہاوتیں بولنا ایک عام عورت کی زبان اور الفاظ کے چناؤ میں عین فطری نظر آتا ہے ۔.. کئی برِ صغیر پاک وہندی رسومات جیسے بیوہ کی چوڑیاں توڑ دی جاتی تھیں، پاؤں کی انگلیوں میں بچھوے پہننا بھی سہاگ کی علامت ہوتا۔ اگر پاؤں کی انگلیوں میں زخم بن جاتے اور وہ پاؤں گل سڑ جاتے تب بھی پاؤں کی انگلیوں سے بچھوے اتارنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

کالی بلی راستہ کاٹ جائے تو بدشگونی ہے، جوتا الٹا رہ جائے تو سفر درپیش ہوگا، دودھ ابل کر باہر گر جائے تو بری خبر ملے گی، منگل کو مردوں کے کپڑے دھونے سے مردوں کی زندگی کو خطرہ اور عورت کے سر کے بال منگل کے دن دھونے سے شوہر کی موت واقع ہو سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

"فسانہ عجائب" میں لکھنوی تہذیب کی پروردہ عورت کی زبان ملتی ہے جہاں قافیہ پیمائی اور تکلف و تصنع ہے کیونکہ رجب علی بیگ سرورؔ نے پوری داستان کا اسلوب مسجع و مقفع ہے۔ اس لئے یہاں ہمیں عورت کی زبان بھی پُر تکلف ملتی ہے۔ رجب علی بیگ کی ساری توجہ آرائشِ عبارت پر ہونے کے باعث ہمیں نسائی

زبان کا فطری رنگ نظر نہیں آتا۔ محلاتی زبان، ماماؤں کی زبان، گلی محلے کی زبان اور انجمن آرا اور جان عالم کے مکالمے بھی پر تکلف فضا کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ البتہ چند مقامات پر جیسے مثال کے طور پر بھٹیارن کا کردار اپنے مقامی لہجے میں گفتگو کرتا ملتا ہے جو ضرورت کو جرورت اور ہم کو ام غرض کو گرج اور غریب کو گریب کے تلفظ سے ادا کرتا ہے۔ اعتقادات اور شبہات کا ذکر یہاں بھی نسائی فکر کی عکاسی کو مل جاتا ہے جیسے چڑیمار کا بندر کو مٹھائی کھلانا، جادو گرنیوں کے جنتر منتر پر اعتماد کرنا، بہشت کی تختی دھو کر اس کا پانی پلانا، قرعہ نکالنا، ساعت سعید کا حساب لگانا، عورتوں کا مختلف طرح کی منتیں ماننا، سکینہ کے نام کا علم چڑھانا، کونڈے بھرنا، چھٹی کی رسم کرنا، داہنی آنکھ کے پھڑکنے کو بد شگونی قرار دینا وغیرہ۔

اس سے اگلے پڑاؤ ناول کی طرف بڑھتا ہے تو ہم ڈپٹی نذیر احمد کے "مراۃ العروس" کے نسائی زبان و محاورہ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے جس نے داستانوی شہزادوں اور شہزادیوں اور ملکہ کے قالب سے نکل کر عام گھریلو عورت کو اس کے خانگی اور خانہ داری کے مسائل اور روزمرہ معاملات کی طرف لے جایا گیا اصلاح نسواں کی خاطر لکھے گئے ناول "مراۃ العروس" اور "ایامیٰ" میں ہمیں ہزاروں کی تعداد میں نسائی محاورات ملتے ہیں۔

یوں لگتا ہے برِ صغیر پاک و ہندی تہذیب کی غریب اور متوسط طبقے کی عورت ہمارے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔

اکبری، اصغری اور ماما عظمت کے کرداری اوصاف سے قطع نظر ان کے مکالموں اور عام روزمرہ گفتگو پر اپنی توجہ مرکوز کریں تو یوں لگتا ہے کہ تاریخ اردو ادب کے صفحات پر پہلی بار کوئی مکمل عورت سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ جس کے مسائل و معاملات ایک عام برِ صغیر پاک و ہندی مسلمان عورت کے ہیں جس کے موضوعات اور الفاظ کا چناؤ بالکل بھی غیر فطری نہیں اور جو روزمرہ محاورات کا عین فطری انداز میں اظہار کرنا جانتی ہے۔

"ایامیٰ" اور "مراۃ العروس" میں ڈپٹی نذیر احمد نے نسائی مکالمہ کو وہ عروج بخشا کہ اس کی دوسری مثال نہیں ملتی بڑی بوڑھیوں کی نصیحت آمیز گفتگو سے لے کر اکبری کے لااُبالی اور پھوہڑپن بھرے لہجے تک، ماما عظمت کی چالاکیاں، کٹنی کی لچھے دار گفتگو ہمیں برِ صغیر پاک و ہندی معاشرے کے مسلمان عورت کی زندگی کے مختلف رنگ دکھاتی ہے۔

"فسانہ آزاد "رتن ناتھ سرشارؔ کا قسطوں میں چھپنے والا داستانی ناول ہے۔اسے ہم داستان اور ناول کی درمیانی کڑی قرار دے سکتے ہیں۔ماحول اور ثقافت لکھنوی ہے اور تہذیبی رنگ تو اس قدر نمایاں ہے کہ جگہیں، مقامات بدلنے کے باوجود زبان اور ثقافت تبدیل نہیں کیے گئے. خیر اس بحث سے قطع نظر ہم نسائی زبان کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو لکھنوی عورت کو دہلوی عورت کے برعکس آزاد خیال اور جدید سوچ کی حامل رنگیں مزاج اور جنسی تقاضوں پہ نہ شرمانے والی عورت بھی ملتی ہے۔یعنی زبان وغیرہ کے رنگ مخصوص ہیں مگر تہذیبی رجحان زیادہ ہے حسن آرااور سپہر آرا کے مکالمے نسائی اظہار کی زندہ مثالیں ہیں۔

سرشارؔ کو گویا نسائی زبان پر ملکہ حاصل تھا "فسانہ آزاد "میں لکھنو کی بیگماتی زبان اور ان کے روزمرہ معمولات کا مخصوص انداز موجود ہے برِصغیر پاک وہندی عورت کی ضعیف الاعتقادی بھی یہاں موجود ہے اور وہ تعویذ دھاگے ٹونے ٹوٹکے، درباروں پر چادریں چڑھانا، چراغ جلانا اور نیاز دلوانا اور مخصوص ایام منانے کی روایت ملتی ہے جو اس تہذیب کی عورت کے شب و روز کا حصہ تھی اور اردو زبان میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی۔

امراؤ جان ادا کا تعلق بھی لکھنوی تہذیب سے ہے مگر اس ناول میں مخصوص ثقافتی رنگ کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کی عظمت وانفرادیت ایک بہترین ناول کی صورت میں سامنے آتی ہے۔

عورت کے لہجے کی لچک اور نرمی اس کے الفاظ کے چناؤ میں بھی سمٹ آئی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص تکلف اور تصنع بھی کہیں کہیں نظر آتا ہے اس عورت کی زبان سے مختلف مصائب کے تذکرے بھی ہیں مگر سب کچھ نہایت شستہ و شائستہ زبان اور تہذیب سے ہم آہنگ ہے ایک عورت کا خانم کے روپ میں انداز تخاطب اور مکالمہ بھی ہے اور ڈبل شاہ جیسے کرداروں کی عملی مثال بھی پیش کی گئی ہے۔گفت شنید میں رکھ رکھاؤ ہے نوابی عہد کے زوال کے حالات کے پس منظر میں نسائی نستعلیق انداز گفتگو مخصوص ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔

" دیساں داراجہ میرے بابل داپیارا " جیسے لوک گیت بھی ہیں۔کوٹھے پر رہنے والیوں کی مخصوص زبان ہے۔خاص تربیت ہے اُمراؤ جان ادا کا محاورہ رواں ہے۔ گفتگو برجستہ اور ذہانت بھری ہے۔شعر و سخن کا شوق ہے اور مسابقت کا جذبہ ان کے کردار اور بیانیہ میں جھلکتا ہے۔امام باڑے اور تعزیہ داری میں خواتین کی شمولیت لکھنوی تہذیب کا خاصہ ہے "امراؤ جان ادا "میں عاشورہ محرم کی محافل کا ذکر نسائی اعتقاد اور اہتمام کی تفصیلات ہیں۔

"فردوس بریں" ایک تاریخی ناول نگار اور موءرخ عبدالحلیم شررؔ کا خوبصورت اور مختصر ناول ہے جس کا پلاٹ ایران میں دکھایا گیا ہے اور اس تاریخی ناول میں نسائی زبان وبیان کے حوالے سے کچھ خاص مواد نظر نہیں آتا اور ناول کا رنگ بھی تاریخی بیانیہ لیے ہوئے ہے۔ فطری مناظر اور فرضی جنت کے تذکرے ہیں۔ حوروں کے روپ میں موجود نوجوان لڑکیوں کا ذکر بھی ہے لیکن ناول کی زبان وبیان میں نسائی زبان وغیرہ کی چاشنی نہ ہونے کے برابر ہے چند اسلامی تہذیب کی روایات اور عقائد کا تذکرہ ہے عورت کا نامحرم کے ساتھ سفر نہ کرنا وغیرہ۔

البتہ زمرد کی گفتگو سے اس کی نسائی فکر کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ بطور عورت چاہے اس کی حیثیت یا مقام کوئی بھی ہو وہ اخلاقی اقدار اور روایات کی پابندی ہونی چاہیے وہ ایک محبوبہ کے طور پر اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور بھی ہے اور ایک شریف مسلمان عورت کی حیثیت سے اپنی عزت وناموس کی حفاظت کا احساس بھی رکھتی ہے۔ مرحوم بھائی کی قبر پر بھی جانے کی خواہش کرتی ہے اپنے الفاظ کے چناؤ اور گفتگو کے انداز اور فکری سطح سے ایک پاکیزہ سمجھدار ہوش مند جوان لڑکی ہے اس ناول میں نسائی زبان محاورہ سے زیادہ کام نہیں لیا گیا کیونکہ اس میں پلاٹ اور کہانی کے لحاظ سے گنجائش بھی نہ تھی اور تہذیبی ماحول بھی برِصغیر پاک وہندی نہ تھا اس لئے مقامی الفاظ و محاورات اور طرز فکر و اظہار اس پر غالب آتے تو اس ناول کی خامیوں میں شمار کئے جاتے مگر نسائی گفتگو بہت مدبرانہ ہے جو ایک بہادر اور دوراندیش خاتون کا باوقار کردار ظاہر کرتی ہے موضوع پر مقصدیت کا رنگ غالب ہے اس کی وجہ سے شررؔ کا انگریزی زبان وادب کا پس منظری مطالعہ بھی ہے انہوں نے اردو نثر کو انگریزی زبان وادب کا پس منظری رنگ بھی دیا ان کی تحریر میں سجاوٹ اور بناوٹ سے بچتے ہیں اور تحریر میں بلاضرورت اور تسلیم وبناوٹ سے گریز کرتے ہیں۔

نسائی اردو زبان و محاورہ کے ثقافتی تناظرات کے حوالے سے منتخب کتب کا جائزہ لیا گیا تو ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء برِصغیر پاک وہندی ثقافت وتہذیب کے حوالے سے سید احمد دہلوی کی "رسومِ دہلی "عبدالحلیم شررؔ کی" گزشتہ لکھنؤ" اور نواب واجد علی شاہ کے خطوط خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انسانی زندگی کی اجتماعی سرگرمیاں کسی بھی سماج کی ثقافتی صورت کو ترتیب دیتی ہیں۔ برِصغیر پاک وہندی تہذیب میں یہاں کے سیاسی اور جغرافیائی حالات مذہبی رسومات اور سماجی اقتدار مل کر ایک خاص تہذیبی مزاج بناتی ہیں۔

برِ صغیر پاک وہندی ثقافت میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ برِ صغیر پاک وہندی زندگی پر مسلم فاتحین کے اس قدر اثرات پڑے کہ ہندوؤں کی خانگی زندگی رسم ورواج لباس شادی بیاہ کی رسومات تہوار اور میلوں ٹھیلوں پر ایک ملی جلی تہذیب نے جنم لیا۔

"فسانہ عبرت" کے پانچ ابواب جو احوال نصیر الدین حیدر اول سے لے کر بادشاہ بیگم منا جان محمد علی شاہ امجد علی شاہ اور نواب واجد علی شاہ کے دور حیات کا احاطہ کرتے ہیں۔ نمایاں ترین چیز اودھ کی ثقافتی زندگی اور تقریبات کا بیان ہے۔ اودھ کی ثقافتی زندگی میں زبان کی شائستگی، نرمی اور حلاوت تھی اور اسی نزاکت کے باعث اس پر زنانہ پن کا الزام بھی عائد کیا جاتا تھا۔ خصوصاً نواح کے دیہاتی اس تہذیبی بلندی کو زنانہ پن قرار دیتے تھے ویسے تہذیب کے لغوی معنی بھی خرمے کے درخت کی چھال کو تراش کر اس کا بھدا پن دور کرنے کے ہیں۔

نسائی زبان کا استعاراتی اور علامتی پہلو اسی تہذیب میں ہمیں اوجِ کمال پر نظر آتا ہے۔ خواتین حکیم سے زنانہ امراض کی دوا لینے کو جاتی تو جسم کے مختلف حصوں کے نام علامتی انداز میں لیا کرتی تھیں مثلاً رحم میں ورم ہوتا تو کہتیں کہ "ٹھیکری میں ورم ہے" غسل کا لفظ صرف مردے کے لیے استعمال ہوتا تھا غسل خانہ بھی اسی لئے حمام کہلاتا تھا کوئی نہار ہا ہوتا تو ملازمہ بولتی کہ "حمام میں ہیں"۔ سانپ کو "گھر والا" یا "زمین والا" بندر کو "ڈولی والا" دھوبن کو اُجلی کہا کرتی تھیں۔ کیونکہ دھوبن جادو میں استعمال ہونے والی ایک چڑیا کا نام تھا۔

"فسانہ عبرت" کا موضوع شاہی سرگرمیاں ہیں البتہ واجد علی شاہ کے خطوط میں نسائی زندگی کی جھلکیاں ہمیں اس عہد کی شاہی بیگمات کے ذکر سے دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ خطوط "تاریخ مذہب"، "تاریخ ممتاز"، "تاریخ نور"، "تاریخ مشغلہ"، تاریخ خاص"، تاریخِ جمشید"، اور تاریخ بدر کے نام سے مرتب کئے گئے اور ہر مجموعے کے نام کے ساتھ تاریخ کا لفظ جوڑا گیا یہ زیادہ تر واجد علی شاہ کی نظربندی کے عہد میں لکھے گئے۔

جب بادشاہ قید میں تھے تو بیگمات کو یاد کرتے اور کبھی کسی سے اس کے بالوں کی لٹ کی فرمائش کرتے اور کبھی کسی سے مسی بطور نشانی منگوا بھیجتے تھے۔ انیس سو سے پیشتر ابتدائی اردو زبان و ادب کے عہد میں ہمیں کسی خاتون کا قلم قابل ذکر متحرک نظر نہیں آتا جس نے اردو زبان و ادب میں کوئی حصہ ڈالا ہو شاعری میں ماہ لقا چندہ بائی پہلی صاحب دیوان شاعرہ کے طور پر سامنے آتی ہیں۔ بیگماتِ واجد علی شاہ کے خطوط کے مجموعے نو

ہیں مگر ان میں سے دو تک ہی رسائی ممکن ہے کچھ آسٹریا کے کتب خانے میں بطور ریکارڈ محفوظ ہیں تو کچھ برٹش میوزیم میں ہیں۔

واجد علی شاہ کی تمام تر بیگمات نکاحی بیویاں تھیں۔ تین چار سو بیگمات سے نکاح متعہ کر رکھا تھا ان میں سے کچھ طوائفیں بھی تھیں۔ پانی پلانے والی آبدار بیگم سے لے کر صفائی کرنے والی مصفہ بیگم تک سب واجد علی شاہ کے نکاح میں تھیں۔

ان کی جماعت میں خاندانی شاہی بیگمات سے لے کر طوائف تک، فوجی تربیت لینے والی سے لے کر رقص وموسیقی ماہر رہس کی تربیت یافتہ تک، بیوہ اور مطلقہ سمیت شیعہ سنی ہر طرح کی خواتین موجود تھیں ان میں ہر ایک کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہر وقت صاف ستھری رہے، مہندی ہاتھ پاؤں پر اور مسی ہونٹوں پر لگی رہے، خوشبو میں بسی ہو، پردہ کا خاص اہتمام تھا۔

ان خطوط کے توسط سے ہمیں نسائی زبان محاورہ کے وہ تمام پہلو جو ان کی نجی زندگی سے لے کر سماجی زندگی کے معاملات سے وابستہ تھے ان سب کا حوالہ ملتا ہے ان خطوط میں ہمیں ضرب الامثال اور کہاوتیں بھی ملتی ہیں اور روزمرہ محاورات کے نمونے بھی ان کی راہ میں رکاوٹ اور مشاغل کے قصے بھی ملتے ہیں۔

"مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گزشتہ لکھنؤ "عبدالحلیم شررؔ کی تحریر کردہ تمام تصانیف میں سے سب سے زیادہ یاد رکھی جانے والی تصنیف ہے ان کی اکتیس تصانیف ہیں مگر پھر دو کو سب سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا۔ ایک کا تذکرہ پہلے آچکا ہے۔ "گزشتہ لکھنؤ "بنیادی طور پر ایک تاریخی و ثقافتی تحریر ہے اس کے باون ابواب ہیں۔

غازی الدین حیدر سے اودھ کی سیاسی و ثقافتی تبدیلی کا آغاز ہوتا ہے اس سے قبل شیعہ مذہب کی رسومات کا تذکرہ نہیں ملتا جو بعد ازاں لکھنوی تہذیب کا بہت بڑا حوالہ بن گیا تھا غازی الدین حیدر نے ہی شیعہ مذہب کی رسومات کا آغاز کیا اور ان پر زور شور سے عملدرآمد کروایا نجف اشرف کے روزے کی نقل بنوائی چھٹی کی رسم کے لئے زچہ خانے بنوائے گئے۔ خوبصورت لڑکیوں کو چھٹیوں کا لقب دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ ائمہ اثنا عشر بارہ اماموں کی بیویاں ہیں۔

۱۸۲۷ء میں جب نصیر الدین حیدر زچہ خانے میں زنانہ کپڑے پہن کر لیٹ جاتا اور وضع حمل کی اداکاری کر کے واویلا مچاتا پھر فرضی بچہ جنم دیتا تھا اور زچگی کی تمام رسومات ادا کروائی جاتی تھیں۔ لکھنوی تہذیب میں امام باڑوں محل کی محرم کی رسومات, نوحہ خوانی، نذر نیاز و کونڈوں کا اہتمام اوراور سوز خوانی کے

تذکرے اسی عہد سے پیدا ہوتے ہیں مولا علی کا نام، علی علمبر دار کا علم ٹوٹے، علی کی قسم،عباس کا عَلم، امام ضامن کا سکہ، امام ضامن بندھوانا، علمبر دار، سیاہ لباس اور زیورات کی نسبت، چارپائی الٹا دینا، زمین پر سونام، حرم میں چالیس دن تک جوتا نہ پہنا، سبیل لگانا، علی اصغر کا جھولا بنانا، عَلم کے ساتھ گرہ لگانا۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام رسومات اسی عہد کی پروردہ ہے گزشتہ لکھنؤ میں جہاں تاریخ کا ذکر ہے وہاں تہذیبی حوالے سے بھی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں شاید ہی لکھنوی زندگی کا کوئی پہلو ایسا ہو جس کا ذکر ہونے سے رہ گیا وہاں کے تمام پیشے، کھیل مشاغل، کھانے پکوان، لباس، جانور، غمی خوشی کی رسومات، نوحہ خوانی، سوز خوانی اور مجالس کے ابواب شامل ہیں۔

بے شمار وہ بدعتیں جو بادشاہ بیگم نے اور غازی حیدر الدین حیدر نے جن کا آغاز کیا ان کا بیان ملتا ہے۔ عورتوں کے گانے بجانے کے شوق اور رجحان کو نوحہ خوانی کا موقع فراہم کیا گیا اور لکھنؤ میں ادنیٰ طبقہ کی عورتیں بھی گلی کوچوں میں نوحہ خوانی کرتی سنائی دیتی تھیں اور مخصوص زیورات محرم کے دنوں کے لئے تیار کیے جاتے تھے۔

زرد،، سیاہ، نیلا اور سبز رنگ ہی صرف پہنا جاتا تھا۔ سونے چاندی کے بھاری جڑاؤ زیور اتار دیے جاتے اور دھاگے سے یا ریشم سے بنے نازک نازک زیورات پہنے جاتے تھے۔ دیگر عام دنوں میں ہندو اور مسلم عورتوں کے لباس کا بھی تذکرہ موجود ہے۔

شررؔ لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں مرد وزن کے لباس میں بہت کم ہی تمیز باقی رہ گئی تھی۔ مرد بھی رنگین گوٹا کناری والا ریشمی لباس پہنتے رنگ برنگی ٹوپیاں چوڑی دار پاجامے انگرکھے پہنے جاتے۔ ہاتھوں پر مہندی کا رنگ موجود رہتا تھا۔

وہ رسومات جن میں خواتین بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں ان میں لڑکے کی پیدائش، ختنہ کی رسم، سالگرہ، دودھ بڑھائی، بسم اللہ، آمین، مونچھوں کے کونڈے، اور خدا رحم کی نذر نیاز جیسی رسومات عام تھیں۔ گود بھرائی سے لے کر زچگی کی رسوم، چھٹی کا نہان، عقیقہ اور بچے کا پہلی بار سر مونڈھنے کی رسومات عام تھیں۔

شادی بیاہ کے حوالے سے اُبٹنا، مانجھے بٹھانا، مہندی لگانا اور سانچق کے علاوہ سرمہ لگائی، دودھ پلائی، مٹھائی کھلائی، جوتا چھپائی اور رسی ننگھائی، چوتھی کھیلنا اور چار چالے پورے کرنے کی رسم عام تھی۔ گزشتہ لکھنؤ میں دیگر لکھنوی ثقافت کے بے شمار رنگوں کا ذکر کرتے ہوئے عبد الحلیم شررؔ نے نسائی رنگ ان رسومات اور

لباس و سنگھار کے حوالے سے شامل کیا جس سے نہ صرف اس عہد کے بلکہ آنے والے ادوار پر ان نسائی رسومات کا تذکرہ سمجھنے کے لئے بھی معاونت حاصل ہوتی ہے اس عہد اور بعد کے شعری اور نثری تخلیقات میں جہاں جہاں نسائی شعور اور نسائی آوازیں ہیں وہاں ہمیں تہذیبی و تاریخی ثبوت فراہم کرتی ہیں۔

برِ صغیر پاک و ہندی تہذیب کے دوسرے بڑے مرکز دہلی کے ثقافتی منظر نامے کا دلچسپ بیان یہ ہے یہاں پر پروان چڑھنے والی تہذیب جس کا ایک اہم حصہ زبان بھی ہے۔اس کی تہذیب سے وابستہ الفاظ محاورات ضرب الامثال، کہاوتیں، پہیلیاں، لوریاں، سہاگ گھوڑیاں اور گیت بھی ملتے ہیں۔ جن سے صدیوں پرانے توہمات وعقائد کا سراغ بھی ملتا ہے۔

ان کتب کے توسط سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ نسائی زبان و روایات کے مطابق آبخورے سے سر پر پانی ڈالنے سے بال چر کی بیماری لگ جاتی ہے، جھاڑو کسی کو چھو جائے تو سوکھے کا مرض ہو جاتا ہے، رات کو کنگھی کرنا پریشانی اور دکھ کا موجب بن سکتا ہے، انگلیاں چٹخانا نحوست ہے، پھونکنی سے ضرب لگانے سے موٹاپا آجاتا ہے، شہتیر چر چرائے تو گھر میں نحوست کا باعث بنتا ہے، جوتے پر جوتا آجائے تو تو سفر در پیش ہوتا ہے، کمر میں چک پڑ جائے تو پاؤں کے بل پیدا ہونے والے بچے سے لات مروانے سے چک دور ہو جاتی ہے۔۔۔

ان تمام موضوعات پر نسائی زبان و محاورہ موجود ہے۔ زنانہ مردانہ الگ الگ ہونے کے باعث زنانہ زبان مردوں سے الگ ہوتی اور پردے کی سختی سے روایات کے باعث مردوں سے الگ ہونا اور باہر کی دنیا سے بے خبر رہنا بھی زنانہ زبان کو امتیاز بخشتا ہے۔ بہت سی ہندوؤں کی رسومات کچھ نام بدل کر مسلمانوں میں رائج ہیں اور اب تک کئی مسلم روایات کو ہندوؤں کے گھرانوں نے بھی اپنا رکھا ہے۔

اگرچہ "رسوم دہلی" کوئی ادبی یا تخلیقی تصنیف نہیں ہے یہ سماجی اور تاریخی منظر نامہ ہے جس کے ثقافت کے رنگوں میں نسائی رنگ واضح طور جھلک رہا ہے ۔اس تحریر میں ہمیں نادرونایاب محاورات واصطلاحات کے نمونے بھی ملتے ہیں اور کی اشیاء کے اسماء جو اب ناپید ہیں ان کا حوالہ بھی ملتا ہے عورت کی زبان مردوں کے مقابلے میں زیادہ قدیم ہوتی ہے کیونکہ اس پر ہر چیز زندگی کے اثرات دیر سے اور کم پڑتے ہیں اور زبان کے معاملے میں مرد سے زیادہ قدامت پسند ہوتی ہے۔

دہلی دارالحکومت رہنے کے باعث دیگر علاقوں سے زیادہ تبدیلیوں کا شکار بھی رہا یہاں کے شاہی قلعہ اور محلات میں الگ الگ نام اور عہدوں سے خواتین تعینات ہوئیں کچھ چھٹی نویس تو کچھ سقنیاں، کچھ اڑدا بیگنیاں، کچھ آچا (استانی) الگ تھیں تو مشاطہ الگ خاصہ والیاں الگ تھیں تو قلعہ والیاں الگ جن کا کام ادھر کی

ادھر کی خبریں رکھنا ہوتا تھا کہ ان کے ہاں کی رسومات کے الگ چرچے تھے۔بی بی کی صحنک نامی رسم کا آغاز بھی شاہی خواتین سے ہوا۔ ان میں سے ایک رسم بھی ایسی نہ ہو گی جو خواتین کی شمولیت کے بغیر ہو۔

یہاں "رسومِ دہلی کے تمام موضوعات جو حمل ٹھہرنے سے لے کر پیدائش کے بعد کی رسومات تک جہاں ہم ستوانسا، نوماسہ ،بچا گیریاں، چھٹی کا نہان، عقیقہ کی رسم، زچہ کا تارے دیکھنا، روٹ کی رسم، سر دان، مرونڈے، دانت نکلنے، دودھ بڑھانے، سالگرہ، ختنہ کروانے ،بسم اللہ، گھوڑی چڑھانے کی رسم، آمین بسم اللہ جیسی رسومات کا ذکر ہے ان تمام رسومات سے وابستہ بیسیوں محاورات اور گیت لوریاں بھی اردو زبان کا حصہ ہیں جیسا کہ شادی بیاہ کے حوالے سے بات بڑھانا، رقعہ ڈالنا، رشتہ ڈالنا، مایوں بٹھانا، مہندی تیل، سہاگ گھوڑیاں گانا، ساچق کا جوڑا، شربت پلائی، بی بی کی صحنک ، سہرے کے گیت، جہیز دکھانا، گڑیا سجانا ، رخصتی کے گیت، چوتھی کھیلنا، چار چالے پورے کرنا، چیکٹ اتروائی جیسے الفاظ و محاورات اور اصطلاحات کا ذکر ملتا ہے۔ جب کہ دیگر رسومات جن میں شب برات، عید بقر عید ،میلے و محرم عاشورہ، کا ذکر کے بھی مخصوص الفاظ و محاورات کا استعمال اور حوالہ جات ملتے ہیں جو اکثر آج بھی اسی طرح سے رائج ہیں اور مردوں کی زبان میں ان کا کوئی استعمال نہیں ملتا۔

لوری اماں اور دادیوں، نانیوں کی ایجاد اور اختراع ہے جو مترنم میٹھی سریلی آوازوں میں بچوں کو سناتی تھیں۔ جوان ہونے پر رقعہ چلانا، بات چلانا، بات ڈالنا جیسے محاورات کی صورت میں علامتی طور پر اظہار نظر آتا ہے ۔مٹھائی دھرنا اور امام ضامن کا روپیہ باندھنا منگنی کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ دلہن کو صرف میٹھا یعنی پینڈیاں کھلائی جاتیں جس سے اس پر روپ چڑھے۔

"کھائے نہ جانے پینڈیاں لاڈو میری بندھنا نہ جانے بند۔۔۔ سیانی ہونے دو
بابا نے کس دیا ڈولا اماں بیوی جانے نہ دے۔۔۔ سیانی ہونے دو
چچا نے کس دیا ڈولا چچی اماں جانے نہ دے۔۔۔ سیانی ہونے دو"

سانچق چڑھانا، دلہن کے لئے سہاگ کا جوڑا اور دیگر لوازمات بھیجنے کو کہا جاتا ہے کتنے ہی پکوان ایسے ہیں جن کے نام بھی عورتوں نے رکھے اور صرف وہی بناتی تھیں، وہی کھاتی تھیں جیسے: سٹھورا، اچھوانی، تورا، بھوڑہ، پنجیری، چکتیاں، چراغی، چڑھاوا، کاڑھا، وغیرہ اور زیورات کے باب میں سید احمد دہلوی نے متعدد کا تذکرہ کیا جیسے: جگنی، جھومر، چوڑیاں، جگنی، جھومر، گجرے، کانوں کی بالیاں پتے، چوڑیاں، کنگن، چھلے، بلاق، گلوبند، ستلڑا، کنٹھی، ھنسلی، مالا، لونگ، کوکا، بالیاں، پتے۔۔۔ وغیرہ

رسوم دہلی بظاہر تو دلی کے رسوم پر مبنی کتاب ہے مگر در حقیقت یہ تمام رسومات نسائی رسومات ہیں اور یہ نسائی رسومات پر مبنی دستاویز ہے ۔ جس میں ان کی زندگی اور سماجی و خانہ داری کے معاملات سے لے کر مشاغل اور رسومات تمام زندگی کا خاکہ مختلف الفاظ و محاورات کی صورت میں موجود ہے۔

نتائج:

اس تحقیقی مقالے کے نتائج کے طور پر درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

ا: اردو زبان میں نسائی زبان و محاورہ اپنا امتیازی وجود رکھتا ہے۔ نسائی زبان کے مخصوص پہلو ہیں جو اس کی نسائی فکر کا اظہار کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔ اردو زبان میں سیکڑوں الفاظ و محاورات ایسے موجود ہیں جو صرف خواتین کے معمولاتِ حیات، سرگرمیوں اور جذبات کی بابت مخصوص ہیں اور ان کو مرد استعمال نہیں کرتے۔ ۱۸۵۷ء سے قبل بھی گیت، پہیلیاں، لوریاں، بجا گیریاں، سٹھنیاں اور کہہ مکرنیاں جیسی اصنافِ زبان صرف اور صرف نسائی اظہار پر مشتمل ہیں۔

۲: ۱۸۵۷ء تا ۱۹۰۰ء کا عہد اردو زبان و ادب کے لسانی، ادبی اور ثقافتی حوالوں سے نسائی تاریخ کو محفوظ کرنے میں بہت حد تک کامیاب رہا۔ داستان نویس، ناول نگار، شاعر و ادیب، لغت نویس اور تاریخ نویسوں نے نسائی لب و لہجے کی انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی تصانیف میں جگہ دی۔ اگرچہ اس تہذیب کے مطابق انھیں بھی کم کم اور محدود و مخصوص خواتین سے میل جول کے مواقع حاصل ہوتے ہونگے۔

۳: منتخبہ لغات اور ادبی و ثقافتی کتب میں نسائی زبان و محاورے کو قد آور مصنفین نے بطور عورت کی زبان تخصیصی سطح پر اہمیت دی۔ لغات میں نسائی الفاظ کے سامنے (عو) باقاعدہ لکھا جانے لگا۔ ثقافتی تاریخ و سماجی زندگی سے متعلق نسائی زندگی کے اکثر پہلوؤں کی تحفیظ و تدوین ہونے لگی نسائی لغات مرتب ہونا شروع ہو گئیں۔

۴: نسائی زبان کا بڑا حصہ توہم پرستی، بدعتیں، شگون، جادو ٹونے، تعویز گنڈے اور بے جا رسوم و روایات سے متعلق بھی ہے جو مخصوص عہد میں ان کے کمزور العقیدہ ہونے, مرد کی نسبت تعلیم کے مواقع کم میسر ہونے اور معاشرتی میل ملاقات کے محدود مواقع کی دلالت کرتا ہے۔

۵: نسائی محاورات کا کثیر حصہ ۱۹۰۰ء سے پیشتر کی نسائی زندگی کے بین ثبوت فراہم کرتا ہے جو نسائی زندگی کی پیدائش سے موت تک کے تمام مواقع پر عورت کی شمولیت کے انداز اور معمولات کی عکاسی کرتا ہے۔

۶۔ نسائی زبان کا بڑا حصہ توہم پرستی، بدعتیں، شگون، تعویز گنڈوں، بے جا رسوم و روایات سے متعلق بھی ہے جو مخصوص عہد میں ان کے کمزور العقیدہ ہونے اور کم تعلیم یافتہ ہونے ،معاشرتی میل ملاقات کے محدود مواقع کی دلالت کرتا ہے۔

۷: عورت کی زبان میں مردوں کے مقابلے میں اختصار اور قطعیت کی کمی ملتی ہے۔ وہ ضرورت سے زیادہ اسم صفت کا استعمال کرتی ہیں اور بات کو طول دیتی ہیں۔ ان کے ہاں ہم قافیہ اور مہمل الفاظ بھی مردوں کے مقابلے میں کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ استعاراتی انداز اپناتی ہیں۔

سفارشات:

۱۔ داستانوی ادب سے ابتدائی ناول نگاری تک کے متون کے علاوہ نسائی زبان کا ایسا حصہ ضرور ہو گا جو تحریری صورت میں شامل ہونے سے رہ گیا ہو۔ اس کو فوک لور اور سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والے الفاظ و محاورات اور روایات میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ نسائی زبان و محاورہ کا بڑا حصہ برصغیر پاک و ہند کی تہذیب و ثقافت سے وابستہ ہے۔ سیکڑوں نسائی رسومات کو ثقافتی پس منظر کے ساتھ یوں محفوظ کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی تاریخی دستاویز کی حیثیت کی حامل قرار پائیں۔

۳۔ عورت کے ہاں علامتی زبان اور استعاراتی اظہار اس کے نسائی لہجے کی شناخت بھی ہے اور حسن بھی ،اس نقطہ نظر سے اردو زبان کے نسائی امتیاز کا علمِ نفسیات کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ نسائی اردو زبان و محاورہ کے علاوہ مردوں کے مخصوص الفاظ و محاورات اور اصطلاحات پر بھی تحقیق کی جاسکتی ہے جو کبھی عورت کی زبان پر نہیں آتے یا عورتیں ان اصطلاحات کو زبان پر نہیں لاتیں۔ اگر وہ ان الفاظ کو برتیں تو اسے بازاری زبان سمجھا جاتا ہے۔ ان کی جمع آوری بھی کی جانی چاہیے۔

۵۔ نسائی زندگی میں رشتے ناتے، خانہ داری اور سنگھار بہت اہم موضوعات رہے ہیں۔ ہر عورت چاہے اس کی سماجی زندگی کتنی ہی محدود ہو وہ ان موضوعات سے الگ نہیں ہو سکتی۔ عورت کی زبان میں ہزاروں الفاظ و اصطلاحات انھی موضوعات کا احاطہ کرتے نظر آتے ہیں ہیں۔ ان پر تحقیق ،اردو زبان میں عورت کی گھریلو زندگی پر مزید روشنی ڈال سکتی ہے۔

۶۔ عقیدے کی کمزوری، توہمات پر اعتماد، شگون کی اہمیت، ٹونے ٹوٹکے، جادو، تعویذ گنڈے اور فرسودہ رسومات کے لیے برِ صغیر پاک وہند کی سرزمین ہمیشہ سے ذرخیز رہی ہے۔ ان کا نسائی زندگی میں عمل دخل بھی مردوں سے زیادہ رہا۔ اردو زبان میں موجود ان نظریات سے متعلقہ محاورات، ضرب الامثال اور کہاوتوں کو جمع کیا جا سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذات

امیر احمد امیر مینائی، امیر اللغات، حصہ اوّل، مطبع مفید عام، آگرہ،۱۸۹۱ء

چرنجی لال دہلوی، مخزن المحاورات، مطبع محب ہند فیض بازار، دہلی،۱۸۸۶ء

رتن ناتھ سرشارؔ، فسانہ آزاد، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی،۱۹۸۶ء

سید احمد دہلوی، رسوم دہلی، مرتبہ، خلیق انجم، بک ٹاک، لاہور،۲۰۱۹ء

سید احمد دہلوی، انشائے ہادی النسا اور تحریر النساء، شمسی پریس، دہلی،۱۹۱۰ء

سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ اردو سائنس بورڈ، لاہور،۱۹۹۵ء

سید احمد دہلوی، لغات النسا، کاشی رام پریس سابقہ نول کشور پریس، لاہور،۱۹۱۷ء

عبدالحلیم شررؔ، برِصغیر پاک وہند میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ یعنی گزشتہ لکھنو، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور ۲۰۰۶

عبدالحلیم شررؔ، فردوس بریں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۸ء

نذیر احمد، ایامیٰ، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنو،۲۰۱۵ء

نذیر احمد، مراۃ العروس، مجلسِ ترقیء ادب لاہور، ۱۹۸۸ء

ہادی رسوا، مرزا، امراؤ جان ادا، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۲ء

واجد علی شاہ، تاریخِ مشغلہ، نواب آبادی جان بیگم کے نام خطوط (ترتیب و تحشیہ) محمد اکرام چغتائی، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی، لاہور،۱۹۸۵ء

ثانوی ماخذات:

ابن بطوطہ، عجائب الاسفار، (مترجمہ) سید رئیس احمد جعفری، نفیس اکادمی اردو بازار، لاہور،۱۹۸۶ء

ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، لکھنو کا دبستانِ شاعری، اردو مرکز، لاہور،۱۹۴۷ء

احسن ماہروی، تاریخ نثر اردو بنام تاریخی منثورات (حصہ اول) مسلم یونیورسٹی پریس ع، لی گڑھ،۱۹۳۰ء

احمد رضا خان، شمع شبستان رضا، (مرتبہ) اقبال احمد نوری، لاہور، س ن

آرنلڈ جے ٹائن بی، مطالعہ تاریخ (مترجمہ) غلام رسول مہر، مجلس ترقی ادب، لاہور،۲۰۱۱ء

اسلم عزیز درانی، (مرتبہ) مقدمات باغ و بہار، ، کاروان ادب، ملتان، س ن
اسلوب احمد انصاری، اردو کے پندرہ ناول، یونیورسل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ، ۲۰۰۳ء
اشرف علی تھانوی، مولانا، بہشتی زیور (حصہ اوّل)، لاہور، س ن،
اکبر حسین قریشی، ڈاکٹر، فرہنگ طلسم ہوشربا، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء
الغزالی: احیاء علوم الدین (مترجمہ) مولانا احسن نانا توی، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، س ن
امیر احمد امیر مینائی، امیر اللغات، جلد اوّل، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۸۹۱ء
انشاء اللہ خان انشاء، دریائے لطافت، مطبوعہ مرشد آباد، ۱۸۵۰ء
انشاء اللہ خان انشاء، کہانی رانی کیتکی اور کنور اودھے بھان کی، (مرتبہ) پروفیسر صاحب علی، شعبہء اردو بمبئی یونیورسٹی، انڈیا، ۲۰۱۱ء
انشاء اللہ خان انشاء، سلکِ گوہر، (بتصحیح) امتیاز علی عرشی، اسٹیٹ پریس، ریاست رام پور، ۱۹۴۸ء
انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۰ء
انوار ہاشمی، تہذیب کی کہانی، جاوید پریس میکلوڈ روڈ کراچی، بار سوم، ۱۹۶۸ء
انور جمال، پروفیسر، اردو میں دو لفظی روز مرے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء
انور جمال، پروفیسر، ادبی اصطلاحات، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۷ء
انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء
اویس احمد ادیب، اردو کا پہلا ناول نگار، برِ صغیر پاک و ہندی اکیڈمی یوپی، ۱۹۳۴ء
ایاز احمد، ڈاکٹر، مضامین ریختی، دریا گنج بکس، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء
ایک گمنام ہندو عورت، سمینتنی اُپدیش، تحقیق و تدوین ڈاکٹر دھرم ویر، (مترجمہ) نور الاسلام عکس پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۹ء
برج موہن دتاتریہ کیفی، کیفیہ، انجمن، ترقی اردو (ہند) دہلی، بھارت، ۱۹۷۵ء
تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و برِ صغیر پاک و ہند (جلد دوم) پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۱ء
تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند، (جلد اوّل)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۰۹ء
تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ (ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء
تمکین کاظمی، (مرتبہ) تزکرہ ریختی، شمس الاسلام پبلشرز، حیدر آباد، دکن، ۱۹۳۰ء

جابر علی سید، کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ، (جلد اول)، مقتدرہ قومی زبان اردو، اسلام آباد ۱۹۹۸ء
جان صاحب، دیوان ریختی، (مرتبہ) فاروق ارگالی، مزید بکڈپو لمٹیڈ، دہلی، ۲۰۰۶ء
جمیل جالبی، ڈاکٹر، قدیم اردو کی لغت، اردو سائنس بورڈ لاہور، ۱۹۸۸ء
جو عمل واعظ لال، اردو زبان کی تاریخ، مطبع مجتبائی، دہلی، ۱۹۲۰ء
جیمز جارج فریزر، شاخِ زریں، (مترجمہ) سید شاکر اعجاز، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۱ء
چرنجی لال دہلوی، اردو زبان کی تاریخ، مطبوعہ رضوی، دہلی، ۱۸۸۴ء
حنیف نقوی، رجب علی بیگ سرورؔ، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی، ۱۹۹۱ء
خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اردو ناول، اردو مجلس، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کوچہ پنڈت، دہلی، ۱۹۹۴ء
خالد حسن قادری، ڈاکٹر، الفاظ کا طلسم، (مرتبہ) رؤف پاریکھ، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۲۲ء
خواجہ امان، بوستانِ خیال، (حدائق الانظار) محمود المطابع، دہلی، ۱۸۸۵ء
خوشنود نیلوفر، ڈاکٹر، اردو محاورے، بک کارنر، جہلم، ۲۰۰۵ء
رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، (مترجمہ) مرزا محمد عسکری سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء
رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی و کپتان ڈبلیو جے ہالرائیڈ، رسومِ ہند، (مرتبین) کارکنانِ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء
رتن ناتھ سرشارؔ، فسانہ آزاد، (تلخیص) ڈاکٹر رئیس، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء
رجب علی بیگ سرورؔ، فسانہ عبرت، (مرتبہ) سید مسعود حسن رضوی ادیب، کتاب نگر، دیال روڈ، لکھنو، ۱۹۵۷ء
رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر، اردو نثر کا آغاز و ارتقا، مجلس تحقیقاتِ اردو، حیدر آباد، س ن،
رَما شنکر ترپاٹھی، ڈاکٹر، قدیم برِ صغیر پاک و ہند کی تاریخ، (مترجمہ) سید سخی حسن نقوی، س ن
روتھ بینی ڈکٹ، نقوشِ ثقافت، (مترجمہ) سید قاسم محمود، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
رؤف پاریکھ (مرتبہ) اردو لغات، اُصول اور تنقید، فضلی بک سپر مارکیٹ، کراچی، ۲۰۱۴ء
رؤف پاریکھ، اردو لغت نویسی کی تاریخ مباحث و مسائل، فضلی بک سپر مارکیٹ، کراچی، ۲۰۱۷ء
رؤف پاریکھ، اردو میں مزاح نگاری کا سیاسی و سماجی پس منظر، انجمن ترقی اردو، پاکستان، ۱۹۹۷ء
رؤف پاریکھ، لغات اور فرہنگیں، سٹی بک پوائنٹ اردو بازار، کراچی، ۱۹۲۱ء

رؤف پاریکھ، لغات: تحقیق و تنقید، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، ۲۰۲۰ء
رؤف پاریکھ، صحتِ زباں، الفاظ، محاورات اور مرکبات کا درست استعمال، ادارہء فروغِ قومی زبان، ۲۰۲۱ء
رؤف پاریکھ، لغوی مباحث، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۵ء
رؤف پاریکھ، اوّلین سلینگ لغت، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۱۵ء
زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زندان، دی سمیع سنز پرنٹر، کراچی، ۲۰۰۰ء
ساجد امجد، ڈاکٹر، اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات، الوقار پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء
سبحان بخش، محاورات ہند، مکتبہ مجتبائی، دہلی، ۱۹۱۳ء
سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء، مکتبہ دانیال، لاہور، ۲۰۱۷ء
سبط حسن، ماضی کے مزار، مکتبہ دانیال، لاہور، ۱۹۹۴ء
سر سید احمد خان، مقالات سر سید، جلد ۶، لاہور، ۱۹۶۲ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، عورت جنس کے آئینے میں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
سلیم اختر، ڈاکٹر، داستان اور ناول، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
سہیل بخاری، ڈاکٹر، اُردو داستان، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۷۸ء
سید احتشام حسین، اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، پانچواں ایڈیشن، ۲۰۰۴ء
سید حامد حسن قادری، داستانِ تاریخ اردو، جامع نگر، نئی دہلی، بھارت، ۲۰۰۷ء
سید خیال بخاری، پروفیسر، ہمارے لسانی مسائل، بساط ادب، لاہور، ۲۰۱۳ء
سید ضمیر حسن دہلوی، اردو ادب میں عورتوں کے محاورے اور زبان، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۴ء
سید علی محمد خسرو، اردو کی تہذیبی معنویت، مکتبہ جامع لمٹیڈ جامع نگر، نئی دہلی، ۱۹۷۸ء
سید محمد مبین نقوی الہ آبادی، تاریخ ریختی معہ دیوانِ جان صاحب، مطبع انوار احمدی الہ آبادی، س ن
سید مسعود حسن رضوی ادیب، سلطان عالم واجد علی شاہ، سلسلہ دائرہ ادبیہ، لکھنو، س ن
سید وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ نقد، آگہی پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۲ء
سید وقار عظیم، فورٹ ولیم کالج، تحریک اور تاریخ، الوقار پبلی کیشنز لوئر مال، لاہور، ۱۹۹۸ء
سید عبد اللہ، ڈاکٹر، وجہی سے عبد الحق تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء

سید وقار عظیم، فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ، یونیورسل بکس اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۶ء
شاہنواز خان، ماثر الامراء، اُردو ترجمہ (جلد اوّل)، لاہور، ۱۹۶۸ء
شریف احمد،، ڈاکٹر، اردو کہاوتیں ، قریشی کارنر، جہلم، ۲۰۱۶ء
شفقت رضوی، (مرتبہ) دیوان مہ لقاچندا، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۰ء
شنکر ترپاٹھی، ڈاکٹر، (مترجمہ) سید سخی حسن نقوی، قدیم برِ صغیر پاک وہند کی تاریخ، س ن
شہناز انجم، ڈاکٹر، ادبی نثر کا ارتقا (۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۷ء)، شعبہ جامعیہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، جامعہ نگر دہلی، ۱۹۸۵ء
صابر علی خان، ڈاکٹر، سعادت یار خان رنگین، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۶ء
عابدہ بتول، ڈاکٹر، اردو لغت نویسی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، مکتبہ ءاخوت اردو بازار ، لاہور، ۲۰۱۹ء
عابدہ بیگم، ڈاکٹر، اردو نثر کا ارتقا، دہلی یونیورسٹی، مکتبہ جامعہ اردو بازار، دہلی، ۱۹۸۸ء
عبد الرشید صدیقی، ڈاکٹر، فسانہء آزاد کی تہذیبی فرہنگ، انٹر نیشنل پرنٹنگ پریس جیل روڈ ، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء
عبد الحق، مولوی، اردو لغات اردو لغت نویسی، رسالہ اردو، جنوری ۱۹۳۱ء
عبد الستار انصاری، پروفیسر، ضرب الامثال کا انسائیکلوپیڈیا، اردو بازار، لاہور، س ن
عبد السلام، پروفیسر، اردو ناول بیسویں صدی میں، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۳ء
عرش تیموری، قلعہ معلیٰ کی جھلکیاں، مکتبہ جہاں نما، اردو بازار جامع مسجد، دہلی، ۱۹۳۷ء
عطاللہ، ڈاکٹر، دکنی محاورات، اردو بک ڈپو انجمن ترقی اردو ہند، حیدر آباد، س ن
علامہ نیاز فتح پوری، عورت اور فنون لطیفہ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء
علی خان، ڈاکٹر، سعادت یار خان رنگین، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۶ء
علی عباس جلال پوری، روایاتِ تمدن قدیم، ادارہ تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۲ء
علی عباس جلال پوری، رسومِ اقوام، ادارہ تخلیقات، لاہور، ۲۰۱۳ء
عمر زبیری، پروفیسر، قدیم تہذیبیں اور مذاہب، علی فرید پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۹ء
غلام ربانی، الفاظ کا مزاج، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۸۳ء
غلام رسول مہر، (مترجمہ) تاریخ عالم کا مطالعہ از ولیم ٹائن بی، گوشہ ادب، کوئٹہ، ۲۰۱۶ء

غلام مصطفی سمبل، تاریخ ہند قدیم، فاروق سنز لاہور، س ن
فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شاعری کا فنی ارتقا، الوقار پبلی کیشنز، واپڈا ٹاؤن، لاہور، ۲۰۱۵ء
فیروز مکرجی، لکھنو اور سرشار کی دنیا، (مترجمہ) مسعود الحق، سٹی پریس بک شاپ صدر، کراچی، ۲۰۰۰ء
قمر رئیس، ڈاکٹر، تلخیص، فسانہ آزاد رتن ناتھ سرشار، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء
کلیم الدین احمد، پروفیسر، اُردو زبان اور فن داستان گوئی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۰ء
کیرن آرم سٹرانگ (ترجمہ) داستان کی مختصر تاریخ، محمد یحیی خان، نگارشات پبلشرز مزنگ روڈ، لاہور، ۲۰۱۷ء
گارساں دتاسی، برِ صغیر پاک وہندی ادب ۱۹۷۵ء میں، (جلد اول، حصہ دوم) انجمن ترقی اردو ہند دہلی، س ن
گوپی چند نارنگ، لغت نویسی کے مسائل، کتاب نما، جامعہ نگر نئی دہلی، دہلی، ۱۹۸۵ء
گوپی چند نارنگ، اردو زبان اور لسانیات، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء
گیان چند جین، لسانی مطالعے، ترقی اردو بورڈ، دہلی، ۱۹۷۹ء
گیان چند جین، ڈاکٹر، اُردو میں لسانی تحقیق، لاہور، ۲۰۱۸ء
مالک رام، حمورابی اور بابلی تہذیب و تمدن، اپنا ادارہ پرانی انارکلی، لاہور، ۲۰۰۰ء
مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، فکشن ہاؤس لاہور، ۲۰۱۴ء
محسن خان محسن، دیوان رنگیلی بیگم، (مرتبہ) فاروق علی، فرید بکڈپو، دہلی، ۲۰۰۶ء
محمد افضال بٹ، ڈاکٹر، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء
محمد حسن، ادب کی تاریخ، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۵ء
محمد حسن عسکری و محمد رفیع (مرتبین) کلام انشا، الہ آباد برِ صغیر پاک وہندی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۵۲ء
محمد حسین آزاد، مولانا، آب حیات، غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۵۴ء
محمد عطا اللہ خان، ڈاکٹر، اردو اور فارسی کے روابط، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۹ء
محمد مجیب، تاریخ و تمدن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند، ۱۹۸۶ء
محمد نعیم ورک، اردو ثقافتی مطالعہ، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۹ء
محمود الٰہی، ڈاکٹر، فسانۂ عجائب کا بنیادی متن، ادارہ تصنیف، دہلی، ۱۹۷۳ء
محی الدین حسن، دلّی کی بیگماتی زبان، دی عثمانینس امریکہ شگاگو، ۶۰۱۹۱۳، (امریکہ)، ۲۰۰۷ء

مرتضیٰ احمد خاں مے کش، تاریخِ اقوامِ عالم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۲ء
مرزا جان طپش دہلوی، شمس البیان فی مصطلحات برِ صغیر پاک و ہند، (مرتبہ) عابد رضا بیدار خدا بخش، لائبریری پٹنہ، ۱۹۷۹ء
مرغوب حیدر عابدی، دہلی کی آخری شام، مرتبہ صلاح الدین، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۳ء
مسعود ہاشمی، اردو لغات کا تنقیدی جائزہ، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۲ء
مقبول الہی، اردو میں مستعمل عربی و فارسی ضرب الامثال، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء
ملا وجہی سب رس، (مرتبہ) مولوی عبد الحق، جلد چہارم، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۷ء
مناظر عاشق ہر گانوی، ڈاکٹر، عبد الحلیم شرر بحیثیت شاعر، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۹۹ء
مہ لقا چندا، دیوان مہ لقا چندا، (مرتبہ) شفقت رضوی مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۰ء
مہیشور دیال، عالم میں انتخابِ دِلی، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۵ء
مولوی عبد الحق، سب رس، اشاعت چہارم، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۷ء
مولوی عبد الحق، قدیم اردو، انجمن ترقی اردو، کراچی. ۱۹۶۱ء
مولوی عبد الحق، لغتِ کبیر اردو، انجمن ترقی اردو، بک کارنر، جہلم، ۲۰۱۷ء
میر بہادر علی حسینی، قواعد زبان اردو، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۳ء
نذیر احمد تشنہ، اردو ضرب الامثال، مقبول اکیڈمی اردو بازار، لاہور، س ن
نزہت عباسی، اردو افسانوی ادب میں نسائی لب و لہجہ، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۳ء
نعمان ناصر اعوان، پروفیسر، ہمارے محاورے، رابعہ بک ہاؤس، لاہور، س ن
نیر مسعود رضوی، رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے، شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی، الہ اباد، ۱۹۶۷ء
وجاہت حسین وجاہت،، منشی اختلاف اللسان، رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۰۶ء
واجد علی شاہ، حزن اختر، (مقدمہ)، عشق نامہ، جامع نگر، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء
وحیدہ نسیم، عورت اور اردو زبان، غضنفر اکیڈمی پاکستان، ۱۹۹۴ء
وقار عظیم، فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ، الوقار پبلی کیشنز لاہور مال روڈ، لاہور ۱۹۹۸ء
ھیری سپیرو، ثقافت کا مسئلہ، ترجمہ و حواشی، سید قاسم محمود، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء

انگریزی کتب و مقالات

.A.S.Altekar, Dr, Position of woman in Hindu civilization, Archive.org/details/in.ernet.dli.2015.56806,20 january,2020
Http://onlinelibrary.wiley.com/doi/10.1525/aa.1888.102.02a00140/pdf
Imperial Gazetteer of Lahore Districtm1883-84, lahore,1889
Janet Holmes, Gender talk at work,Malden,MA, Oxford:Blackwell,2006
Mathew Aranold, Culture and Anarchy,Cornhill magazine 1867-68
Mie's, Matrix, Patriarchy and Accumulation on a world scale, Zed press, 1994
Otto Jespersen, Language and its nature, Development and origin, London ,1922
Robin Lakoff, Language and women,s place,department of Linguistics, University of California,Berkeley,lang sec 2, 45-80.printed in Great Britain.
Sara Mils,Gender and politeness,Cambridge: New York,Cambridge University Press,2003
SwaledSpengler,The Decline of the west ,(Abridged Edition George AnesUnwin, London, 1922
www.wright,edu/ ~ Chris…htm,code of Hammurabi(1700 B.C.E)
Http://onlinelibrary.wiley.com/doi/10.1525/aa.1888.102.02a00140/pdf
ShahidaLatif, Muslim women in India: Political and pricaterealitives, Zed press, London,1990
Trigger, Bruce,G.A History of Akvhaeological thought, Cambridge. 1993
ur.wikipedia.org/wiki/ریختہ1/2/2020
Ur.wikipedia.org/wiki' date:14 Dec,2020
Women's language: a struggle to overcome inequality* Sergio Bolaños Cuellar sbolanosc@unal.edu.co Universidad Nacional de Colombia Departamento de Lingüística (At the Collaborative Research Center on Multilingualism of the University of Hamburg on July 22, 2004
En.wikipedia.org/ wiki/breast_ tax, date 19.4.2020

فرہنگ ولغات:

ابوالاعجاز حفیظ صدیقی، ڈاکٹر، کشاف تنقیدی اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۵ء

اثر لکھنوی، فرہنگِ اثر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء

ارشاد احمد پنجابی، پنجابی لغت، پنجابی ادبی لہر بلال گنج، لاہور، ۱۹۹۹ء

انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا، جلد پنجم، ولیم بنیٹن، لندن، ۱۹۶۵ء

انسائیکلوپیڈیا آف سوشل سائنس، جلد ۴، میکمن کمپنی، نیویارک، ۱۹۵۰ء

جمیل جالبی، قدیم اردو کی لغت، اردو سائنس بور، ڈلاہور، ۱۹۸۸ء

جمیل جالبی، قومی انگریزی لغت، مقدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۹۴ء

خواجہ عبدالمجید، جامع اللغات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء

درسی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۱ء

راجیسور راؤ اصغر، ہندی اردو لغت، مقتدرہ قومی زبان پاکستان ۱۹۹۸ء

سید احمد دہلوی، فرہنگ آصفیہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

گھریلو انسائیکلوپیڈیا (طبع دوم) اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء

محمد عبداللہ خان خویشگی، فرہنگِ عامرہ، زین نعمان پرنٹرز لاہور، ۲۰۲۰ء

نورالحسن نیر، نوراللغات، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، دہلی، ۱۹۹۸ء

اخبارات ورسائل:

اخبارِ انجمنِ پنجاب لاہور، ۱۷ مئی ۱۸۷۸ء

اخبار، سنڈے ایکسپریس، ادب ایڈیشن، یکم نومبر، ۲۰۲۰ء

ادبیات، ناول نمبر، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۲۰ء

ادبیات، انتخاب خواتین کا عالمی ادب، جلد ۱۴-۱۵، شمارہ ۵۹-۶۰، ۲۰۰۲ء

خیابان، شر رنمبر، مطبوعہ شاہین پریس جامعہ پشاور، جون ۱۹۷۲ء

دلگداز، شمارہ جون، ۱۹۳۳ء، ص ۱۲۴

رسالہ اردو، شمارہ جنوری ۱۹۳۱ء

قومی آواز، لکھنؤ، ۱۳ جنوری ۱۹۹۸ء

کسوٹی جدید نسائی نمبر، پٹنہ انڈیا، شمارہ ۲۴-۲۵ اپریل ستمبر ۲۰۱۴ء

مقالات

سفینہ، ڈپٹی نذیر کے ناول ایامی کا جائزہ، مقالہ، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، ہماری ویب،، جون، ۲۰۱۵ء

عقیلہ جاوید، ڈاکٹر، اردو ناول میں تانیثیت، شعبہ اردو بہاوالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۵ء